جس میں شیعہ امامیہ کے عقائد اور اصول دین سے عقل و منطق کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور پیغمبر اسلام کے بعد پیدا ہونے والے نت نئے اسلامی فرق و مذاہب کے عقائد کا ذکر کر کے دکھایا گیا ہے کہ اصل اور سچا مسلک مسلک تشیع ہے۔

قرآن و احادیث نبوی اور ارشادات ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے بھی اسی مسلک کی حقانیت ثابت ہوتی ہے اور عقل و منطق بھی اسی کو درست قرار دیتی ہے۔

مؤلفہ

محمد باقر النقوی

مولوی فاضل، صدر الافاضل

مدیر رسالہ اصلاح کھجوا ضلع سارن (بہار)

مطبوعہ مطبع اصلاح کھجوا ضلع سارن (بہار)

5/-

شیعہ امامیہ

مترجمہ

محمد باقر النقوی

مولوی فاضل صدر الافاضل

مدیر اصلاح کھجوا ضلع سارن (بہار)

مطبوعہ مطبع اصلاح کھجوا ضلع سارن بہار

باسمہٖ سبحانہٗ

دو تین برس ہوئے دفتر اصلاح سے ایک مبسوط کتاب "شیعہ کون ہیں اور کیا ہیں"؟ شائع ہوئی تھی جس میں وضاحت کی گئی تھی کہ مذہب شیعہ مسلمانوں سے علیحدہ کوئی مذہب نہیں شیعوں کے عقائد و نظریات اُن کے اصول و فروع ٹھیک وہی ہیں جو حضرت پیغمبر خداؐ اور اہلبیت طاہرینؑ اور نیکو کار صحابہ کرام کے تھے۔ اسی کے ساتھ اُن مظالم کا تذکرہ بھی تھا جو اسلامی حکام و سلاطین ہر دور میں شیعوں پر کرتے رہے نیز اُن اعتراضات و اتہامات کا دفعیہ بھی جو دشمنان تشیع کی طرف سے اکثر اوقات شیعوں پر لگائے گئے۔ منعم حقیقی کا تفضّل و احسان کہ مومنین نے اس کتاب کو اپنی قبولیت و پسندیدگی سے سرفراز کیا۔

اسی کتاب کی اشاعت کے بعد سے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ ایک ایسی کتاب شائع کیجائے جس میں شیعوں کے بنیادی عقائد اور اصول دین سے ذرا مفصّل بحث ہو اور پیغمبر اسلامؐ کی بعد آئے دن پیدا ہونے والے نت نئے اسلامی فرق و مذاہب کے عقائد کا ذکر کر کے یہ دکھایا جائے کہ صحیح اور سچا مسلک، مسلک تشیع ہی ہے۔ قرآن و ارشادات پیغمبرؐ سے بھی اسی مسلک کی حقانیت ثابت ہوتی ہے اور عقل و منطق بھی اسی کو درست قرار دیتی ہے۔

میں شکر گذار ہوں اپنے شفیق بزرگ علّامہ ڈاکٹر سیّد مجتبیٰ احسن صاحب قبلہ کامونپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا کہ اُنھوں نے "شیعہ کون ہیں اور کیا ہیں"؟ کو ملاحظہ فرمانیکے بعد از راہ پسندیدگی و ستائش بیروت کے ایک جلیل شیعہ عالم ہاشم معروف الحسینی کی بلند پایہ تصنیف "الشیعہ بین الاشاعرہ والمعتزلہ" کی طرف نشاں دہی کی اور اب میں اُس کا ترجمہ "شیعہ امامیہ" کے نام سے ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ جسطرح وہ ہماری محنت و ریاضت کو ہمیشہ سے سراہتے رہے ہیں اس کو بھی سند قبول عنایت فرمائیں گے وما توفیقی الّا باللّٰہ وعلیہ توکلت والیہ اُنیب۔

کمترین محمد باقر النقوی
مدیر اصلاح

باسمہ سبحانہ

تمہید

حضرت پیغمبر خداؐ نے اپنی بعثت کے ابتدائی برسوں میں اسلام کی تین بنیادی باتوں کے اثبات اور لوگوں کے ذہن نشین کرانے میں سب سے زیادہ محنت کی۔

(۱) خدائے واحد و یکتا کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا اور جن بتوں کو اُنھوں نے اپنا پروردگار بنا رکھا تھا ان کی عبادت و پرستش کو باطل ٹھہرانا۔

(۲) حضرت محمد مصطفےٰؐ خدا کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں، خداوندِ عالم نے انھیں تمام نوع بشر کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ آپ لوگوں کو جہالت و گمراہی سے نکالیں اور ایسے راستے کی طرف انکی رہبری کریں جو دنیا میں اُن کے لئے سعادت و نیک بختی اور آخرت میں دائمی راحت و آرام کا ضامن ہے۔

(۳) اس زندگی کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کا ایمان و اعتقاد تاکہ ہر انسان اپنے اعمال کی جزا پائے، جو شخص ذرہ برابر نیک کام کئے ہوگا وہ اس کی نیک جزا پائے گا اور جو شخص ذرہ برابر بُرا کام کئے ہوگا بری سزا پائے گا۔

یہی وہ تین بنیادی اُصول تھے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہوئی انھیں تینوں پر اسلام کے بقیہ اصول و فروع قائم و استوار ہوئے۔

حضرت سرورِ کائناتؐ مبعوث برسالۃ ہونے کے بعد ۱۳ برس تک مکہ میں اقامت گزیں رہے اور اس پورے عرصہ میں آپ اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لے کر لوگوں کو ان تینوں بنیادی باتوں کی طرف دعوت دیا کئے۔ آپ کا وہ بے نظیر حکیمانہ انداز وہ دلوں میں اُتر جانے والی خوش بیانی، وہ آپ کا محیر العقول کردار و گفتار، آپ نے ان تمام صلاحیتوں سے پورا پورا کام لیا۔ قرآن نے بھی ہر ایسے اسلوب سے جو عربوں کی طبیعت اور فطرت سے مناسبت رکھتا تھا اور جس کے ساحرانہ اندازِ بیان سے اُن کے نفوس کو لذت ملتی تھی، ان اُصول کی طرف عرب والوں کو دعوت دی۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی ایسا سورہ ہو جس میں مختلف اسالیب اور نت نئے انداز سے ان بنیادی اُصولوں پر زور نہ دیا گیا ہو اور عرب والوں کے دل و دماغ میں اُتارنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود مشرکین عرب نے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور نہ آپ کے نصائح اور تعلیمات پر اُنھوں نے کوئی دھیان دیا۔

اور باوجودیکہ عرب والوں نے آپ کو ہر طرح کی اذیتیں پہونچائیں ایک مرتبہ نہیں کئی کئی مرتبہ آپ کی جان لینے کے لئے اپنی تمام طاقتیں صرف کر ڈالیں مگر آپ کے عزم وارادہ میں کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوئی۔ نہ اپنی رسالت کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں آپ کو ذرہ برابر پس و پیش لاحق ہوا۔ یہاں تک کہ اگر عرب والے آپ کے ایک ہاتھ پر سورج دوسرے پر چاند لاکر رکھ دیتے تب بھی آپ اپنی رسالت کی تبلیغ سے باز آنے والے نہ تھے۔ ۱۳ برس تک مکہ میں تبلیغ کرنے کے بعد جب آپ نے مکہ کو خیرباد کہا اور مدینہ ہجرت کر گئے تو آپ نے وہاں ایسا ماحول پایا جو ان اصول و مبادی کو قبول کرنے کی خاصی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہاں ایسے قلوب ملے جنھوں نے وحیِ خداوندی، تعلیمات نبویؐ آنحضرت کی سیرۃ و کردار اور آپ کی حکمت و دانش میں خدائی جلوے دیکھے۔ چنانچہ مدینے کے اکثر باشندے آپ پر ایمان لائے اور بغیر کسی تردد اور کسی قسم کے شک کے انھوں نے آپ کی دعوت قبول کرلی وہ پیغمبر کے ہو رہے اور پیغمبر اُن کے ہوئے۔ آپ پورے جوش و ولولہ اور ہر ممکن سرگرمی سے کام لیتے ہوئے اپنے مشن کی تبلیغ میں منہمک رہے۔

یہاں تک کہ آپ کی تبلیغات نے سبھی دلوں میں اپنی جگہ پیدا کرلی ہر دل و دماغ پر آپ کی تعلیمات کا قبضہ ہوا اور وہی عرب والے جو کل تک آپ کے جانی دشمن اور آپ کے خون کے پیاسے تھے آپ ہی کے عقائد کے حامل بن گئے۔

اور اگرچہ قرآن مجید کی وہ آیتیں جن میں تینوں اصول اسلام کی بنیادی باتوں کا ذکر ہے ان میں بظاہر مطابقت نہیں، یعنی ان سے ایک ہی جیسا خدا کا تصور نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورہ شوریٰ کی آیت ہے۔ لیس کمثلہ شی وھو السمیع البصیر، اس کے جیسی کوئی چیز نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ سورۂ اخلاص کی آیت ہے۔ لم یلد ولم یولد، وہ نہ خود پیدا ہوا نہ اس نے کسی کو پیدا کیا۔ دوسری آیت میں ہے۔ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار، اس کو نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں وہ نگاہوں کو دیکھتا ہے۔ ایک اور آیت میں ہے۔ اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکاۃ فیھا مصباح اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی فانوس جس میں چراغ روشن ہو۔

اسی طرح کی اور بہت سی آیتیں جو تاکیدی طور پر بتاتی ہیں کہ خداوند عالم کسی بات میں بھی اپنے مخلوقات کے مشابہ نہیں نہ دیگر محسوسات کی طرح اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اسی کے ساتھ بہت سی آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں خداوند عالم کی کچھ اس طرح ثنا و صفت مذکور ہے جن سے وہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخلوقات سے ملتا جلتا ہے چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے الذی خلق السموات والارض ثم استوی علی العرش۔ وہ خدا جس نے زمین و آسمان کو خلق کیا پھر عرش پر متمکن ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔ جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ اصل میں خدا کی بیعت کرتے ہیں اور خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھ کے

اُوپر ہے اسی قسم کی اور کئی آیتیں جن سے تشبیہ اور تجسیم کا وہم پیدا ہوتا ہے۔

تو باوجود کلام مجید کی ان آیات کے جن کو پہلی نظر میں دیکھنے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ ان آیتوں کے ظاہر معنوں میں مطابقت نہیں ایک آیت کچھ بتاتی ہے دوسری کچھ پھر بھی صحابہ کرام کسی قسم کے تردد یا شک و شبہ میں مبتلا نہیں رہے نہ اُن کے درمیان ان اختلافات اور نزاع کا زور رہا جو آگے چل کر دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے درمیان رونما ہوئے خداوند عالم کی صفات کے متعلق اس کی حد ذات اور اس کے خلق افعال وغیرہ کے متعلق نیز اور دوسرے اختلافات اور نزاعات جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے جن کی وجہ سے مسلمانوں کا شیرازہ درہم و برہم ہوا اور وہ کئی گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے اُن میں باہمی مغائرت اور اجنبیت پیدا ہو گئی ان سب باتوں کا پیغمبرؐ خدا کی زندگی میں کہیں وجود نہ تھا اس لئے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں نے ان تمام باتوں کو دل و جان سے قبول کیا جو قرآن نے اُن کے سامنے پیش کیں چاہے وہ اصول دین سے متعلق رہی ہوں یا احکام و مسائل سے انھوں نے اپنی فطرت سلیمہ کی بدولت ٹھیک وہی معنے سمجھے جو مقصود خداوندی تھے۔ انھوں نے آیات قرآنی کے لفظی اختلاف کی وجہ سے جو کسی نہ کسی مصلحت اور مناسبت کی بنا پر تھے کبھی دو آیتوں میں مقابلہ نہیں کیا ایک آیت کے مقابلہ میں دوسری آیت نہیں لائے خود حضرت پیغمبرؐ خدا کی بڑی کوشش رہتی کہ صحابہ کرام اپنے تمام شکوک و شبہات میں آپ ہی کی طرف رجوع کریں آپس میں بحث و تکرار نہ کریں۔ چنانچہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ خدا کسی دن اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے۔ دیکھا کہ وہ قضا و قدر کے متعلق نزاع کر رہے ہیں، دونوں فریق اپنے دلیل و ثبوت میں قرآن مجید کی آیتوں کو پیش کر رہے ہیں۔ ان کی بحث و تکرار نے پیغمبرؐ کو برہم کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔

"کیا تم لوگوں کو یہی حکم دیا گیا ہے؟ انھیں حرکتوں سے تمہارے پہلے کے لوگ تباہ و برباد ہوئے انھوں نے کتاب خداوندی کے بعض حصوں کو دوسرے بعض حصوں کے مقابلہ میں پیش کیا حالانکہ وہ بعض حصّے دوسرے بعض حصوں کی تصدیق ہی میں نازل ہوا تھا۔ دیکھو جو میں نے حکم دیا ہے اسے بجا لاؤ اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز رہو۔"

حضرت سرور کائناتؐ کی انتہائی کوشش اس بات کی رہی کہ مذہبی بحث و تکرار اور عقائدی جنگ سے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہ رہے کیونکہ اس قسم کی بحث و تکرار سے اُن کا شیرازہ درہم و برہم اور انکی قوت ختم ہو جائے گی اور سوا گمراہی اور سرگشتگی کے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسلام حقیقتاً عملی دین ہے۔ اسے مبہم فلسفیانہ خیالات اور پیچیدہ علمی نظریات سے جو دماغ میں شکوک و شبہات کو جنم دیں کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام جس طرح انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان علاقہ کو مضبوط و منظم کرتا ہے اسی طرح یہ بھی بتاتا ہے کہ خود اس کی ذات اس کے اہل و عیال کے کون کون سے حقوق و فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں، جس معاشرہ اور سوسائٹی میں وہ جی رہا ہے اس کے کیا کیا حقوق اس پر واجب ہیں۔

پیغمبر خدا نے اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز رکھی کہ قرآن نے جو اصول و قوانین مرتب کئے ہیں انھیں اصول و قوانین کی بنیاد پر لوگوں نے نفوس کی اصلاح کریں اور صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر اور آپ کی انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عرب والوں نے ان اصلاحات کو دل سے پسند کیا۔ اُن کے نفوس کی بہت کچھ اصلاح ہو گئی جس کی وجہ سے پورے جزیرہ نمائے عرب میں دعوت اسلامیہ پھیلی اور وہ بڑی بڑی بادشاہتیں جو دنیا کے بہت بڑے حصہ پر قابض تھیں ان کے پایہ تختوں پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ مذہبی بحث و تکرار اور عقائدی جنگ کی طرف اس زمانہ میں مسلمانوں نے دھیان ہی نہیں دیا اور نہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر ہی کہیں ملتا ہے سوا چند ایک افکار و خیالات کے جس کا اس وقت کے مسلمانوں کو کبھی کبھار سامنا کرنا پڑا۔

علامہ مقریزی لکھتے ہیں:

"جس شخص کی بھی تاریخ پر نظر اور صدر اول کے مسلمانوں کی واقفیت ہے وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ کسی بھی صحابی کے متعلق خواہ وہ کسی درجہ کا ہو کوئی بھی روایت نہیں بتاتی نہ کمزور وضعیف نہ صحیح و مشہور کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں اپنے جو اوصاف ذکر کئے ہیں یا پیغمبرؐ خدا نے خداوند عالم کی جو ثنا و صفت کی ہے ان میں سے کسی چیز کے متعلق انھوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا ہو کہ حضور اس کا کیا مطلب ہے بلکہ انھوں نے خود ہی اُن کا مفہوم و مراد سمجھا اور اس میں بحث و گفتگو سے باز رہے۔ انھوں نے خداوند عالم کے لئے بغیر کسی نزاع و تکرار کے وہی باتیں تسلیم کیں جو خود خداوند عالم نے اپنے لئے ثابت کی تھیں" (خطط مقریزی)

حضرت پیغمبر خدا کے زمانہ کے بعد صحابہ کا زمانہ آیا تو باوجودیکہ اسلامی سلطنت کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا نت نئے واقعات رونما ہو چکے تھے، عرب والے دیگر اقوام و ملل سے جنھوں نے اسلامی اقتدار کے آگے سر خم کر دیا تھا گھل مل چکے تھے ان سب کے باوجود صحابہ کرام اسی راستہ پر گامزن رہے جو رسول اللہ ان کے لئے متعین فرما گئے تھے۔ اُنھوں نے عقائد سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا نہ کسی ایسی بات میں نزع و تکرار کی جس میں نزاع و تکرار کرنے کو رسول اللہ منع فرما چکے تھے، نئے پیش آنے والے مسائل میں اُنھوں نے کتاب و احادیث پیغمبرؐ کی طرف رجوع کیا بعض لوگوں نے ایسے مسائل میں جن کے متعلق کتاب میں کوئی نص نہیں ملتی قیاس کا بھی اضافہ کیا پھر بھی عقائد کے متعلق وہ ایک دوسرے سے قطعی نہیں اُلجھے۔ مسلمانوں میں نظریات و عقائد کی اس جنگ و جدال کا آغاز تو اس وقت ہوا جب کہ صحابہؓ کرام کا دور ختم ہو چکا تھا اور عباسی عہد آتے آتے یہ جنگ شباب پر پہونچ گئی اس وقت نت نئے افکار و نظریات کی گرم بازاری تھی، نئے نئے مذاہب پیدا ہو چکے تھے اور مسلمان سیکڑوں فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکے تھے ہر فرقہ ایک دوسرے کو کفر و فسق زندقہ و الحاد کا الزام لگاتا تھا۔

بعض مصنفین اس عقائدی جنگ کی نسبت ان لوگوں کی طرف دیتے ہیں جو جزیرہ نمائے عرب کے رہنے والے نہیں بلکہ باہر سے آکر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ لوگ مختلف ادیان و معتقدات کے

حامل رہ چکے تھے اور بعض معتقدات میں ان کی نزاع بہت پرانی تھی جو اُن کے دل و دماغ سے مٹنے نہیں پائی تھی اُن کے میل جول کی وجہ سے بعض اختلافات مسلمانوں کے دماغ میں بھی گھس گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اوقات بہت سے شکوک و شبہات نے جنم لیا۔

چنانچہ شرح نہج البلاغہ میں ہے کہ جنگ صفین سے واپس آتے ہوئے راستہ میں ایک بوڑھے نے امیر المومنینؑ سے پوچھا۔ حضور کیا ہمارا یہ سفر قضا و قدر الٰہی کے سبب تھا؟

امیر المومنینؑ نے فرمایا۔

"قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شگافتہ اور روح کو پیدا کیا ہم کسی وادی میں نہیں اُترے نہ کسی پہاڑ پر چڑھے مگر قضا و قدر الٰہی کے سبب!

سائل کو یہ جواب سن کر مایوسی ہوئی اس نے کہا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے جتنی زحمتیں اٹھائیں ان کا کوئی اجر نہیں ملے گا مگر جب امیر المومنین نے اس قضا و قدر کی تشریح فرمائی جو ہر ایک کے لیے ناگزیر ہے اور راہ فرار جس سے ممکن نہیں تو وہ خوش ہو گیا اور ہشاش و بشاش اس کا یقین لے کر اٹھا کہ ہمارا اجر ضایع نہیں جائے گا۔

روایتوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ ایک چور پکڑ کر حضرت عمر کے پاس لایا گیا۔ حضرت عمر نے پوچھا، تم نے کیوں چوری کی؟ اس نے کہا قضائے الٰہی یہی تھی۔ حضرت عمر نے اس کا ہاتھ قطع کیا اور کوڑے بھی مارے کیونکہ اُس نے خدا پر تہمت دھری تھی۔

ان مثالوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان امور میں بحث و تکرار کے لئے نئے راستے تو کھُل گئے تھے مگر یہ بحثیں گنتی کے افراد سے متجاوز نہ ہو سکی تھیں کبھی کبھی ایک دو آدمی کے دماغ میں اس قسم کی اُلجھنیں ضرور پیدا ہو جاتی تھیں مگر وہ ان کے دلوں ہی میں پوشیدہ رہتی تھیں انھیں مددگار نہیں ملتے نہ ایسے لوگ میسر آتے جن سے وہ تبادلۂ خیال کر سکیں کیونکہ اس وقت تک مسلمان اسی کے عادی تھے کہ قرآن یا رسولؐ جو کچھ فرمائیں اسے بے چون و چرا تسلیم کیا جائے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خلفائے اربعہ کے زمانہ تک مسلمان فتوحات میں لگے ہوئے تھے آئے دن نت نئے ملکوں پر چڑھائیاں ہوا کرتیں انھیں بس یہ فکر تھی کہ اسلامی حکومت کا دائرہ جہاں تک ہو سکے پھیلے وہ اسی زندگی سے مانوس تھے اور ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ دنیا بھر کی دولت سمٹ سمٹ کر اُن کے قدموں میں ڈھیر ہو رہی تھی زندگی کی لذتوں اور عیش کوشیوں کی نئی نئی راہیں کھل رہی تھیں۔ اس وقت سارے ہی مسلمان اسلامی لشکر کے سپاہی تھے، لڑائی کا سلسلہ برابر جاری تھا اسلامی سلطنت اور آس پاس کی دوسری حکومتوں میں تقریباً دس برس تک لڑائی کی آگ مسلسل بھڑکتی رہی تھی جب آس پاس کی رومی و ایرانی حکومتیں قبضہ میں آگئیں تو وہ دور دراز کے علاقوں پر چڑھ دوڑے۔ غرضکہ ان کی زندگی نے نہ تو انھیں اس کا موقع دیا کہ وہ اپنی مسائل میں غور و فکر کر سکیں نہ اس کا موقع کہ وہ ان

مسائل میں نزاع و تکرار کریں جو بعد کے زمانہ کے علماء و ارباب فکر کی خصوصی توجہات کا مرکز بنے اور جن مسائل کی بنیادوں پر بہت سے اعتقادی فرقے پیدا ہو گئے اور علماء کے خیالات و نظریات ایکدوسرے سے متضاد ہوئے وہ گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے۔ اختلافات اور نزاعیں ان کے بیشتر افکار و نظریات و معتقدات میں انتہائی حدوں سے بھی متجاوز ہو گئیں جیساکہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

مختصر یہ کہ صحابۂ کرام کا زمانہ بھی بڑی حد تک پیغمبرؐ کے زمانہ کے مشابہ تھا دینی اُموریں مسلمانوں کی عملی پہلو پر زیادہ توجہ تھی اُن میں کوئی جھگڑا تکرار نہیں پیدا ہوا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ کسی کسی صحابی سے جرائم و کبائر کا صدور بھی ہوتا رہا اور انھوں نے مواخذہ واحتساب سے بچنے کے لئے قضاو قدر کی آڑ بھی لی مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ اس زمانہ میں بھی قضاو قدر اور بندہ کے مجبور و مختار ہونے پر بحث و تکرار کی ویسی ہی گرم بازاری تھی جیساکہ بعد کے زمانہ میں ہوئی۔ اس قسم کے شوشے اکادکا لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہوتے مگر اپنی موت آپ مرجاتے یا بس انھیں لوگوں کے دماغوں میں چھپے رہتے۔

البتہ اموی عہد حکومت میں یہ کیفیت باقی نہیں رہی اس زمانہ کے مسلمانوں میں کافی فرق ہو چکا تھا علماء کی کثرت ہو چکی تھی اور یہ علماء ممالک اسلامیہ کے مشرق و مغرب میں پھیل گئے تھے وہ حدیث و قرآن کی روشنی میں دین و مذہب کا مطالعہ بحث و تمحیص اور غور و فکر کرنے میں منہمک تھے تاکہ اسلامی مملکت کی توسیع اور عربوں کے مفتوحہ ممالک کے مسلمانوں سے میل جول کے نتیجہ میں جو نت نئے مسائل آئے دن پیدا ہو رہے ہیں اُن کے احکام کی واقفیت حاصل کر سکیں یہ مفتوحہ ممالک کے رہنے والے اپنے خصوصیات و عادات اور اپنے ادیان و مذاہب کی وجہ سے امتیازی حیثیت کے مالک تھے اور اسی وجہ سے مسلمان اور اہل علم حضرات مجبور ہوئے کہ وہ چھان بین اور قرآن و حدیث اور لغت کے مطالعہ اور بحث و نظر میں زیادہ وسعت سے کام لیں تاکہ ان جزئی جزئی باتوں کے احکام معلوم کرنے میں مدد ملے جو عصری تقاضوں کی پیداوار ہیں۔ بہت سی باتیں اب پیغمبرؐ کے زمانہ جیسی نہیں رہ گئی تھیں قرآن و حدیث کے اس وسیع مطالعہ نے علماء کو نئے مرحلہ میں لا ڈالا تھا جس کا سامنا نہ عہد صحابہ ہی میں انھیں کرنا پڑا تھا نہ عہد رسولؐ میں۔ اس طرح وہ بہت سے پیچیدہ مسائل جن کے احکام معلوم کرنے کے وہ درپے تھے حل کر سکے۔ اسی طرح بہت سے مسائل میں جن کا حکم نصوص کتاب سے معلوم کرنا دشوار تھا انھوں نے قیاس سے بھی کام لیا اور رفتہ رفتہ قیاس بھی بعض فقہا کے نزدیک کتاب و سنۃ پیغمبر کے پہلو بہ پہلو ایک دلیل سمجھا جانے لگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ، ان کے معانی و مطالب میں بحث و تمحیص ہی کی وجہ سے عقائد میں نزاع پیدا ہوئی بنی امیہ کے عہد حکومت میں اس کی ابتدا ہوئی اور بنی عباس کے زمانہ میں یہ نزاع انتہا کو پہونچ گئی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ خوارج، مرجۂ، معتزلہ اشاعرہ اور

اُن کے پیروسب کے سب اپنے نظریات و معتقدات میں قرآن و حدیث ہی سے کام لیا کرتے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن و حدیث اپنے دامن میں بہت سے ایسے مباحث لئے ہوئے تھے۔ جن میں ان مذکورہ بالا فرقوں کے نظریات ایک دوسرے کے جُدا گانہ تھے۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس کے قائل تھے کہ خداوند عالم نگاہوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور وہ بھی دیگر اجسام کی طرح ہے اُن کی دلیل کلام مجید کی وہ آیتیں تھیں جن کے ظاہری الفاظ اسی نتیجہ تک پہونچاتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اس کے قائل تھے کہ بندوں کے سارے افعال خدا کے افعال ہیں، یا وہ لوگ جو قائل تھے کہ بندے خود مختار ہیں اور جو چاہتے ہیں خود کرتے ہیں، یہ دونوں ہی طرح کے لوگ کلام مجید کی بعض آیات کو ثبوت پیش کرتے ہیں اور ہر فریق ان آیات کو اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کرتا ہے فرقہ مجبرہ والے جو اس کے قائل ہیں کہ بندہ فاعل مجبور ہے اصل میں جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے وہ خداوند عالم کے اس ارشاد سے ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوۃ ولہم عذاب عظیم۔ خداوند عالم نے اُن کے دلوں پر اُن کے کانوں پر مہر کر رکھی ہے اُن کی نگاہوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کے لئے عذاب عظیم ہے۔ نیز اس آیت سے کہ لا ینفعکم نصحی ان اردت ان انصح لکم ان کان اللہ یرید ان یغویکم ھو ربکم و الیہ ترجعون۔ میں تمھیں نصیحت کرنا چاہوں بھی تو میری نصیحت تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی اگر خدا کا یہی ارادہ ہو کہ وہ تمھیں گمراہ کرے وہ تمھارا پروردگار ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔ نیز اس آیت سے کہ افمن حقت علیہ کلمۃ العذاب افانت تنقذ من فی النار۔ جس کے لئے عذاب کا حکم متعین ہو چکا ہو کیا آپ اس کو آتش جہنم سے نکال لیں گے؟ نیز اس آیت سے کہ سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا نحن ولا ابناءنا ولا حرمنا من شئ کذالک کذب الذین من قبلہم حتی ذاقوا باسنا قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن و ان انتم الا تخرصون۔ عنقریب (قیامت کے دن) وہ لوگ جنھوں نے شرک اختیار کیا کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز سے محروم رہتے۔ اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی جھوٹ بولا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے دبدبہ کا مزا چکھا۔ پیغمبر ان لوگوں سے کہو اگر تمھارے پاس کوئی یقینی ثبوت ہو تو ہمیں بتاؤ۔ تم لوگ تو صرف خیالات و اوہام کی پیروی کرتے ہو اور ساری باتیں تمھاری اٹکل پچو ہیں، جس طرح فرقہ قدریہ والوں کی سب سے بڑی دلیل اپنے مسلک پر کلام مجید کی یہ آیتیں تھیں فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر، جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے من یعمل سوءً او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما۔ جو شخص کسی بدی کا مرتکب ہو یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر وہ خداوند عالم سے طالب مغفرت ہو، وہ خداوند عالم کو غفور و رحیم پائے گا نیز اور بہت سی آیتیں جن میں افعال کی نسبت انسان کی طرف دی گئی ہے جیسے۔ ان الذین آمنوا

وعملوا الصالحات، وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کرو۔ من یکسب اثماً فانما یکسبہ علی نفسہ وکان اللہ علیما حکیما۔

اسی طرح وہ حدیثیں بھی جن کا اس زمانہ کے مسلمانوں میں چرچا تھا ان میں بھی اسی قسم کے اشارے ملتے ہیں چنانچہ جناب جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ پیغمبر خدا نے فرمایا۔ لا یؤمن عبد حتی یؤمن بالقدر خیرہ و شرہ حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیخطئہ وما اخطاہ لم یکن لیصیبہ، کسی بندہ کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ قدر الٰہی پر ایمان نہ لائے۔ خیر وشر دونوں پر اور جب تک یہ یقین نہ کرے کہ جس چیز کا اُسے سامنا کرنا پڑا ہے وہ اس سے ٹلنے والی نہیں تھی اور جو چیز ٹل گئی ہے وہ اس کو پیش آنے والی نہ تھی۔

لہذا قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں اس قسم کے مباحث پیدا ہوں اور ان مباحث میں لوگوں کے خیالات و نظریات میں اختلاف واقع ہو اس لئے کہ آیات میں حقیقت واقعہ کی ترجمانی ایک ہی طریقہ میں منحصر نہیں بلکہ جیسا محل اور موقع رہا ویسی ہی تعبیرات رہیں اسی لئے پیغمبرؐ خدا کی حدیث میں مذکور ہے کہ ان القرآن یصدق بعضہ بعضا قرآن کا بعض حصہ بعض کا مصدق ہے۔

خلاصہ یہ کہ پیغمبرؐ خدا کے زمانہ کے مسلمان نیز پیغمبرؐ خدا کے بعد خلفاء اربعہ کے زمانہ کے مسلمان پیغمبرؐ نے جو کچھ فرمایا یا قرآن نے جس بات کی صراحت کی اس پر ایمان رکھتے تھے اور علمی پہلو سے زیادہ اُن کی توجہ عمل ہی پر رہی اُن کے درمیان نہ تو خداوند عالم کی کسی صفت کے متعلق کوئی بحث و تکرار ہوئی نہ انسان کے مختار یا مجبور ہونے کے متعلق۔ نہ اُن مسائل میں سے کسی مسئلہ میں وہ آپس میں الجھے جن مسائل نے دوسری صدی کے مسلمانوں کے غور و فکر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ پیغمبرؐ کے زمانہ کے مسلمان تمام اُمور میں پیغمبر خدا کی طرف رجوع کرتے پیغمبرؐ نے عمل کی راہیں معین کر دی تھیں اور وہ پوری تن دہی سے عمل کی طرف متوجہ تھے پیغمبرؐ نے ان سے جو کچھ بیان کیا اسی کی دل و جان سے تصدیق کی اور اس بات کا بھی خیال رکھا کہ پیغمبرؐ کی خواہش یہی ہے کہ ان موضوعات میں غور و فکر اور بحث و تمحیص سے گریز ہی بہتر ہے کسی موقع پر آنحضرتؐ نے یہ ارشاد بھی فرمایا تھا کہ ما امرتکم بہ فافعلوہ وما نہیتکم عنہ فاجتنبوہ میں نے جن باتوں کا تمھیں حکم دیا ہے اُسے بجا لاؤ اور جن باتوں سے تمھیں روکا ہے اُن سے پرہیز کرو۔

اور منجملہ اُن باتوں کے جن سے آنحضرتؐ نے روکا تھا ذات و صفات خداوندی اور انسان کے مختار و مجبور ہونے کے متعلق بحث و نزاع بھی تھی۔

دوسرا بڑا سبب یہ کہ مسلمان خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں اس وقت مملکت اسلامیہ کی تاسیس میں

منہمک تھے پھر ہجرت کے بعد غزوات و فتوحات نے مسلمانوں کو قرآن میں غور و فکر اور بحث و تکرار کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ ہاں جب انھیں ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تب وہ ان مسائل کی طرف متوجہ ہوئے جو غیر فقہی تھے، اور جن کا تعلق عمل سے نہ تھا اور اب ان کے نظریات و افکار میں بھی اختلاف پیدا ہوا اور فقہی مسائل میں بھی۔

تیسرا سبب یہ کہ فاتحین کا دوسری قوموں سے میل ہوا جن سے مسلمانوں نے جنگ کی تھی۔ اب وہ اسلام کے اطاعت گزار بن گئے تھے ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو مختلف مذاہب و ادیان کے پابند رہ چکے تھے یہ لوگ اگرچہ دائرہ اسلام میں اب داخل ہو گئے تھے اور اس کے اصول و قوانین کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا لیکن باپ دادا سے جن نظریات و معتقدات کو انھوں نے میراث میں پایا تھا ان نظریات و معتقدات کا ذہن و دماغ سے بہت جلد دور ہو جانا آسان نہ تھا۔ یقیناً انھوں نے اپنے نئے مذہب (اسلام) کا موازنہ اپنے سابقہ مذہب اور باپ دادا کے عقائد و نظریات سے کر کے دیکھا ہوگا۔ انھوں نے اپنے جی میں اس کا فیصلہ بھی کیا ہوگا کہ یہ ہمارا نیا دین (اسلام) اور اسکے معتقدات صحیح ہیں جن میں ہم خوشی خاطر یا جبراً قہراً داخل ہوئے ہیں یا ہمارا سابقہ دین اور پہلے والے نظریات و معتقدات صحیح ہیں جنھیں خیر باد کہہ دینا پڑا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ خداوند عالم کے صفات کے متعلق بحث و تکرار، انسان کے مجبور و مختار ہونے کے متعلق بحث، جنت و نار وغیرہ کے متعلق نزاع و تکرار مسلمانوں کی ایجاد نہ تھیں بلکہ یونان و فارس، یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام کے فلاسفہ مسلمانوں سے بہت پہلے طبع آزمائیاں کر چکے تھے۔ سبھی مورخین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا وہ شخص جس نے قضا و قدر کے متعلق اپنی زبان کھولی وہ ایک عیسائی شخص تھا جو مسلمان ہوا پھر مرتد ہوگیا اور اسی عیسائی شخص سے معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے تعلیم حاصل کی تھی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اختلافی افکار و نظریات میں بحث و مباحثہ عام ہونے کا اصل سبب دیگر اقوام و ملل سے مسلمانوں کا میل جول تھا۔ مزید برآں دیگر اقوام و ملل میں سے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے نئے دین میں ایک ہی جیسے نہ تھے بعض اُن میں ایسے تھے جو ظاہری طور پر تو مسلمان ہو گئے تھے مگر دل میں کفر و نفاق چھپائے ہوئے تھے یہ لوگ مخفی طور پر اسلام کی تعلیمات کو غارت کرنے کے درپے رہتے۔ اُنھوں نے پیغمبرؐ کی حدیثوں میں بہت سی خود ساختہ اور خانہ ساز حدیثیں داخل کر دیں اصول دین کے بارے میں بھی اور فروعی مسائل کے متعلق بھی، انھوں نے اپنے ذہنی خیالات کی مسلمانوں میں ترویج و اشاعت کی مسلمانوں نے اُن کے خیالات کو دل سے قبول کیا اور قبول نہ بھی کرتے تو کیسے جب کہ یہ لوگ قرآن سے اس کی سند بھی پیش کر دیتے تھے۔ پیغمبرؐ خدا اور صحابہ کرام کے زمانہ میں منافقین کو ان سب باتوں کا موقع نہیں ملا ان کے لیے ممکن نہ ہوا کہ اپنا زہر پھیلا سکیں کیونکہ صحابہ کرام پیغمبرؐ کی صحبت میں رہ چکے تھے پیغمبرؐ کو انتقال کئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کعب الاحبار اور ابوہریرہ جیسے لوگوں کی

روایتیں اسی وقت رواج پا سکیں جب صدر اول کے مسلمانوں سے دنیا خالی ہو گی پیغمبر کے جلیل القدر اصحاب
ایک ایک کرکے دنیا سے اُٹھ گئے۔ بہت سے محدثین نے روایت کی ہے حضرت عمر نے ابوہریرہ کو کوڑوں سے
پیٹا کیونکہ وہ پیغمبرؐ کی طرف منسوب کرکے بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنے لگے تھے اکابر و اعلام صحابہ اُن کی
حدیثوں سے قطعی پرہیز کرتے تھے کعب الاحبار کا حال تو ابوہریرہ سے بھی بدتر تھا۔

ان مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا جس کی خطرناکی مذکورہ اسباب سے کسی طرح
کم نہ تھی اور وہ یہ کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں بہت سی فارسی اور یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر لیا گیا
تھا عباسی زمانہ میں یونانی فلسفہ عربوں میں پوری طرح پھیل چکا تھا اور اہلِ عرب غیر عربوں سے پوری طرح
گھل مل چکے تھے۔ ہر فریق بغیر کسی جھجک کے اپنے عقائد کا اظہار کرنے لگا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الحاد و
شک اور مسلمانوں اور دوسرے غیر مسلم فرقوں میں بحث و تکرار کی عام وبا پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے مجبور
ہو کر مہدی عباسی نے علمائے کلام کو حکم دیا کہ وہ ملحدین کی رد میں کتابیں لکھیں اب مسلمان بھی فلسفہ کی کتابیں
پڑھنے پر مجبور ہوئے تاکہ ان کی مدد سے وہ ان دیگر مذاہب والوں سے مناظرہ اور ان کی رد کر سکیں جو اسلامی
اصول میں شک و شبہات پیدا کر رہے تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں بحث و تکرار اور مناظرہ بازی جتنی بڑھتی
گئی اتنا ہی غیر ملکی کتابوں کے ترجمے زیادہ سے زیادہ ہوتے گئے۔ مامون کے زمانہ میں تو خاص ایک محکمہ ہی
تالیف و ترجمہ اور مناظرہ کا قائم کر دیا گیا تھا جس کا نام مامون نے دار الحکمہ رکھا تھا (فرق اسلام مولفہ علی غرابی ص۱۳۶)

اسلام نے چونکہ غیر مسلموں کے مسلمانوں کے ساتھ رہنے پر کوئی بندش عائد نہیں کی تھی بشرطیکہ وہ اسلامی نظام
حکومت کا احترام کریں اس سے مسلمانوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ سریانی عیسائیوں کی بدولت مسلمانوں کو یونانی
فلسفہ حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ سریانی عیسائی، یونانی فلسفہ کو اپنی سریانی زبان میں نقل کر چکے تھے
اُن کے ذریعہ شام و عراق میں اسکی اشاعت ہوئی۔ ان لوگوں نے شام و عراق میں اس فلسفہ کی درس و تدریس
اور اشاعت کے لئے بہت سے مدرسے قائم کر رکھے تھے جب مسلمانوں نے شام و عراق فتح کیا اس وقت بھی
یہ مدرسے وہاں قائم تھے اور یونانی فلسفہ کی تعلیم پوری طرح جاری تھی مسلمانوں نے بھی اس کو سیکھنے کی شدید
ضرورت سمجھی اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہ تھی کہ انھیں سریانی عیسائیوں سے کام لیا جائے۔ ان سریانیوں
نے مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم دی پھر سریانی اور یونانی زبانوں سے فلسفہ کو عربی میں منتقل کیا۔

سریانی عیسائیوں سے مسلمانوں نے جو یونانی فلسفہ حاصل کیا وہ خالص یونانی فلسفہ نہیں تھا اس
میں بعد کے آنے والے فلسفیوں نے جو افلاطون کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اپنی تشریحات اضافہ
کر دی تھیں اور اب یہ فلسفہ۔ دین و فلسفہ دونوں کا مرکب تھا سب سے پہلے جس شخص نے یونانی فلسفہ میں
دین کی آمیزش کی وہ فیلون یہودی تھا۔ اس فیلوت یہودی اور کچھ یونانی فلسفیوں نے جن کا یہودی علماء
سے ربط ضبط تھا اپنے فلسفیانہ معتقدات اور دینی معاملات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مختصر یہ کہ دیگر مذاہب کے پیروؤں سے مسلمانوں کے میل جول اور اُن کے درمیان روابط بڑھنے کے نتیجہ میں عقائد اسلامی کے بارے میں نت نئے شکوک پیدا ہوئے اور اسلامی شہروں میں الحاد کی وبا پھیل گئی۔ اسی کی وجہ سے مسلمان مجبور ہوئے کہ سریانی مسیحیوں کے ذریعہ جو عراق و شام میں پھیلے ہوئے تھے یونانی فلسفہ کو حاصل کریں جو فلسفیانہ معتقدات اور دینی قضایا کا مجموعہ تھا جس میں خالق کائنات اور کائنات۔ مخلوقات سے خالق کا علاقہ اور اسی طرح کے دیگر دینی مسائل سے بحث بھی داخل تھی۔

اسی اجنبی اور غیر مانوس افکار و خیالات اور غیر اسلامی نظریات سے بھری ہوئی فضا میں علم کلام کو غیر معمولی فروغ و ترقی ہوئی۔ علمائے اسلام نے عقائد اسلامی کی حمایت اور دشمنان اسلام کو زیر کرنے کے لئے جو اسلامی اصول عقائد کے بارے میں مسلمانوں کو مشکوک بنانے کے درپے تھے علم کلام سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔

مگر مصیبت یہ ہوئی کہ یہ مسلمان متکلمین جن کا مطمح نظر اسلامی عقائد کی حمایت تھی غیروں سے کافی حد تک متاثر ہوگئے اور ان کے سوچنے سمجھنے کا انداز اُن کے افکار و نظریات قرآن و حدیث سے دور جا پڑے اور اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے خیالات و نظریات میں اختلاف کی بہتات ہوگئی۔

اسی علمی فضا میں جو متضاد افکار و نظریات سے بھری ہوئی تھی شیعوں کے ائمہ طاہرین اور ان کے تلامذہ، دشمنان دین کے مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ وہ سفلہ پردازوں سے بحث و مناظرہ بھی کرتے ملحدوں زندیقوں کے نظریات کی دھجیاں بھی اڑاتے اور اُن اسلامی فرقوں سے بھی بحث و مباحثہ کرتے جو اپنے افکار و خیالات میں صحیح اسلامی مسلک اور قرآن و حدیث کے مقررہ اصول سے دور جا پڑے تھے۔

ہم انشاء اللہ آگے چل کر عقائد میں اسلامی فرقوں کے نظریات کا تذکرہ کریں گے اور یہ بھی بتائیں گے کہ وہ اجنبی اور غیر مانوس افکار اور یونانی فلسفہ سے کس حد تک متاثر تھے اور باوجودیکہ بہت سے شیعہ بھی علم کلام میں انتہائی بلند و بالا درجہ پر فائز ہوئے انھوں نے بھی سریانی عیسائیوں سے افلاطون کا جدید فلسفہ حاصل کیا، اور وہ بھی اسی علمی ہنگاموں کے دوران جی رہے تھے مگر ان سب کے باوجود وہ اپنے افکار و نظریات میں اسلامی معتقدات اور قرآن و تعلیمات نبوی کے راستہ سے ذرہ برابر منحرف نہیں ہوئے۔

پہلی فصل

اسلام کے اولین فرقے۔ اُن کے وجود میں آنے کے اسباب شیعیت کی تاریخ اور اس کے معنی

اس تمہید کے بعد اور اصل موضوع کو شروع کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسلامی فرقوں کی تاریخ بیان کردی جائے شروع زمانہ اسلام میں جن کا ظہور ہوا یعنی وہ زمانہ جب کہ مسلمان شیعہ اور غیر شیعہ میں منقسم ہوئے انھیں دونوں فرقوں سے بہت سی شاخیں

میں اور علی و فاطمہ و حسن و حسین اور ابن سعد اور ابن ابی حاتم اور طبرانی اور ابن مردویہ نے امام حسن سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا نحن اھل بیت الذی قال اللہ تعالیٰ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا یعنی ہم وہ اہل بیت ہیں جن کی شان میں خدائے تعالیٰ نے آیہ تطہیر نازل فرمایا ہے۔ کذا فی الدر المنثور۔ اور شیخ عبدالحق دہلوی نے **جذب القلوب** الی دیار المحبوب میں ذکر اسطوانات میں لکھا ہے ودر فاطمۃ الزہراء دریجا بود وسرور انبیاء در وقت برآمدن از حجرۂ شریفہ خود می استاد وبعلی وفاطمہ وحسن وحسین دریجا خطاب می کرد و می گفت السلام علیکم اھل البیت انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ مثل اس کے **در منثور** میں بروایت ابن ابی واحمد حنبل و ابن جریر طبری و ابن منذر و طبرانی و حاکم و ابن مردویہ انس بن مالک وابو الحمرا اور ابن عباس سے مروی ہے۔ اور طبرانی نے ابو الحمرا سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت کی صحبت میں نو مہینے رہا جب صبح ہوتی آپ جناب سیدہ کے دروازے پر تشریف لاتے اور فرماتے۔ اے اہل بیت تم پر خدا رحمت کرے پھر آیہ تطہیر کو تلاوت فرماتے اور ابن جریر اور ابن مردویہ کی روایتوں میں آٹھ مہینے مذکور ہیں اور سیوطی نے درمنثور میں ابن عباس سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ہر روز اور ہر نماز کے وقت امیر المومنین کے دروازے پر تشریف فرما ہو کر ارشاد کرتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اھل البیت انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔

ایضاً جواہر العقدین میں مرقوم ہے کہ احمد حنبل نے مناقب میں اور ابن جریر وطبرانی نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ یہ آیت پانچ بزرگواروں کی شان میں نازل ہوئی ہے نبی و علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام ینابیع المودۃ۔ باب (۳۳)

اسلامی فرقوں کو پھوٹیں یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ۷۳ تک اُن کی تعداد پہونچا دی ہے محدثین نے پیغمبر خدا سے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی روایت کی ہے کہ ستفترق امتی من بعدی الی ثلاث و سبعین فرقۃ کما افترقت امۃ موسی و عیسی علیہم السلام۔ عنقریب میرے بعد میری اُمت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جس طرح موسیٰ و عیسیٰ کی اُمتیں بٹ گئی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا کہ مسلمانوں کی پہلی تقسیم یعنی شیعہ اور غیر شیعہ میں اُن کے بٹ جانے ہی کے نتیجہ میں بقیہ ساری تقسیمیں بعد کے زمانوں میں ہوئیں۔ سارے اسلامی فرق و مذاہب انھیں دونوں کی طرف راجع ہیں ہم عنقریب بعض فرقوں کا ذکر کریں گے ایک تو اس لئے کہ وہ ہماری کتاب کے موضوع سے بھی تعلق رکھتے ہیں دوسرے اس لئے کہ اُن میں کئی ایک کو تشیع سے علاقہ بھی ہے۔

اہل سنت کے اکثر ارباب قلم نیز مستشرقین یورپ اس بات کے مدعی ہیں کہ تشیع کی تاریخ پیغمبر کی وفات کے بعد شروع ہوئی، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اموی عہد حکومت کے ابتدائی دنوں میں اس کا آغاز ہوا۔ بنی امیہ کے جور و ظلم اور اولاد و انصار علی پر ان کے جبر و تشدد کے نتیجے میں یہ مذہب پیدا ہوا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں اس مذہب کا آغاز حضرت عثمان کے عہد حکومت میں ہو چکا تھا جب کہ مسلمانوں نے حضرت عثمان اور اُن کے طرفداروں پر نکتہ چینی، اُن کی بدانتظامی اور من مانے، تصرفات پر اعتراضات شروع کر دیے۔

فرانسیسی مستشرق غود فروا کا قول ہے کہ خوارج اور شیعہ کی تشکیل اس پھوٹ کے بعد ہوئی جو سیاسی اسباب کے تحت جنگ صفین کے بعد مسلمانوں میں پڑ گئی تھی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن سبا نے نظریہ تشیع کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہو۔ ہم عنقریب ان دعووں کا بطلان واضح کریں گے۔ ابھی ہم نے ذکر کیا کہ پیغمبر کی رحلت کے بعد ابتدائی دنوں ہی میں مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے تھے ایک فرقہ علی کو خلیفہ بر حق جانتا تھا اور دوسرا وہ جس نے پیغمبر کا جانشین منتخب کرنے میں بڑی تیزی سے کام لیا اور ابوبکر خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ تشیع اس لحاظ سے کہ وہ اہل سنت کے مقابلہ میں ایک فرقہ ہے پیغمبر کی وفات سے پہلے اس کا کوئی وجود نہ تھا، آنحضرت کی زندگی میں تو سبھی مسلمان تھے شیعہ سنی کی کوئی تفریق ہی نہ تھی لیکن وہ بنیادی عقیدہ جس پر تشیع کی عمارت قائم ہوئی یعنی پیغمبر کا اپنے بعد کے لئے اپنے قائم مقام کی صراحت، یہ اسلام کے عالم وجود میں آنے کے بعد ہی منظر عام پر آ چکا تھا۔ پیغمبر کے مکہ سے ہجرت کرنے سے آٹھ برس پہلے جب کہ پیغمبر نے واقعہ انذار کے موقع پر علی کی وصایت کا اعلان فرمایا تھا ایک نہیں بیسوں روایتیں شاہد ہیں کہ پیغمبر خدا نے ضیافت کا سامان کر کے اپنے عزیزوں قریبی رشتہ داروں کو اکٹھا کیا جنکی تعداد ۳۰ کے قریب تھی اور آپ نے اُنھیں ایمان لانے کی دعوت دی اور اُن سے پشت پناہی کی استدعا کی تھی

سلسلہ تقریر میں آپ نے فرمایا تھا۔

"تم میں کون شخص اس کام میں میرا بوجھ بٹانے پر تیار ہے تاکہ وہی میرا وارث ہو میرا وصی ہو وہ میرے دیون کو ادا کرے اور میرے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرے اور تم میں میرا جانشین ہو"

پیغمبر خدا نے اس فقرہ کو ۳ یا ۴ مرتبہ کہا لیکن علی کے علاوہ کوئی دوسرا آگے نہیں بڑھا جیسا کہ امام احمد نے مسند میں اور ثعالبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ ثعالبی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ پیغمبر خدا نے یہ فقرہ ۳ مرتبہ کہا اور ہر مرتبہ آپ کی قوم والے خاموش رہے سوا علی کے۔

یہ پہلا موقع تھا جب کہ پیغمبر خدا نے شیعیت کی تخم ریزی کی اور تخم ریزی کرنے کے بعد جب تک زندہ رہے برابر اس کی نگرانی۔ اپنے اقوال و افعال سے اس کی آبیاری کرتے رہے یہاں تک کہ یہ درخت بار آور ہوا اور اس کی جڑیں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کے دلوں میں گہری ہوتی چلی گئیں۔ یہ مسلمان پیغمبر کے زمانہ ہی میں علی کی پیروی ان کی محبت اور ان کے تشیع کے ساتھ مشہور تھے۔

زندگی کے آخری سال جب کہ آنحضرتؐ حج آخر سے فراغت کر کے مدینہ واپس جارہے تھے۔ ساتھ میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار مسلمانوں کا مجمع تھا تو قبل اس کے کہ یہ لوگ اپنے اپنے شہروں کو رخصت ہوں۔ غدیر خم پر پہونچ کر آنحضرت نے ضروری سمجھا کہ ایک مرتبہ پھر علی کی وصایت و جانشینی کا اعلان کر دیں اور ان کا صاف صاف نام لے کر ان کے اوصاف بیان کر کے لوگوں کے مجمع میں ان کو بلند کر کے بتا دیں کہ یہی میرے بعد میرے خلیفہ و جانشین ہوں گے۔ آیت یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ و اللہ یعصمک من الناس نے نازل ہو کر پیغمبر کے قدم روک لئے تھے کہ بغیر اس حکم کو مسلمانوں تک پہونچائے آپ آگے نہ بڑھئے گا۔

پیغمبر نے ان تمام مسلمانوں کو جو اسلامی ممالک کے ہر ہر گوشہ سے حج کرنے کے لئے آئے تھے ایک جگہ اکٹھا کیا جو آگے بڑھ چکے تھے انھیں واپس بلایا جو ابھی نہیں پہونچے تھے ان کا انتظار کیا۔ آپ کے اصحاب نے آپ کے لئے منبر تیار کر دیا۔ پیغمبر نے علی کو بلایا ان کا ہاتھ پکڑ کر اونچا کیا اور ان لفظوں میں ان کی خلافت وصایت کا اعلان فرمایا جو حدیث کی سبھی کتابوں میں ایک دو نہیں بیسیوں اسناد سے مروی ہیں۔ پیغمبر خدا نے تمام مسلمانوں سے یہ اقرار لینے کے بعد کہ آپ ان کی جانوں کے مالک و مختار ہیں فرمایا من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ جس جس کا میں مولا ہوں یہ علی اس کے مولا ہیں۔ آنحضرت نے علی کے لئے بھی وہی ولایت قرار دی جو خدا نے پیغمبر کو عنایت فرمائی تھی اور خود مسلمانوں نے جس کا اقرار و اعتراف کیا تھا۔

اسی مضمون کی بیشمار حدیثیں ہیں جسے شیعہ اور سنی دونوں کے ثقہ اور معتبر افراد نے بیان کیا ہے۔ اور سبھی حدیثیں اسی مفہوم و معنی کی تائید کرتی ہیں جو شیعہ حدیث غدیر سے سمجھتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ حدیث غدیر میں جانشین مقرر کرنے کا کوئی ذکر نہیں لیکن جس کیفیت سے پیغمبر نے یہ حدیث بیان کی جتنا اہتمام کیا اور بقیہ اہل بیت کے مقابلہ میں علی کو مخصوص اہمیت بخشی یہ تمام باتیں بتاتی ہیں کہ شیعوں نے الفاظ حدیث کے جو معنی سمجھے ہیں وہی صحیح اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہی اصل نتیجہ ہے۔ بعض تاریخی نصوص شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے پیغمبر کی اس تقریر کو سننے کے بعد یہی یقین کیا کہ پیغمبر خدا نے علی کی خلافت و جانشینی کا اعلان فرمایا ہے۔

پیغمبرؐ کی انھیں تصریحات سے جو آپ نے ہر مناسب موقع و محل پر فرمائے۔ آپ کی اسی واضح تقریر سے جو آپ نے غدیر خم میں فرمائی نیز اسی خصوصی تقرب و منزلت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو علی کو پیغمبر سے حاصل تھی پیغمبر کی وفات کے بعد مسلمانوں کی رائے عامہ کا رجحان علی ہی کی طرف تھا اور یہ جو پیغمبر کی خبر مرگ عام ہوتے ہی مہاجرین و انصار میں چھینا جھپٹی ہوئی وہ صرف اکثریت کا سدّ باب کرنے کے لئے جو علی کے مقابلہ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ مہاجرین و انصار کی اس چھینا جھپٹی ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش نے جمہور کو بدحواس سا کر دیا اُن کی عقلیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھیں۔ پیغمبر کی میت ابھی تک گھر میں پڑی ہوئی تھی۔ علی و بنی ہاشم اور اکابر صحابہ ہر چیز سے بے پروا پیغمبر کی تجہیز و تکفین اور انھیں سپرد لحد کرنے کے انتظامات میں مصروف تھے ادھر ابو بکر کی بیعت آناً فاناً پلک جھپکتے کر لی گئی نہ اس کا پہلے سے کوئی اعلان کیا گیا نہ اکابر صحابہ میں سے کسی ایک سے مشورہ کیا گیا جن کو معمولی معمولی باتوں میں بھی نظر انداز کرنا جائز نہ تھا چہ جائیکہ خلیفہ مقرر کرنے میں جس میں تمام صفات و کمالات کا مکمل طور پر ہونا واجب و لازم ہے کیونکہ خلیفہ پیغمبر کا نمائندہ قرآن کا محافظ اور احکام الٰہی کو ٹھیک اسی طرح نفاذ میں لانے والا ہوتا ہے جس طرح خدا نے اپنی کتاب میں اپنے پیغمبر پر نازل فرمایا وہ پورے خلوص اور انتہائی بے لوثی سے اُمت کی فلاح و بہبود کا نگراں ہوتا ہے۔ اس جلد بازی سے کام لے کر اس طرح چھینا جھپٹی کر کے ابو بکر کی بیعت ہوئی کہ نہ لوگوں کی رائیں معلوم کی گئیں نہ عام جلسہ ہوا جس میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ شریک ہوتے۔

اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ پیغمبر خدا خلافت کے مسئلہ کو مسلمانوں پر چھوڑ گئے تھے تب بھی اتنا توقف تو ضروری ہی تھا کہ پیغمبر کے دفن و کفن سے فراغت ہو جاتی لیکن ان لوگوں نے علی و بنی ہاشم کو پیغمبر کے صدمہ میں نڈھال پا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی انھیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں علی و بنی ہاشم اور پیغمبر کے اجلہ اصحاب یہاں نہ آدھمکیں اور اس بات کا احساس بھی کہ ہمارا یہ انتخاب صحیح ڈیموکریسی کی بنیادوں پر قائم نہیں۔ اسی لئے حضرت عمر اپنے زمانہ خلافت میں کہا کرتے کانت بیعۃ ابی بکر فلتۃ وقی اللہ المسلمین شرھا ابو بکر کی بیعت چھینا جھپٹی کی بیعت تھی جس کے شر سے اللہ نے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔

اور باوجودیکہ یہ خلافت انتہائی اچانک اور ناگہانی صورت سے طے کی گئی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ تخویف و تہدید بہکانے اور گمراہ کرنے کی بھی ممکن تدبیروں سے کام لیا گیا۔ کہاں تو حضرت عمر پیغمبر کے

رحلت فرمانے پر چیخ چیخ کر یہ اعلان کرتے دیکھے گئے کہ پیغمبرؐ مرے نہیں وہ اسی طرح دوبارہ واپس آئینگے جس طرح جناب موسیٰ چالیس روز غائب رہ کر اپنی قوم والوں میں واپس آ گئے تھے۔ پیغمبرؐ آتے ہی لوگوں کے ہاتھ پیر قطع کر ڈالیں گے۔ اور کہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ وہ مسلمانوں کو ہنکا ہنکا کر سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف لے جا رہے ہیں تاکہ ابوبکر کی بیعت کریں۔ اس کے بارے میں استاذ علی عبدالرازق اپنی کتاب الخلافتہ واصول الحکم میں لکھتے ہیں۔

واذا رایت کیف تمت البیعۃ لابی بکر تبین لک انها کانت بیعة سیاسیة ملکیة علیها کل طوابع الدولة الجدیدہ المحدثہ وانها قامت کما تقوم الحکومات الجدیدہ علی اساس القوۃ والسیف۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کس طرح ابوبکر کی بیعت پایۂ تکمیل کو پہونچی یہ حقیقت تم پر واضح ہو گئی ہو گی کہ یہ بیعت تمامتر سیاسی اور بادشاہی بیعت تھی اس پر نئی اور جدید حکومت کی پوری پوری چھاپ تھی اور جس طرح نئی حکومتیں قوۃ اور تلوار کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اسی طرح یہ حکومت بھی قائم ہوئی۔

بہرحال ابوبکر کی بیعت ہوئی کچھ لوگوں نے اُن کی بیعت کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا اور کچھ لوگوں نے جن میں بنی ہاشم بھی تھے اور بہت سے اکابر صحابہ بھی اُن کی بیعت سے گریز کیا جیسے سلمان فارسی، عمار یاسر، زبیر بن العوام، خزیمہ بن ثابت، حذیفہ بن یمان وغیرہ۔ ان لوگوں نے اس وقت تک توقف ضروری سمجھا جبتک علیؑ کا موقف واضح نہ ہو جائے جو شرعی حقدار تھے۔ جب علیؑ پیغمبرؐ کے دفن و کفن سے فارغ ہوئے تو آپ نے اس نئے حاکم کے اقتدار کے آگے سر نہیں خم کیا نہ اُن کے طرفداروں کا انبوہ انھیں ذرّہ برابر ہراساں کر سکا۔ آپ نے علی الاعلان اس اندھیر گردی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، غصب خلافت کرنے والوں کے ظلم و زیادتی کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی اور ہر ممکن جبر و تشدد بھی آپ کو ابوبکر کی بیعت کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ اور باوجودیکہ غصب خلافت کرنے والوں نے آپ کا اور آپ کے رفیقہ حیات کا کلیجہ خون کر دیا تھا وہ صدمے پہونچائے تھے جن کی جانکاہی کبھی جانے والی نہ تھی پھر بہت سے صحابہ کرام آپ کے لئے مرنے مارنے پر بھی تیار تھے لیکن ان سب کے باوجود آپ نے یہ محسوس کر کے کہ اگر میں اُن سے کٹ کر رہ جاتا ہوں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں تو اس کا تمامتر فائدہ دشمنان اسلام کو پہنچے گا پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد ہی ارتداد کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ ابوبکر کی ناگہانی بیعت نے بھی بہت سے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اسلامی شہروں اور آبادیوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی اور قریب تھا بہت سے علاقے قابو سے باہر ہو جائیں، بہت سے بدّو عرب اور شہروں کے باشندے ایسے تھے جو اسلام کے دبدبہ و اقتدار کو دیکھ کر اطاعت گزار ہوئے تھے اور وہ فتنہ ارتداد کو بہت سے صحرائی قبائل میں ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ نے ان سب باتوں کو دیکھ کر خود مصالحت کی راہ نکالی اور اُمت کے

امن و امان، ملت کی حفاظت، دین کو عزیز، انجام کو آغاز سے بہتر سمجھتے ہوئے اور شرعاً و عقلاً اس وقت جو فریضہ عائد ہوتا تھا کہ جو زیادہ اہمیت کا حامل ہو اسے مقدم رکھا جائے آپ نے حکام وقت سے صلح کر لی کیونکہ اس وقت کے حالات قطعی اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آپ ان لوگوں سے بالکل قطع تعلق کر کے بیٹھ رہیں اور باوجودیکہ اسلامی مصالح اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی فکروں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ اپنے موجودہ حالات سے سمجھوتہ کر لیں، اپنا حق لٹتے دیکھیں اور کوئی عملی قدم نہ اٹھائیں پھر بھی آپ اپنی زندگی بھر اور آپ ہی نہیں وہ صحابہ کرام بھی جو آپ کے حق دار ہونے پر ایمان رکھتے تھے، لوگوں کے ذہنوں کو برابر جھنجھوڑتے اور انھیں پیغمبرؐ کے وہ صریحی ارشادات یاد دلاتے رہے جو آپ نے علیؑ کی جانشینی و خلافت کے متعلق فرمائے تھے۔ محدثین و رواۃ بھی ان ارشادات پیغمبرؐ کو نسلاً بعد نسل روایت کرتے آئے اور سُنی و شیعہ دونوں ہی فرقہ کے ارباب قلم شروع زمانہ ہی سے جب سے کہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا ان حدیثوں کو اپنی کتابوں میں درج کرتے آئے۔ شیعہ علماء و محدثین انھیں متواتر روایات سے اپنے عقیدہ امامت پر برابر استدلال کرتے رہے سید ہاشم بحرانی اپنی کتاب غایہ المرام میں لکھتے ہیں۔

حدیث غدیر کو اہل سنت حضرات نے ۸۰ اطریقوں سے روایت کیا ہے۔

اسی طرح دیگر نصوص بھی جن سے شیعہ علیؑ کی امامت اور جانشینی پیغمبرؐ پر استدلال کرتے ہیں۔ شیعوں نے مسئلہ امامت پر سیکڑوں ہی کتابیں لکھی ہیں جس میں کتاب و سنت کے تمام نصوص انتہائی وضاحت سے پیش کئے ہیں اور ان تمام بہتان و اتہامات کی دھجیاں اڑائی ہیں جو جعل سازوں نے مسئلہ امامت اور اس سے متعلق نصوص کے متعلق گڑھے ہیں۔ آقائی عبد الحسین امینی مرحوم نے تو گیارہ ضخیم جلدیں امامت اور اس کے نصوص کے متعلق الغدیر کے نام سے لکھی ہیں۔

مختصر یہ کہ تشیع جو اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے فقہاء و متکلمین و محدثین کے نزدیک کافی مشہور ہے اور جو باقی اسلامی فرقوں کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے ان نصوص کے نتیجہ میں جنھیں محدثین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور جن پر صحابہ کرام کی خاص جماعت پیغمبرؐ خدا کی رحلت کے بعد ثابت قدم رہی، پیغمبرؐ کی زندگی ہی میں ظہور میں آچکا تھا۔ اگر حضرت امیر المومنینؑ کو ان مصائب و آفات کا خیال نہ ہوتا جو پیغمبرؐ خدا کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام پر ٹوٹ پڑے تو اسلام کی تاریخ کسی اور طرح لکھی گئی ہوتی اور ایسے واقعات رونما ہوتے، پیغمبر خدا آپ کے دست و بازو علی ابن ابی طالبؑ اور مخلص صحابہ کرام کی جانفشانیاں اس طرح خاک میں ملتیں جن کا ہم صحیح طور پر تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر علیؑ نے اپنے حقوق کی پامالی اپنے کلیجہ کا خون ہونا گوارا کیا مگر اسلام پر آنچ آنے نہیں دی۔

اور اگرچہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد پیش آنے والے حادثات اور فتنہ و فساد کی گرم بازاری نے علی پر واجب کر دیا تھا کہ وہ درگزر سے کام لیں مگر اس کی وجہ سے یہ ضروری نہ تھا کہ یہ نظریہ بھی ختم ہو جاتا کہ پیغمبرؐ خدا

علی کو اپنا جانشین مقرر کر گئے ہیں اور ان کی امامت و وصایت کا صریحی لفظوں میں بارہا اعلان بھی فرما چکے ہیں علیؑ کی خاموشی اور صبر و سکوت کی وجہ سے یہ نظریہ ختم نہیں ہوا نہ اس کے جزم و یقین میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی۔ یہ نظریہ لوگوں کے نفوس اور دلوں میں برابر جڑ پکڑتا گیا اور جوں جوں دن گزرتے گئے علی کے ہمدردوں اور ان کے ارادت مندوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی بہت سے مسلمانوں کے ذہن میں اس زمانہ کی یاد شدت سے تازہ ہوئی جسے گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ یعنی پیغمبرؐ خدا کا زمانہ۔ لوگوں کی نظروں میں وہ مناظر گھومنے لگے کہ کس طرح پیغمبرؐ خدا اٹھتے بیٹھتے ہر موقع و محل پر علیؑ کی جانشینی و امامت کا اعلان فرمایا کرتے۔ تشیع روز بروز ترقی کرتا گیا اور جیسے جیسے اسلام کی اشاعت ہوتی گئی تشیع بھی ساتھ ہی ساتھ پھیلتا گیا اور جن دنوں مسند حکومت آپ کے پیروں تلے آئی اسے اور استحکام نصیب ہوا۔ اب مسلمانوں میں عام طور پر پیغمبرؐ خدا کی ان حدیثوں کا چرچا رہنے لگا جو آپ کی خلافت و جانشینی کے متعلق پیغمبرؐ نے فرمائی تھیں۔ آپ کی سیرۃ و کردار زہد و ورع دور اندیشی اور علم و عمل نے ان حدیثوں کی تصدیق بھی کر دی اور ہر شخص یہ یقین کرنے پر مجبور ہوا کہ بیشک پیغمبر نے ایسا ہی کہا ہوگا اور امت کی قیادت، قرآن کی حفاظت و حمایت و تعلیمات اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے آپ ہی کو خدا و رسولؐ نے منتخب کیا ہے۔

تشیع کی اس مختصر تاریخ کو ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ تشیع دعوت اسلامیہ کا بہت بڑا حصہ رہا۔ پیغمبر خدا نے جہاں خداوند عالم کی وحدانیت اپنی رسالتؐ اور خداوند عالم کے احکام و اوامر کی تبلیغ کی وہاں اس تشیع کی بھی اور تشیع کا جو مفہوم آج اور آج سے پہلے تھا وہی پیغمبرؐ کے زمانہ میں اور پیغمبرؐ خدا کی وفات کے بعد بھی اور جن لوگوں نے اس تشیع کی پیروی کی یہ یقین کرتے ہوئے کہ خداوند عالم کی طرف سے منصوص ہے اس کی کھلے لفظوں میں وضاحت و صراحت کی جا چکی ہے اور پیغمبرؐ خدا نے تشیع کی تبلیغ اپنے جی سے نہیں کی بلکہ جس طرح بہ حکم خداوندی دیگر احکام و فرائض اور اسلامی قوانین کی تبلیغ کی اسی طرح تشیع کی بھی۔

اور یہ جو اکثر اسلامی مورخین اور مستشرقین یورپ دعوی کرتے ہیں کہ تشیع حضرت عثمان کے قتل کے بعد ظاہر ہوا جیسا کہ محمد ابو زہرہ کا خیال ہے یا جنگ صفین کے بعد ہوا جیسا کہ دوسرے لوگ کہتے ہیں یا یہ جو کہا جاتا ہے کہ جب فارس وغیرہ کے موالی اسلام میں داخل ہوئے اور ان کی کثرت ہو گئی تب یہ تشیع ظاہر ہوا یا یہ کہ سب سے پہلے علیؑ کے وصی رسولؐ ہونے کا عقیدہ عبد اللہ بن سبا نے ایجاد کیا نیز اسی طرح کے دیگر اقوال جو اسلامی اور غیر مسلم مورخین بار بار دہراتے ہیں ان سب کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ان کی تردید کتب احادیث سے بھی ہوتی ہے اور تاریخ کی کتابوں سے بھی۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہو کہ استاذ بیر نصر کے ایک فقرہ پر تبصرہ کرتے چلیں جو لبنان یونیورسٹی میں اسلامی فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ یہ اپنی کتاب اہم الفرق الاسلامیہ (اسلامی فرقوں میں سب سے اہم فرقے) میں شیعوں کے عقیدہ خلافت

کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ نظریہ جو امامت کو الوہی حق قرار دیتا ہے نہ تو خالص عربوں کے افکار میں داخل ہے نہ جزیرہ نمائے عرب کے رہنے والے باشندوں کے افکار میں کیونکہ ان کی رگ رگ میں تو مساوات کی روح جاری وساری تھی۔ یہ نظریہ اہل فارس والوں کی طرف سے اسلام میں داخل ہوا جو اپنے بادشاہوں کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے اور انھیں دیگر افراد بشر سے بلند وبالا سمجھتے تھے ہم جو عراق کے شیعوں میں خصوصیت کے ساتھ نجف وکربلا اور کاظمین کے علمی حلقوں میں فارسی زبان کا فروغ دیکھتے ہیں وہ اسی وجہ سے۔"

بٹرنصر کے الفاظ دوسرے بہت سے مستشرقین نے بھی دہرا دیئے ہیں مگر کسی نے بھی نہ تو حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت سمجھی نہ اسلامی تاریخ میں ان واقعات کا جائزہ لیا جو بلاد فارس کی فتح سے پہلے پیش آئے تھے۔ اگر یہ لوگ حدیث وتاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تو اُنھیں معلوم ہوتا کہ علیؑ کے وصی پیغمبرؐ ہونے کا نظریہ اسی دن سے موجود ہے جس دن سے اسلام کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اور اس نظریہ پر مسلمانوں کی بڑی تعداد پیغمبر خدا کے اُن ارشادات کی وجہ سے ایمان لائی جو آنحضرتؐ وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں فرمایا کرتے اور انھیں ارشادات پیغمبرؐ کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت بعد وفات رسولؐ اُن کی حلقہ بگوش وطرفدار رہی۔ اہل فارس اور عربوں کے میل جول کے بیس برس پہلے اور فرضی ابن سبا کے اسلام لانے کے مدتوں پہلے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر بٹرنصر فلسفہ کے پروفیسر شیعوں کے متعلق ایسی بات لکھتے ہیں جسے واقعیت سے کوئی لگاؤ نہیں نہ تاریخ سے جس کا ثبوت فراہم کرنا ممکن ہے۔ حالانکہ یہ بٹرنصر شیعوں کے ساتھ ایک عرصہ سے ایک ہی شہر میں رہتے آرہے ہیں وہ شہر جہاں شیعہ دیگر اسلامی فرقوں کے ساتھ سکونت پذیر ہیں اور ایک تہائی آبادی سے زیادہ اُن کی تعداد ہے۔ بٹرنصر کے لیے کتنی آسان بات تھی کہ وہ علماء شیعہ سے ملتے ان کی کتابوں سے سارے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں وہ ان کتابوں کا مطالعہ کرتے اگر وہ ایسا کئے ہوتے تو کبھی اُن سے ایسی شرمناک غلطی نہ ہوتی۔ لیکن اُنھوں نے دوسروں کی آنکھ بند کرکے تقلید کی اور دشمنان تشیع کی لفظیں اُنھوں نے بھی دُہرادیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اُنھوں نے عراقی شہروں خصوصاً کربلا ونجف وکاظمین میں فارسی زبان کے مروج ہونے کو اپنے اس دعوے کی دلیل قرار دیا ہے کہ شیعوں کا نظریہ امامت ایرانیوں کی دین ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس ریسرچ کی داد نہیں دی جاسکتی۔ یہ بات تو آج تک کسی اور کو سوجھی بھی نہ ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کو کوئی بھی سنجیدہ انسان سن کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عراق کے شہروں کی زیادہ تر آبادی عربوں پر مشتمل ہے اور عربی وہاں کی مروج زبان ہے ہر شہر وہر دیہات اور ہر طبقہ کے لوگ عربی ہی بولتے ہیں۔ دوسری کسی زبان کا وہاں چلن ہی نہیں، رہ گئے

کربلا ونجف اور کاظمین تو ان شہروں میں فارسی مروج ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان شہروں میں مختلف ممالک سے شیعوں کی آمد ہوئی کوئی زیارت کے لیے آیا اور یہیں کا ہو رہا اور کوئی تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔ یہ لوگ خصوصی حالات میں اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں لیکن عام حالات میں یا درس و تدریس کے موقع پر عربی زبان ہی کا رواج ہے کسی اور زبان کا نہیں۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر صاحب نے نظریہ تشیع کی نسبت فارس کی طرف دی تھی اور ان تمام اسلامی تاریخوں کو نظر انداز کر دیا تھا جو صراحتاً بتاتی ہیں کہ تشیع کا جنم بلاد عرب اور خود عرب لوں میں ہوا ایران والوں سے میل ملت کے ۲۰ برس پہلے تو انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ بات لکھ ماری کہ عراقی شہروں میں فارسی زبان مروج ہے۔ ایک غلطی کر کے پھر دوسری غلطی کی۔ انکی کتاب (اسلام کے اہم فرقے) بیشمار غلطیوں کا مجموعہ ہے جن کی طرف ہم مناسب موقع ومحل پر اشارہ کرتے چلیں گے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت اسلامیہ کی گتھی پہلی گتھی تھی جو مسلمانوں کو پیش آئی اسی کی وجہ سے مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے ایک فرقہ علیؑ کا حلقہ بگوش ہوا ان نصوص پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں، دوسرے فرقہ کا خیال یہ تھا کہ پیغمبرؐ خدا بغیر کوئی انتظام کئے دنیا سے اٹھ گئے۔ انھوں نے خلیفہ کے انتخاب کا حق مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا کہ وہ جس کو بہتر سمجھیں خلیفہ منتخب کر لیں۔ مسلمانوں نے ابوبکر کو منتخب کیا اور وہ مرتے وقت عمر کو نامزد کر گئے اور عمر کے بعد یہ خلافت عثمان تک پہونچی جبکہ علیؑ نے ان شرائط کو نامنظور کر دیا جو ان کے سامنے عبد الرحمان بن عوف نے رکھی تھیں انھوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ جن مسائل میں قرآن وحدیث کا کوئی صریحی حکم نہیں معلوم ہوگا میں بجائے سیرۃ شیخین پر عمل کرنے کے اپنے اجتہاد سے کام لوں گا۔ عثمان نے بڑی کشادہ دلی اور ولولہ وشوق سے عبد الرحمان کی شرائط قبول کر لیں اور وعدہ کر لیا کہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مقابلہ میں سیرۃ شیخین ہی کو ترجیح دیا کروں گا۔ انھیں دونوں فرقوں سے دوسرے بہت سے اسلامی فرقے وجود میں آئے اور مسلمانوں میں ۱۳ سو برس سے نزاع قائم ہے۔ صدر اول کے بعد ان دونوں فرقوں کا اختلاف پوری طرح سیاسی اختلاف بن گیا سیکڑوں ہی بار معرکہ آرائیاں ہوئیں ہزاروں لاکھوں کی جانیں گئیں اور خون کی ندی نالے بہہ نکلے۔ خلافت کی بحث نے نت نئے انداز بدلے اور نزاع و تکرار نے مختلف شکلیں اختیار کیں جن کی بنیاد منطق وعلم کلام پر قائم تھی۔ پھر امامت کے متعلق یہ اختلافات اپنی پہلی سادگی پر بھی باقی نہ رہے بلکہ ان اختلافات نے علمی صورت اختیار کر لی۔ نزاع کی بنیاد تو یہی رہی جو رحلت پیغمبرؐ کے پہلے دن تھی یعنی علیؑ خلیفہ برحق ہیں یا ابوبکر، مگر رفتہ رفتہ اس انتہا کو پہونچی کہ امامت خدا و رسول کی نص پر مبنی ہے یا مسلمانوں کے اختیار پر قائم ہے۔ خلیفہ اللہ کی مدد سے اقتدار حاصل کرتا ہے یا مومنین کی مدد سے۔ اسی طرح اور دیگر گوشے جو متکلمین کے بحث ومباحثہ اور مناظروں میں پیدا ہوتے گئے۔

دوسری فصل

خوارج

(وہ اسباب جو خوارج کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے۔ خوارج کی شاخیں ان کے نظریات و عقائد۔ بنی امیہ و بنی عباس کے خلاف ان کی بغاوتیں اور ان بغاوتوں کے اثرات)

گزشتہ فصل میں ہم نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر کی وفات کے فوراً ہی بعد خلافت اسلامیہ کے بارے میں مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے۔ علی و بنی ہاشم اور ان کے حلقہ بگوش مسلمانوں کے مخالفین نے ابو بکر کی بیعت کر کے انھیں خلیفۂ رسول تسلیم کر لیا۔ کئی مہینہ کی نزاع اور کشیدگی کے بعد علیؑ نے اسلام کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے صلح و مصالحت کو ترجیح دی تاکہ جن سخت و شدید خطرات نے اسلام کا احاطہ کر رکھا تھا اُن سے اسلام کو کوئی گزند نہ پہونچنے پائے آپ نے اپنے شرعی حق کو محفوظ رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ کسی عملی اقدام سے پرہیز کیا بلکہ ہر مشکل وقت میں اُن سے پورا پورا تعاون بھی کیا۔ ایک عرصہ تک یوں ہی چلتا رہا اور مسلمان دو فرقوں میں بٹے رہے مگر اُن میں مسلح جدوجہد نہیں ہوئی کسی نے کسی کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی مگر حضرت عثمان کے عہد میں یہ نوبت بھی آگئی جس نے اُن کی حکومت کا تختہ ہی اُلٹ دیا۔ حضرت عثمان نے اپنے رشتہ داروں کی محبت و پاسداری کی انتہا کر دی تھی اور اپنے خاندان کے جاہل اور نوخیز نوجوانوں کو مملکت اسلامیہ کے تمام کلیدی عہدے سونپ کر اُن کو مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کر دیا تھا جسکی وجہ سے مدینہ کے بھی سارے مسلمان ان سے برہم و ناراض ہوئے اور مدینہ کے باہر کے بھی۔ حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر نے ان لوگوں کی پوری پوری مدد کی جو مملکت اسلامیہ کے گوشے گوشے سے حضرت عثمان کے پاس بصورت وفد آئے تھے اُن مظالم و شدائد کی شکایت کرنے جن کا مسلمانوں کو ان کے عُمّال و ولاۃ کی طرف سے سامنا تھا اور یہ فریاد کرنے کہ شعائر دینی اور مقدسات اسلامیہ خاک میں ملائی جارہی ہیں اور جس اسلامی آداب و دستور کے وہ پیغمبرؐ خدا کے زمانہ سے عادی چلے آرہے تھے ان کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے علیؑ ان ہنگاموں سے قطعی بے تعلق رہے انھوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ تاریخی حقائق شاہد ہیں کہ انھوں نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ انقلابیوں اور خلیفہ وقت میں صلح مصالحت ہو جائے لیکن عثمان کے حاشیہ برداروں نے ان کی کوششیں چلنے نہیں دیں وہ عثمان اور انقلابیوں کے درمیان دیوار بنتے رہے۔ دوسری طرف عائشہ اور طلحہ و زبیر کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ بلوائی انکا قصہ ختم ہی کر کے دم لیں۔

جب تحریک انقلاب عثمان کی ہلاکت اور اُن کے بعد علیؑ کو منتخب کر لئے جانے پر جا کر ختم ہوئی تو

حضرت عائشہ کو سخت صدمہ پہونچا کیونکہ وہ تو یہ یقین کئے بیٹھی تھیں کہ عثمان کا قصّہ ختم ہونے پر اُن کے قریبی رشتہ دار طلحہ خلیفہ ہوں گے۔ پھر انھیں علی سے دیرینہ عناد و عداوت بھی تھی اور یہ عداوت رسولؐ اللہ کے زمانہ ہی سے چلی آرہی تھی۔ انھوں نے طلحہ و زبیر سے مل کر پوری کوشش کی کہ علیؑ کی خلافت کا تختہ پلٹ دیا جائے۔ انھوں نے بہ نفس نفیس فوجوں کی قیادت کی۔ اِدھر معاویہ نے یہ یقین کر کے کہ علی کس طرح ہمیں شام کی حکومت پر باقی نہ رہنے دیں گے، شام والوں کو بھڑکایا اور اُن کو ساتھ لے کر علیؑ کے مقابلہ پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خلیفہ برحق کے خلاف علانیہ بغاوت کر دی جس کے نتیجہ میں صفین کی جنگ پیش آئی۔ قریب تھا کہ علیؑ کو شاندار فتح حاصل ہو اور معاویہ اور ان کے ہمراہیوں کا بالکل ہی قصّہ پاک ہو جائے کہ عمرو عاص نے مکر و فریب سے کام لے کر قرآن نیزوں پر بلند کرا دیئے جس کے نتیجہ میں علیؑ کے ہمراہیوں میں پھوٹ پڑ گئی معاویہ کی جان بچ گئی اور اُن کے لئے آسان ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کے بادشاہ بن بیٹھیں اور اپنی ہوا و ہوس اور خواہشِ نفسانی کے مطابق من مانی حرکتیں کریں۔ جنگ صفین کا خاتمہ تحکیم پر ہوا۔ ایک حَکَم اہل شام کی طرف سے منتخب ہوا۔ دوسرا علیؑ کے فوجوں کی طرف سے۔ یہ تحکیم جو عراق والوں نے زبردستی علیؑ پر مسلّط کر دی تھی ناکامی پر تمام ہوئی اور علیؑ کے ساتھیوں کی ایک جماعت اس تحکیم پر ناراض ہو کر علیؑ سے بغاوت کر بیٹھی علیؑ کو کافر ہو جانے کا الزام لگایا کیونکہ انھوں نے اُن کے خیال کے مطابق دین خدا میں آدمیوں کو حکم بنایا تھا۔ اس فرقہ کی سرکشی و تمرد کے مظاہرے صفین میں تحکیم کی منظوری کے بعد ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ علیؑ کی صفوں سے ایک شخص یزید بن عاصم محاربی نے نکل کر علی کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا ان کا ایک آدمی مار ڈالا۔ پھر معاویہ کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوا اور اُن کا بھی ایک آدمی مار ڈالا۔ اُس نے علیؑ و معاویہ دونوں سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔

تحریک خروج نے اسی وقت سے کوفہ کے کچھ لوگوں کے دلوں میں گھر لیا تھا مگر اس کا اظہار وہ صفین سے واپسی اور حکمین کی کانفرنس کی ناکامی کے بعد ہی کر سکے۔ ان خارجیوں کی تعداد جو علیؑ کا لشکر چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے بارہ ہزار تک جا پہنچی ان لوگوں نے ایک قریہ میں جس کا نام حروراء تھا جا کر قیام کیا ور اسی کی مناسبت سے اُن کا نام حروریہ پڑ گیا ان کی قیادت عبداللہ بن الکواء اور شبث بن ربعی کے ہاتھوں میں تھی ان میں اور علیؑ میں تحکیم سے متعلق کئی مرتبہ بحث مباحثے ہوئے عبداللہ بن الکواء نے تحریک خروج سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے ایک ہزار ساتھیوں کو لے کر علیؑ کے پاس کوفہ چلا آیا باقی لوگ اپنے اسی نظریہ پر برقرار رہے آپس میں بہت کچھ رد و کد ہوئی کہ اپنا مرکز کہاں قرار دیا جائے بعض خارجیوں نے مدائن کی رائے دی، کچھ نے بصرہ چلنے کو کہا اور آخر میں نہروان پر سب کا اتفاق ہو گیا دینوری کا خیال ہے کہ ان لوگوں کی تعداد چار ہزار سواروں پر مشتمل تھی اور اُن کا قائد عبداللہ بن وہب راسبی تھا۔ (اخبار الطوال ص۲۲۳) مگر اسفرائنی کا کہنا ہے کہ آٹھ ہزار کی تعداد تھی (التبصیر فی الدین ص۲۶)

یہ لوگ نہروان کے راستہ میں تھے کہ پیغمبر کے جلیل القدر صحابی عبداللہ بن خباب بن ارت سے ملاقات ہوئی اُن کے ساتھ اُن کی بیوی بھی تھیں خارجیوں نے عبداللہ سے کہا کہ ہم سے پیغمبرؐ کی کوئی حدیث بیان کیجئے۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ پیغمبرؐ خدا نے ارشاد فرمایا۔ ستکون بعدی فتنة القاعد فیھا خیر من القائم والواقف فیھا۔ خیر من الساعی والماشی خیر من العادی ومن امکنہ ان یکون مقتولا فیھا خیر لہ من ان یکون قاتلاً۔ عنقریب میرے بعد ایک ایسا فتنہ برپا ہوگا جس میں بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا اور ٹھہرا ہوا چلتے ہوئے سے اور چلتا ہوا دوڑتے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا اس فتنہ میں مقتول ہونا قاتل ہونے سے بہتر ہے پھر ان خارجیوں نے پوچھا کہ ابوبکر و عمر کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے ابوبکر و عمر کی تعریف کی۔ اسی طرح عثمان کی بھی ان کے ابتدائی چھ برسوں میں تعریف کی۔ لیکن جب خارجیوں نے پوچھا کہ تحکیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، اُنھوں نے جواب دیا کہ علیؑ تم لوگوں سے زیادہ کتاب و سنہ کے عالم دین کے زیادہ حامی اور زیادہ صاحب بصیرت ہیں خارجیوں نے کہا۔ تم بھی لوگوں کے نام دیکھ کر ان کی پیروی کرتے ہو۔ خوارج انھیں کھینچ کر نہر کے کنارے لے گئے۔ عبداللہ کے گلے میں قرآن مجید لٹک رہا تھا۔ انھوں نے قرآن کا واسطہ دیا خوارج نے کہا۔ یہی قرآن جس کا تم واسطہ دے رہے ہو ہمیں تمھارے قتل کا حکم دے رہا ہے خوارج نے انھیں ذبح کر دیا پھر اُن کی بیوی کو پکڑا جو حمل سے تھیں اُن کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لیا۔ عبداللہ کو قتل کر کے ان خارجیوں نے ایک نصرانی سے ایک کھجور کے درخت کا سودا کرنا چاہا تاکہ اس کی کھجوریں کھا سکیں۔ نصرانی نے کہا۔ میں بغیر قیمت ہی کے تمھیں دیئے دیتا ہوں خوارج نے کہا ہم لیں گے تو قیمت ہی پر لیں گے نصرانی نے کہا۔ مجھے تم پر بڑی حیرت ہوتی ہے ایک طرف تو تم عبداللہ بن خباب کو قتل کرتے ہو دوسری طرف بغیر قیمت ادا کئے کھجوریں لینے پر آمادہ نہیں۔

جب امیر المومنینؑ کو ان کی فساد انگیزیوں کی خبر ملی کہ وہ نہتے آدمیوں پر حملے کرنے لگے ہیں تو آپ چار ہزار سپاہیوں کو لے کر اُن کے مقابلہ پر نکلے جنگ سے پہلے آپ نے اُن سے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے کس سبب سے خروج کیا۔

خوارج نے جواب دیا کہ۔

"ہم نے آپ کے ساتھ بصرہ میں طلحہ و زبیر اور عائشہ سے لڑائی لڑی۔ آپ نے ہمارے لئے ان کا مال و اسباب لوٹنا تو جائز قرار دیا مگر ان کی عورتوں کو لونڈی بنانے کی اجازت نہ دی۔"

آپ نے فرمایا۔

میں نے تمھیں اُن کے اسلحہ اور چوپائے جائز قرار دیئے تھے عوض میں اس مال کے جو انھوں نے بصرہ کے بیت المال سے غصب کیا تھا لیکن ان کی عورتوں اور بچوں نے کوئی قصور نہیں کیا تھا لہذا انکو کسی بھی

سزا دیجاتی پھر جمل والے اپنی بغاوت میں دائرہ اسلام سے نہیں خارج ہوئے تھے کہ ان کے ساتھ کفار و مشرکین کا برتاؤ کیا جاتا اور اگر میں ان کے بال بچوں کو تمہارے لئے جائز بھی کر دیتا تو بتاؤ تم میں سے کون عائشہ کو اپنے حصہ میں لیتا؟

جب امیر المومنینؑ نے ان کی تمام باتوں کے مسکت جوابات دیئے اور ان کی تمام راہیں بند کر دیں تو آخر میں اُنھوں نے پوچھا۔

"آپ میں اور معاویہ میں جب معاہدہ تحکیم کیا جا رہا تھا تو آپ نے اپنے نام کے آگے سے امیر المومنین کی لفظ کیوں مٹا دی!

امیر المومنین نے فرمایا۔

میں نے رسولؐ اللہ کی پیروی کی آپ نے بھی صلح حدیبیہ کے موقع پر رسولؐ اللہ کی لفظ مٹا دی تھی مشرکین کی طرف سے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے سہیل بن عمرو آیا تھا جب معاہدہ میں میں نے محمد رسولؐ اللہ لکھا تو اس نے اعتراض کیا کہ ہم اگر آپ کو رسولؐ اللہ مانتے تو آپ سے جنگ ہی کیوں کرتے پیغمبر نے مجھ سے فرمایا کہ یوں لکھو۔ ھٰذا ما صالح علیہ محمد بن عبد اللہ و سھیل بن عمرو یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو میں ہوا۔ اور پیغمبرؐ نے مجھ سے اسی دن فرمایا تھا کہ علیؑ تم کو بھی ایسے ہی معاملہ سے ایک دن سابقہ پڑے گا۔"

امیر المومنینؑ کی یہ تقریر سُن کر کچھ لوگ پھر آپ کے حلقہ اطاعت میں واپس آگئے مگر چار ہزار اسی طرح سرکشی پر تلے رہے، امیر المومنینؑ نے جنگ کا آغاز کرنے سے پہلے اُن سے پوچھا کہ تم نے بندہ صالح عبد اللہ بن جناب اور ان کی زوجہ کو کیوں مار ڈالا تھا۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا ہم سب نے انھیں مارا ہے اور اگر ہم آپ پر فتحیاب ہوئے تو آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔

امیر المومنینؑ اپنے ہمراہیوں کی طرف متوجہ ہوئے انھیں بتایا کہ ان کے لیے کیا انجام مقدر ہو چکا ہے اور کتنے افراد اُن کے مارے جائیں گے۔ پھر آپ نے اپنے ہمراہیوں کو لے کر اُن پر حملہ کیا جس کے نتیجہ میں صرف ۹ آدمی بچ پائے جنھوں نے میدان سے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور مختلف شہروں میں متفرق ہو گئے دو آدمی سیستان کی طرف بھاگے، دو یمن کی طرف اور باقی عمان۔ انبار اور جزیرہ کی طرف چلے گئے۔ ان مقامات پر پہونچ کر انھوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ اور نشر و اشاعت شروع کی بہت سے لوگ ان کے گرد سمٹ آئے اور آج بھی ان کے پیرو اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں جیسا کہ اسفرائنی نے تبصیر میں صراحت کی ہے۔

بنی امیہ کے عہد حکومت میں ان خوارج نے پھر زور پکڑا کئی مرتبہ انھوں نے حکومت سے ٹکر لی اور ایسے ایسے معرکے پیش آئے جن کی وجہ سے اموی حکام کا خواب و خور حرام ہو گیا وہ انھیں سے اُلجھے رہے

بعض مصنفین اس پر زور دیتے ہیں کہ حضرت علیؑ نہروان وغیرہ کی لڑائیوں میں خوارج کو بالکل ہی نہیں ختم کر سکے بہت سے خوارج نہروان کی لڑائی میں شریک نہیں تھے یہ لوگ کوفہ اور مضافات کوفہ میں پھیلے ہوئے اپنے نظریات و افکار کی ترویج اور لوگوں کو علیؑ کی حکومت کے خلاف برانگیختہ کرنے میں مصروف رہے خصوصیت کے ساتھ جنگ نہروان کی شکست اور ہولناک انجام کے بعد انھوں نے ایک مرتبہ پھر اپنی تحریک میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ نہروان کے مقتولین کی قبروں پر گئے اور وہاں قول و قرار کیا کہ ہم اپنے مقتولین کا ضرور انتقام لیں گے۔ انھوں نے مختلف مقامات پر محاذ قائم کر کے لڑائی چھیڑ دی انبار و مدائن میں بھی اور سواد کوفہ میں بھی۔ خریت بن راشد ان کا ایک لیڈر تین سو ہمراہیوں کے ساتھ عمان پر چڑھ دوڑا وہاں حضرت علیؑ کے گورنر کو قتل کر ڈالا۔ علامہ ابن اثیر اپنی تاریخ کامل میں لکھتے ہیں کہ خریت کے ساتھ اہواز کے کفار چور ڈاکو، موالی، عیسائی اور کچھ عرب بھی ہو گئے انھوں نے سرکاری لگان بند کر دی اور حضرت علیؑ کے عامل کو وہاں سے نکال دیا۔

بعض مستشرقین نے نو مسلموں کے خوارج کی تحریک قبول کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان خوارج نے یہ نعرہ بلند کر رکھا تھا کہ عرب اور موالی تمام حقوق میں برابر ہیں حتیٰ کہ خلیفہ ہونے میں بھی۔

یہ خوارج اگرچہ مختلف مقامات سے سمٹ کر آ گئے تھے انھوں نے کئی مرتبہ اپنے مقتولین کا انتقام لینے کی کوشش کی اور ان کی باغیانہ تحریک موجودہ حکومت کے خلاف روز بروز پھیلتی جا رہی تھی۔ انھوں نے موالی اور بعض عیسائیوں کو بھی یہ لالچ دے کر اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی کہ ہم تم لوگوں سے جزیہ کی وصولی بند کر دیں گے اور غیر عربی شخص بھی مسند خلافت پر بیٹھ سکتا ہے مگر ان سب کے باوجود انھوں نے جہاں بھی سر اٹھایا علی نے انھیں کچل ڈالا انھیں نہروان میں بھی شکست فاش ہوئی اُن کی وہ تمام کوششیں بھی اکارت گئیں جو انھوں نے حکومت پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے کیں جب ہر مرحلہ پر انھیں ذلت اور شرمناک ناکامی ہی کا منھ دیکھنا پڑا تو اب اُنھوں نے طے کیا کہ علی و معاویہ اور عمرو عاص کو دھوکہ سے مار ڈالا جائے اس کے لئے ۳ آدمی مقرر کئے گئے علی کو ناگہانی قتل کرنے میں تو وہ کامیاب ہو گئے مگر معاویہ اور عمرو عاص کو قتل کرنے میں وہ ناکام رہے۔

بہرحال شروع شروع خوارج کے سارے اقدامات خالص سیاسی نظریات پر مبنی تھے اُن کا پہلا نعرہ یہ تھا کہ علی نے تحکیم قبول کر کے غلطی کی پھر اس سے تجاوز کر کے علی کو کافر کہنا شروع کیا۔ عثمان کو کہا کہ وہ اپنی خلافت کے آخری ۶ برسوں میں کافر ہو گئے تھے۔ طلحہ و زبیر اور عائشہ کو بھی انھوں نے کافر قرار دیا مگر لطف یہ ہے کہ کسی خارجی نے بھی ابوبکر و عمر کو کافر نہیں کہا۔

انھوں نے علی کے کافر ہو جانے کی دو وجہیں قرار دیں پہلی وجہ یہ کہ انھوں نے دین خدا میں انسانوں کو حکم بنایا۔

دوسری وجہ یہ کہ اُنھوں نے معاہدہ تحکیم لکھے جانے کے وقت مومنین کی امارت سے اپنے کو الگ کر لیا یعنی امیر المومنین کی لفظ لکھ کر کاٹ دی۔

حضرت عثمان کے کافر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت میں حد سے گذر گئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بدکار ہیں اسلام اور ضروریات اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں انھیں رشتہ داروں کو انھوں نے ہر جگہ کی حکومت دے کر مومنین کی گردنوں پر مسلط کر دیا تھا اور باوجودیکہ خوارج کے خیالات و نظریات میں کافی اختلاف تھا اُن میں بہت سے فرقے ہو گئے اور بہت سے مسائل میں وہ ایک دوسرے کی ضد تھے پھر بھی وہ سب کے سب متفقہ طور پر علی کو، حکمین کو، عثمان کو، طلحہ و زبیر اور عائشہ کو کافر قرار دیتے تھے جس طرح وہ متفقہ طور پر ابو بکر و عمر کی خلافت کو شرعی اور عوام کی خواہش و خیالات کا ترجمان قرار دیتے تھے۔

یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رائے عامہ ہی اُن کے نزدیک اصل چیز تھی اسی رائے عامہ کی بدولت حاکم وقت کو قوت و اقتدار حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے اقدامات شرعی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ ابو بکر و عمر کی خلافت کو اسی لئے شرعی قرار دیتے تھے کہ وہ عوام کی پسند اور رغبت سے ہوئی تھی۔ لیکن ان خوارج نے عوام کی پسند اور رغبت کے ساتھ ساتھ ایک اور شرط کا بھی اضافہ کیا وہ یہ کہ خلیفہ حق و انصاف کے ساتھ حکومت بھی کرے۔ لہٰذا اگر عوام کسی کو متفقہ طور پر حاکم مقرر کر لیں لیکن وہ حاکم حق و عدالت سے منحرف ہو جائے تو اس کو معزول کر دینا اور اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ یہیں سے وہ علی و عثمان کے کافر ہونے کے قائل ہوئے ان دونوں کی خلافت بھی رائے عامہ سے ہوئی تھی مگر بعد میں یہ حق و عدالت سے منحرف ہو گئے۔

انھوں نے ایک تیسری بات کا اور بھی اضافہ کیا وہ یہ کہ خلافت قریش ہی میں منحصر نہیں بلکہ ہر مسلمان خلیفہ ہو سکتا ہے خواہ وہ غلام ہو یا آزاد کسی ملک و سرزمین کا ہو یا کسی بھی قوم و قبیلہ کا انھوں نے پیغمبر خدا کی اُن حدیثوں کو صحیح نہیں تسلیم کیا جن میں پیغمبر نے صراحت فرمائی ہے کہ خلافت قریش ہی میں رہے گی۔ خوارج نے اس قسم کی روایتوں کو قریشیوں کی من گڑھت قرار دیا کہ اس طرح انھوں نے اقتدار کو اپنی خاندانی جاگیر بنانے کی کوشش کی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب میں خوارج نے اتنی آزادی جو رکھی ہے تو ٹھیک ہی رکھی ہے کیونکہ اسلام نے رنگ و نسل میں کوئی تفریق نہیں برتی نہ عربی و غیر عربی میں کوئی امتیاز برتا ہے اسلام میں افضلیت کا دارومدار اعمال پر ہے حبشی غلام اگر اپنے ایمان میں مخلص احکام اسلامی کا پابند ہو تو وہ اس کی نظر میں بڑے سے بڑے شریف قبیلہ کے عرب سے بہتر ہے۔

علمائے اہل سنت نے خوارج کے اس نظریہ کو اس بنیادی عقیدہ کی صریحی مخالفت قرار دی ہے جو خلیفہ کے انتخاب میں عام مسلمانوں کا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ خلیفہ قریش ہی سے ہو سکتا ہے اور اس کی تائید پیغمبر خدا کی ان حدیثوں سے ہوتی ہے جن میں آپ نے خلافت کو قریش میں منحصر قرار دیا ہے۔ مگر لطف

یہ ہے کہ خوارج کے اس نظریہ کی تخم ریزی سب سے پہلے حضرت عمر نے کی تھی وہی اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں بارہا کہا کرتے تھے کہ کاش سالم (خلیفہ کے آزاد کردہ غلام) زندہ ہوتے تو انھیں چھوڑ کر میں کسی اور کو خلیفہ نہیں بناتا یہ فقرہ انھوں نے ایسے وقت میں کہا تھا جب کہ مسلمانوں میں علی ابن ابیطالب جیسے اکابر موجود تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خوارج کے وجود میں آنے سے بیس برس پہلے حضرت عمر نے اس نظریہ کی داغ بیل ڈال دی تھی کہ خلیفہ کے لئے قریشی ہونا کوئی ضروری نہیں۔ حضرت عمر اپنی زندگی میں اس نظریہ کو عملی جامہ پہنا نہیں سکے اس نظریہ نے خوارج کے ہاتھوں عملی جامہ پہنا انھوں نے عبداللہ بن وہب راسبی کو جو ان کے لیڈروں میں سے ایک لیڈر تھا اپنا امیر بنالیا اور اس کے زیر قیادت اپنے اغراض کو بروئے کار لانے کی جد وجہد کی۔

مذکورہ بالا اصولی وشرائط کے علاوہ خوارج نے کچھ اور شرائط بھی اس خلافت کے لئے وضع کئے مثلاً یہ کہ جس شخص کو خلیفہ منتخب کرلیا جائے اس کو خلافت سے دستکش ہونے کا کوئی حق نہیں چاہے جیسے بھی حالات ہوں یہ حق صرف امت والوں کو حاصل ہے خلیفہ کے جادہ حق سے منحرف ہونے یا تغیر وتبدل کرنے کی صورت میں وہی اسے معزول کر سکتے ہیں یا اسکو قتل کر سکتے ہیں۔ اسی عقیدہ کی بنا پر انھوں نے علی کو کافر قرار دیا کیونکہ علی نے عہدنامہ تحکیم لکھتے وقت اپنے کو امارۃ مومنین سے ہٹالیا تھا امیر المومنین نہیں لکھا تھا۔

دوسری بات یہ کہ خلافت کوئی ناگزیر چیز نہیں خلیفہ میں جن شرائط کا ہونا ضروری ہے اگر ان شرائط کا حامل کوئی شخص دستیاب نہ ہو تو بغیر خلیفہ کے بھی کام چل سکتا ہے اس لئے کہ ہر شخص کو دوسرے کی طرف برابر کی احتیاج ہے ہر شخص دوسرے شخص سے وابستہ وپیوستہ ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو کسی کو کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی نہیں کرنے دیگی۔ (العراق فی ظل الحکم الاموی ص۶۳)

خوارج کا نظریہ اور اُن کے اغراض ومقاصد اس وقت زیادہ واضح ہوئے جب اُن کی تحریک کو کچھ مدت گزر گئی۔ شروع شروع ان کے اغراض منظم صورت میں نہ تھے اموی عہد حکومت میں اُن کی تصویر جتنی واضح ہوئی ابتدائی تحریک میں نہ تھی۔ حضرت علی کے خلاف خروج کرنے کے پہلے تاریخ کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

بہت ممکن ہے کہ یہ عقیدہ کہ خلافت قریش ہی میں منحصر ہے جس کے زیادہ تر مسلمان قائل تھے اور جو خلافت کو قریش کا خاندانی حق قرار دیتا تھا بہت سے عربوں کے دلوں میں کھٹکتا رہا ہو اور یہ کھٹک خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھ کر اور بڑھ گئی ہو کہ یہ خلافت بنی امیہ کے چھوکروں اور اُن کے بدکاروں کے ہاتھ میں پہونچ گئی ہے جن کو اہل عرب کی نظروں میں کوئی عزت وتوقیر حاصل نہ تھی۔ مزید براں تحریک خوارج کے بڑے بڑے سرغنہ عرب کے مشہور قبائل سے تعلق رکھتے تھے جن کا ماضی بھی شاندار رہ چکا تھا اور حال بھی اور یہ چیز اُن کو شدت سے ترغیب دلاتی کہ اقتدار پر قبضہ کرلیں اور بنی اُمیہ کے ہاتھوں سے حکومت چھین لیں کم سے کم قریش کے تسلط و اقتدار اور اُن کے تفوق و برتری سے اپنے کو آزاد کرلیں۔

علامہ عبادی اپنی کتاب "صور من التاریخ الاسلامی" میں لکھتے ہیں:۔

* خوارج بنی تمیم و بنی حنیفہ اور بنی ربیعہ کے عرب تھے۔ ان قبائل کو زمانہ جاہلیت میں عرب کے اندر بڑی اہمیت حاصل تھی یہ لوگ اسلام کی ڈیموکریسی اور عدل و مساوات پر فریفتہ ہو کر مسلمان ہوئے غزوات و فتوحات میں خوب خوب داد شجاعت دی۔ عزت و شرافت پہلے ہی خاندانی چیز تھی اُن کی خواہش تھی کہ اس عزت و بزرگی میں اور اضافہ ہو۔ لیکن وہ ناکام رہے جاگیرداری مکہ اور مدینہ میں منحصر ہو کر رہ گئی۔ انہوں نے تحریک ارتداد کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی مگر اسلامی لباس پہنا کر اور اس کی شروعات تحکیم کے موقع پر ہوئیں۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ باوجودیکہ خوارج مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے مگر سبھی فرقے اس بات پر متفق تھے کہ خلافت صرف قریش ہی سے مخصوص نہیں بلکہ یہ اس کا حق ہے جو تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ افضل ہو خواہ وہ کسی قوم و قبیلہ اور رنگ و نسل کا کیوں نہ ہو ان کے اس عقیدہ نے بہت سے یار و انصار اور پیرو فراہم کر دیئے جتنے آزاد کردہ غلام اور عجمی مسلمان تھے سب اُن کے ساتھ ہو گئے اور اموی و عباسی سلاطین سے ٹکر لینے میں سبھی نے اُن کا ساتھ دیا مزید برآں ان خوارج میں زیادہ تر تعداد صحرائی عربوں کی تھی جن کی زندگی فقر و فاقہ میں گزری تھی اور جن کے سوچنے کا انداز سیدھا سادا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بہت کچھ ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا لیکن یہ بدو عرب قبائلی عصبیت سے پاک نہیں ہو پائے تھے۔ کبھی کبھی یہ عصبیت اُن پر غالب آجاتی اور انھیں لاشعوری طور پر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتی تھی وہ اپنی بدوی فطرت کی بنا پر کسی اقتدار و حکومت کے آگے سر جھکانے کے عادی کبھی نہیں ہوئے تھے نہ کسی حکومت کے زیر سایہ اس کے قوانین و قواعد کے پابند ہو کر زندگی بسر کرنے کے خوگر تھے یہی وجہ تھی کہ وہ کسی حاکم کے وجود کو ناگزیر نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لوگوں کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اور یہ چیز ہر شخص کو باہمی الفت و رواداری اور ایک دوسرے کے ساتھ انصاف برتنے پر مجبور کرتی ہے لہذا حاکم کوئی ایسی ضروری چیز نہیں جس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ یہ نظریہ ان کی طبیعت و فطرت کی پیداوار تھا کیونکہ وہ کبھی کسی حاکم کی فرماں برداری کے عادی نہیں رہے خصوصیت کے ساتھ وہ حکومتیں جو اموی عہد میں یکے بعد دیگرے قائم ہوتی رہیں جو اپنے سوا سب کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی تصویر کشی کسی اموی حاکم کے اس فقرہ سے بخوبی ہوتی ہے کہ الاوان السواد بستان لقریش۔ کوفہ و بصرہ کا درمیانی علاقہ قریش والوں کا باغ ہے۔ اس فقرہ سے پتہ چلتا ہے کہ بنی امیہ ہر رنگ و نسل کے تمام باشندوں کو محروم کر کے زمین کی ساری خیر و برکت کے خود ہی مالک رہنا چاہتے تھے اُن کی کوشش تھی کہ فاقہ زدہ عوام اُن کے غلام بنے رہیں۔"

غرضیکہ خوارج کا ظہور کیونکر ہوا کیونکہ انھوں نے شدائد کے مقابلہ میں پامردی دکھلائی کیسے دیسے کار؟

ذمہ دارکاری ضربیں برداشت کیں خصوصیت کے ساتھ اموی عہد حکومت میں اس کے وجوہ واسباب میں قدیم وجدید مصنفین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے بعضوں نے تو وہی اسباب ذکر کئے ہیں جو ہم نے اوپر لکھے بعض کا خیال ہے کہ ان سب کا سبب اُن کا دینی تشدّد اور ان کی مذہبی صلابت تھی جو اسلام کی بنیادی باتوں سے ناواقفیت کے نتیجہ میں اُن کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنے اندازِ فکر پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی سمجھ اور اجتہاد کے مطابق دین کی تفسیر کی انہوں نے بس اپنے ہی کو مسلمان سمجھا دوسروں کو نہیں اور اپنے ہر مخالف سے جہاد کرنا لازم جانا۔

اُن کے سیاسی نظریات کے پہلو بہ پہلو بہت سے دینی نظریات بھی ظہور میں آئے اصول و فروع دونوں ہی سے متعلق لیکن وہ سطحی اور سیدھے سادے تھے جن میں نہ تو کتاب و سنت سے کام لیا گیا تھا نہ صحابہ اور علماء کے نظریات و افکار سے۔ اُن کے نظریات اور فتاوے کا جائزہ لینے پر معلوم ہوگا کہ وہ قرآن وحدیث کے مقرر کردہ تمام اصول سے تجاوز کر گئے تھے اور قانون سازی اور استنباط احکام کے مواقع پر اُن کا وہ اسلوب نہیں رہا جس کی پابندی مسلمانوں نے ضروری سمجھی۔

ہم یہاں اُن کے چند نظریات اور فتاوے ذکر کرتے ہیں جس سے بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

خوارج کے تمام فرقے متفقہ طور پر اس کے قائل ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے اور اس کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں جلے گا اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا سوا نجدہ بن عامر حنفی کے پیروؤں کے۔

نجدہ کا مسلک یہ تھا کہ دین دو باتوں سے عبارت ہے۔ خدا اور رسولؐ کی معرفت خدا کی طرف سے آئی ہوئی جملہ باتوں کا اقرار اور مسلمانوں کے جان و مال کو حرام سمجھنا۔ ان دو کے علاوہ بقیہ چیزوں میں لوگ جہالت کے سبب اس وقت تک معذور ہیں جب تک اُن پر حجت قائم نہ ہو جائے۔

اسی کے ساتھ ان نجدیوں نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ مجتہد مخطی فی الاحکام کے متعلق اگر کوئی شخص عذاب کا اندیشہ کرے تو وہ کافر ہے۔ جو شخص ہجرت میں سستی کرے وہ منافق ہے۔ دار تقیہ میں قیام کرنے والوں کی جان و مال مباح ہے اپنے موافقین کا مال واسباب حرام ہے۔

اسی طرح ان نجدیوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ گناہ کبیرہ یا صغیرہ پر اصرار شرک کا موجب ہے۔ اگر کوئی شخص زنا اور تمام منکرات و کبائر کا مرتکب ہو مگر اس پر اصرار نہ کرے تو وہ اسلام سے خارج نہ ہوگا۔

(مقالات الاسلامیین ابوالحسن اشعری جلد ا ص ۱۶۲)

اس کے برعکس خوارج کے دوسرے فرقہ ازارقہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر گناہ کبیرہ موجب کفر ہے ان کے تمام مخالفین کافر ہیں مشرکین کے بچے بھی اپنے والدین کے ساتھ داخل جہنم ہوں گے۔

(مقالات الاسلامیین جلد ا ص ۱۶۵)

فرقہ عطویہ جو عطیہ ابن اسود حنفی کی طرف نسبت رکھتا ہے اور عبد الکریم بن عجرد کے پیرو [illegible]

شاخ ہے کا عقیدہ ہے کہ نابالغ بچوں سے بے تعلقی واجب ہے۔ جب لڑکا سن بلوغ کو پہونچ جائے تو اسے اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ اگر وہ قبول کرے اور اس کا اقرار دے تو وہ مسلمان ہوگا۔

اسی فرقہ عطویہ کے کچھ لوگ قدر یعنی تفویض کے قائل تھے اور یہ کہ خداوند عالم کو بندوں کے اعمال میں کوئی رائے یا تصرف نہیں حاصل ہے، بندے اپنے افعال کے خود ہی خالق ہیں اور کفر و ایمان تنہا انھیں کی اختیاری چیز ہے۔

دوسرے عجاردہ یعنی عبد الکریم بن عجرد کے دوسرے پیرو اس کے قائل تھے کہ اعمال خدا کے خلق کردہ ہیں بندے کی مشیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

فرقہ عجاردہ اور خوارج کی ایک دوسری شاخ میمونیہ کا مسلک یہ ہے کہ پوتی اور نواسی سے نیز بھائی اور بہن کے نواسیوں سے نکاح جائز ہے۔ اسی طرح ان کا ایک دعوی یہ بھی تھا کہ سورہ یوسف قرآن کا حصہ نہیں۔

خوارج کا ایک اور فرقہ اباضیہ ہے جو بعض باتوں میں دوسرے خوارج سے متفق اور بعض میں مخالف ہے۔ اس فرقہ اباضیہ کی ایک شاخ حفصیہ ہے حفص بن ابی المقدام کے پیرو۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص خدا کا اقرار کرے مگر انبیاؑ و مرسلین جنت و نار کا منکر ہو اور تمام منکرات و کبائر کا ارتکاب کرے تو یہ شخص کافر ہوگا مشرک نہ ہوگا۔ یہی فرقہ حفصیہ والے اس کے قائل تھے کہ علی وہ حیران ہیں جنھیں خداوند عالم نے کلام مجید میں اس طرح ذکر کیا ہے کالذی استھوتہ الشیاطین فی الارض حیران لہ اصحاب یدعونہ الی الھدی۔ تو جن لوگوں نے علیؑ کو ہدایت کی طرف دعوۃ دی وہ اہل نہروان تھے۔

انھیں علیؑ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیاۃ الدنیا اور علیؑ کے قاتل کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔

فرقہ اباضیہ کا ایک شخص یزید بن انیسہ اس کا قائل تھا کہ خداوند عالم عنقریب ایک رسول اہل عجم سے مبعوث کرے گا اور اس پر ایک کتاب بھی نازل کرے گا وہ کتاب آسمان پہ لکھی جائے گی اور ایک ہی مرتبہ نازل ہوگی۔

فرقہ اباضیہ خوارج کے دیگر فرقوں کے ساتھ اس عقیدہ میں متفق ہے کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور کبیرہ کا مرتکب نعمات خداوندی کا کافر ہے مشرک نہیں۔

خوارج کا ایک دوسرا فرقہ بیہسیہ ہے ابو بیہس ہیصم بن جابر کا پیرو اصول و فروع دین میں ان کی عجیب و غریب رائیں تھیں منجملہ ان کی یہ ہے کہ شراب اصل میں حلال ہے اس کے قلیل یا کثیر کے متعلق کوئی حکم نہیں نازل ہوا۔ دین سے ناواقف اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مشرک ہیں۔

ایک اور فرقہ شبیبیہ ہے۔ شبیب بن یزید کا پیرو ان لوگوں کے نزدیک عورت کا امام ہونا اور اس کو خلیفہ بنانا جائز ہے اس کے علاوہ اور بھی نرالے عقائد تھے۔

ان مذکورہ بالا فرقوں کے سوا اور بھی بہت سے فرقے اور بہت سے خیالات و نظریات تھے۔ ان تمام فرقوں کا نقطہ مرکزی مرتکب کبیرہ اور مخالفین خوارج کا مسئلہ ہے ان کی جتنی شاخیں پھوٹیں انھیں دونوں باتوں سے پھوٹیں۔ اُن کے نظریات و اقوال کی چھان بین کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے پہلی چیز جو اُن کی زبان پر آئی وہ تکفیر تھی یعنی ہر ایک کو کافر قرار دے دینا۔ ان کے نزدیک دین کی سب سے بڑی کسوٹی ان کے اپنے نظریات و افکار تھے اور ان کی پیروی تھی جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے اُن کی پیروی کرے وہ تو مومن ہے بقیہ سب کافر۔ معمولی معمولی باتوں پر ان لوگوں نے اپنے ہی لوگوں کو کافر قرار دیا اور اپنے کو کئی گروہوں میں تقسیم کر لیا حتیٰ کہ اپنے دشمنوں یعنی بنی امیہ سے لڑتے وقت میدان جنگ میں بھی باز نہ آئے وہ افسران فوج جو اُن کی سرکوبی کے لئے متعین کئے گئے انھوں نے اُن کی اس کمزوری سے کافی فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نہج البلاغہ جلد اول میں لکھتے ہیں۔

" فرقہ ازارقہ (نافع بن ازرق خارجی کے پیرو) میں ایک لوہار تھا جو زہر آلود تیر بنانے میں ماہر تھا۔ مہلب بن ابی صفرہ (اموی سردار لشکر) اور ان میں لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ مہلب کے ساتھیوں نے اس لوہار کی شکایت کی مہلب نے کہا میں اس کا تدارک کئے دیتا ہوں اس نے ایک خط اور ہزار دینار ایک آدمی کو دیئے اور تاکید کی کہ اسے خوارج کے کیمپ میں ڈال آؤ۔ خط میں اس نے لکھا تھا۔ "تمہارے تیر ہمیں وصول ہوئے۔ ہم ہزار دینار تمھیں بھیج رہے ہیں اسے قبول کرو اور مزید تیر بنا کر بھیجو۔"

یہ خط ایک خارجی کے ہاتھ لگا اس نے قطری کو جو خوارج کا سپہ سالار تھا لے جاکر پیش کر دیا۔ قطری نے یہ خط پڑھ کر اس لوہار کو طلب کیا اور پوچھا کہ یہ خط اور دینار کیسے ہیں؟ اس نے لاعلمی ظاہر کی قطری نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے، خوارج کا ایک دوسرا افسر جس کا نام عبدربہ الصغیر تھا قطری کے پاس آیا اور شکایت کی کہ تم نے بغیر کسی ثبوت و شاہد کے ایک کام کے آدمی کو قتل کر ڈالا۔ قطری نے کہا۔ اس ہزار دینار کو کیا کہا جائے اس افسر نے کہا۔ یہ صحیح اور غلط دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں۔ قطری نے کہا اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو ایک آدمی کو قتل کر دینے میں کوئی حرج نہیں امام کو حق حاصل ہے کہ جو مناسب سمجھے کرے رعیت کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبدربہ الصغیر اپنے کچھ رفیقوں کے ساتھ قطری سے برگشتہ خاطر ہو گیا ان لوگوں کو اس بات کا غم و غصہ تھا کہ قطری نے جلد بازی سے کیوں کام لیا۔

مہلب کو جب اُن کے اس اختلاف کی خبر ملی تو انھیں آپس میں ٹکرانے کی مزید تدبیریں کیں اس نے ایک نصرانی کو روپئے پیسے دے کر تیار کیا کہ وہ قطری کے پاس جائے اور اسے دیکھتے ہی سجدہ میں گر پڑے مہلب نے اسے تاکید کی کہ قطری سے کہنا کہ میں سجدہ تمھیں کر رہا ہوں نہ کہ خدا کو۔ نصرانی نے جب یہ حرکت کی تو خوارج بہت برہم ہوئے اور قطری سے کہا۔ اس نصرانی نے خدا کو چھوڑ کر تمھیں سجدہ کیا ہے

کسی نے قرآن کی یہ آیت بھی پڑھی انکم و ما تعبدون من دون اللہ حطب جہنم انتم لہا واردون تم اور تمھارے معبود جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں جس میں تم جانے والے ہو۔

قطری نے کہا۔ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کی بھی پرستش کی مگر اس سے حضرت عیسیٰ کا کچھ نہیں بگڑا خوارج میں اتنا اختلاف بڑا کہ آخر نصرانی قتل کر ڈالا گیا۔

مہلب اس کے بعد بھی سلسل چالیس چلتا رہا۔ یہ دیکھ کر کہ یہ تو تلوار سے بھی زیادہ فائدہ مند ہے اس نے ایک شخص کو سکھا کر بھیجا کہ جاکر خوارج سے ان دو شخصوں کے متعلق سوال کرو جو ہجرت کرکے خوارج کی طرف روانہ ہوئے ایک اُن میں سے راستہ ہی میں مر گیا دوسرا پہونچا مگر وہ خارجی نہ بن سکا۔

خوارج کی ایک جماعت نے جواب دیا کہ جو شخص راستہ میں مر گیا وہ تو جنت میں گیا اور جو شخص زندہ بچ رہا وہ کافر ہے دوسری جماعت نے کہا دونوں ہی کافر ہیں اس مسئلہ پر پورے ایک مہینہ تک خارجیوں میں بحث تکرار ہوتی رہی۔ (شرح نہج البلاغہ جلد ا صـ۴۰۱)

تلاش و جستجو کرنے پر خوارج کی تاریخ میں معمولی معمولی باتوں پر اس قسم کے اختلافات کی سیکڑوں ہی مثالیں ملتی ہیں خوارج کے دشمنوں نے ان کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا انھوں نے اسی راستہ انھیں شکست دینے کی امکانی کوشش کی اور ان کی کوششیں شاندار طریقہ پر کامیاب بھی رہیں آئے دن کے باہمی اختلافات کی وجہ سے خوارج مسلسل ہزیمتیں اُٹھاتے رہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ شدائد میں بڑے ثابت قدم اور میدان جنگ میں غیر معمولی جی داری کا مظاہرہ کرتے تھے اور اپنی تحریک کے بڑے سرگرم مبلغ تھے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ معمولی معمولی باتوں میں ان کا اختلاف انتہائی طول پکڑ جاتا۔

اس کمزوری کے علاوہ ایک بات اور بھی اُن میں تھی کہ وہ اپنی تحریک بغاوت کو مذہبی رنگ دینے کے انتہائی حریص تھے جو بھی اُن کی جیسی رائے نہیں رکھتا اُسے کافر قرار دیتے، دین و مذہب کے نام پر فساد کرتے اور اپنے نظریات و معتقدات کی حمایت میں بعض آیتوں کے ظاہری الفاظ سے حجت و تکرار کرتے انکی نظر آیت کے محض سطحی پہلو پر ہوتی اس فکر و نظر سے کام ہی نہیں لیتے جس سے حق تک پہونچنا ممکن ہوتا اسی وجہ سے وہ اپنے تمام مناظروں میں ٹکنے نہیں پائے

باوجودیکہ وہ اپنے عقیدہ میں انتہائی سخت تھے زبان میں تیزی و طراری بھی تھی بہت ہی دل نشین اور موثر الفاظ میں وہ اداے مطلب پر قادر تھے مگر ان سب کے سب باوجود انھیں ہر مناظرہ میں شکست اٹھانی پڑی، ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں بعض آیتوں کا ذکر کیا ہے جن سے خوارج اہل ذنب کے کافر ہونے پر استدلال کرتے تھے۔ انھوں نے ہر گناہ کو ایک ہی درجہ میں رکھا کوئی تفریق نہیں کی یہاں تک رائے کی غلطی کو بھی انھوں نے گناہ ہی قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ اور آن کے درمیان جتنے مناظرے

ہوئے آپ نے قرآن و حدیث سے دلیلیں نہیں پیش کیں کیونکہ دونوں ہی میں تاویل کی گنجائش ہے۔ خوارج بعض آیتوں کے ظاہری معنی کو اپنے نظریات کے موئد پاتے تھے اور اسی پر اڑے رہتے انھیں ظاہری معنی سے موڑ کر واقعی مراد آیت تک لے جانا بہت دشوار تھا۔ امیر المومنینؑ نے بجائے قرآن و حدیث سے استدلال کرنے کے عمل پیغمبرؐ سے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ خوارج گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے تھے امیر المومنینؑ نے ان سے پوچھا کہ یہ بتاؤ گناہ کبیرہ کرنے والے کے ساتھ پیغمبرؐ کا سلوک کیا رہا؟ آپ نے بیسیوں شواہد ایسے پیش کئے کہ پیغمبرؐ خدا نے ان کے ساتھ نہ تو کفار جیسا برتاؤ کیا نہ مشرکین جیسا۔ آنحضرتؐ نے زنائے محصنہ کے مرتکب کو سنگسار کیا اور اس کی آل و اولاد اس کی جائداد کے وارث ہوئے قاتل کو قتل کیا اور اس پر مسلمانوں کے احکام جاری فرمائے یعنی قتل کئے جانے کے بعد اس کا دفن و کفن اسی طرح ہوا جس طرح مسلمان کا ہوتا ہے چور کے ہاتھ کاٹے مگر مال خراج میں اس کا جو حصہ ہوتا تھا وہ بھی اسے دیا۔

غرضکہ مرتکبین کبائر کو ان حقوق سے نہیں محروم رکھا جو خداوند عالم نے عام مسلمانوں کے لئے قرار دیئے ہیں۔ پیغمبرؐ اپنی زندگی کے آخری دن تک اسی روش پہ قائم رہے۔ پیغمبرؐ کے بعد خلفا کا بھی یہی طریقہ کار رہا۔ خوارج پیغمبرؐ اور خلفا کی اس روش سے انکار نہیں کر سکے اسی انداز و اسلوب بیان سے آپ نے انھیں سمجھایا کہ کسی کو کافر اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ کوئی خداوند عالم کی وحدانیت پیغمبرؐ کی رسالت اصول اسلام سے کسی اصل یا ضروریات دین کا انکار کرے بایں طور کہ اس کے انکار سے کتاب خدا یا پیغمبرؐ کی تکذیب لازم آئے اور یہ ظاہر ہے کہ گناہ کبیرہ کرنے والا جب تک کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا انکاری نہ ہو اسلام ہی کے حکم پر باقی رہے گا۔

امیر المومنینؑ نے ان خوارج سے سلسلۂ گفتگو میں فرمایا۔

"اگر تم کو اس بات پہ اصرار ہے کہ میں نے خطا کی میں گمراہ ہو گیا تو پھر تم میری خطا اور میری گمراہی کی وجہ سے سارے مسلمانوں کو کیوں گمراہ قرار دیتے ہو میری خطا میرے گناہ کی سزا انھیں کیوں دیتے ہو؟ تمھاری تلواریں، تمھارے کاندھوں پہ ہیں خطا کار و بے گناہ سبھی کو اس سے قتل کرتے ہو اور قصوروار و بے قصور میں کوئی فرق نہیں کرتے، تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ پیغمبر خدا نے زنا محصنہ کرنے والے کو سنگسار بھی کیا پھر اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی۔ اس کے اہل و عیال اس کے وارث بھی ہوئے قاتل کو قتل کیا اور اس کے گھر والوں کو اس کا وارث بھی بنایا۔ چور کے ہاتھ کاٹے زنا کار کو سزا دی پھر انھیں مال خراج سے حصہ بھی مرحمت فرمایا مسلمان عورتوں سے ان کا نکاح بھی کر دیا۔ پیغمبرؐ خدا نے ان کے گناہوں کا ان سے مواخذہ کیا — خداوند عالم کے حدود ان پر جاری کئے لیکن اسلام میں ان کا جو حصہ تھا اس سے محروم نہیں کیا اور نہ مسلمانوں کی فہرست سے ان کا نام نکال باہر کیا۔" (شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صلہ ۳۰)

امیر المومنینؑ کے علاوہ دوسرے مناظرہ کرنے والوں نے بھی اسی طریقہ سے مناظرہ کیا پیغمبر خدا کے طرز عمل کو ثبوت میں پیش کیا جس میں کسی تاویل و تشکیک کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن خوارج الفاظ قرآن ہی پر اڑے رہے۔ انھوں نے اس انداز بیان کو قبول نہیں کیا اور تمام مسلمانوں کو کافر گردانا کیونکہ وہ اُن کے ساتھ نہیں ہوئے بعض آیتوں کے ظاہری الفاظ سے مرتکبین کبائر کو کافر قرار دیتے رہے۔ ان کی کوشش رہی کہ اُن کے خصوصی نظریات و افکار پر دینی رنگ چڑھا رہے۔ انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق قرآن کی تاویلیں کیں تاکہ اپنے فائدہ کی باتوں میں دین سے پورا پورا سہارا لیں لیکن انھیں تمام حالات میں ناکامی ہی کا منھ دیکھنا پڑا وہ اسلام اور قرآن سے بھی دور ہوتے گئے اور مسلمانوں سے بھی باوجودیکہ انھوں نے اپنے تمام معرکوں میں غیر معمولی پامردی و ثبات قدم سے کام لیا اور بڑے بڑے شدائد کا سامنا کیا۔ اُن کی ناکامی کے اسباب میں مختصر طور پر حسب ذیل باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

پہلا سبب یہ کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کی تکفیر کرتے تھے اس تکفیر کو اُن کی تمام تحریکات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور باوجودیکہ وہ خوارج خود کئی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور بہت سی باتوں میں اُن کے اندر شدید اختلافات تھے لیکن تکفیر میں سب متفق تھے وہ متفقہ طور پر علیؑ و طلحہ و زبیر اور تمام مسلمانوں کو کافر کہتے تھے ایسے اسباب کی بنا پر جنھیں نہ اسلام نے تسلیم کیا ہے نہ کتاب و سنت میں اُن کا کوئی وجوب ہے انھوں نے حد سے زیادہ خونریزی کی مسلمانوں کا مال و متاع لوٹا اور دین و اسلام کے نام پر لوگوں کی آبروریزی کی۔ مسلمانوں کے ساتھ پیغمبر خدا کا جو برتاؤ رہا حضرت علیؑ نے اس برتاؤ سے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے عناد و گمراہی پر اڑے رہے جو راستہ اختیار کیا تھا اسی پر چلا کیے زمین میں فساد پھیلاتے بے قصور لوگوں کو قتل کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام مسلمانوں کی ہمدردی کھو بیٹھے وہ تمام مراحل جن سے خوارج کو گزرنا پڑا مسلمانوں کی پوزیشن ان مراحل میں اُن کے حریف ہی کی رہی حالانکہ بنی اُمیہ کے زمانہ میں بھی مسلمانوں اور حکام سلاطین کے درمیان نفرت کی خلیج حائل رہی مگر مسلمانوں نے اُموی حکومت کے زیر سایہ رہنے کو کہیں بہتر سمجھا بہ نسبت خوارج کے ساتھ تعاون کرنے کے۔

دوسری وجہ یہ کہ انھیں اچھی قیادت نصیب نہ تھی وہ بڑے جفاکش، بڑے سورما بھی تھے مگر ان کا کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو انھیں ایک مرکز پر سمیٹے رہتا انھوں نے اپنے ان افسروں کی اطاعت بھی نہ کی جنھوں نے لڑائی کے میدانوں میں ان کی کمانداری کی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ ٹھیک میدان جنگ میں جب کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابل صف آرا تھے معمولی معمولی باتوں پر اُلجھ پڑے اور آپس میں تلواریں تک کھنچ گئیں اُن کی اس کمزوری سے اموی افسران فوج نے کافی فائدے اٹھائے اور ان خوارج کو شرمناک شکستیں دیں۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح مہلب بن ابی صفرہ نے ان میں اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔

تیسری وجہ یہ کہ ایک طرف تو یہ خارجی دین و مذہب میں اپنے کو اتنا سخت ظاہر کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا تھا اُن کی جان و مال، عزت و آبرو مباح سمجھ لی تھی مگر دوسری

طرف ان سے بعض ایسے اجتہادات سرزد ہوئے جو اصول اسلام کے قطعی منافی تھے بلکہ سراسر اسلام کی بیخ کنی تھے اور اسی بنیاد پر انھیں مرتد کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا ان کے ایک لیڈر یزید بن انیسہ نے یہ دعویٰ کیا کہ عنقریب خداوند عالم عجمیوں میں ایک نبی مبعوث کرے گا۔ ایسی کتاب دے کر جو شریعت محمدیؐ کی ناسخ ہوگی۔ اسی طرح ایک دوسرے لیڈر میمون عجردی نے اپنی پوتی سے اپنے بھائی بہن کی پوتی سے نکاح جائز قرار دیا۔ کسی تیسرے لیڈر نے یہ دعویٰ کیا کہ سورۂ یوسف قرآن کا جزو نہیں۔

اسی طرح خوارج کے ہر فرقہ کی کچھ نہ کچھ خصوصی رائیں تھیں جن کی وجہ سے مسلمان اُن سے انتہائی احتیاط برتنے لگے ان کی کامیابی کو اسلام اور اصول اسلام کے لئے بڑا خطرہ سمجھا اسی وجہ سے انہوں نے حکام سے جتنی لڑائیاں بھی لڑیں ان میں اکیلے ہی رہے مسلمانوں نے اُن کا ساتھ نہیں دیا نہ ان کی جنگوں کو قومی اور عوامی جنگ کی حیثیت حاصل ہو سکی۔ وہ اپنے آغاز سے انجام تک حضرت علیؑ کے زمانہ سے بنی عباس کے ابتدائی زمانہ تک جب کہ اُن کی خاکستر کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی ایک ہی رنگ [illegible] رہے عوام نے اُن کا ایک مرحلہ میں بھی ساتھ نہیں دیا اگر وہ دوسری انقلابی تحریکیں جو بنی اُمیہ و بنی عباس کے زمانہ میں ظہور میں آیا کیں اتنے ہی طویل عرصہ تک باقی رہتیں جتنا طویل عرصہ خوارج کو نصیب ہوا تو ان تحریکوں سے یہ فائدے ضرور حاصل ہوتے کہ فساد کی بیخ کنی ہو جاتی اور وہ عدالت اجتماعیہ عالم وجود میں آجاتی جو اسلام نے ہر حاکم کے لئے فرض قرار دی ہے وہ انقلابی تحریکیں جو علوی سادات اموی و عباسی عہد میں لے کے اُٹھے تھے ان کی غرض و غایت محض یہ تھی کہ عوام کو حاکموں کے ظلم سے رہائی ملے جنھوں نے بے گناہوں اور نیکو کاروں کی لاشوں پر اپنی حکومت قائم کی [illegible] اسی لئے یہ تحریکیں لباادات علماء اور دیندار مومنین کی تائید اور مالی امداد سے بھی محروم نہ رہیں جیسا کہ امام اہل سنت ابو حنیفہ کا زید بن علیؑ کی تحریک انقلاب میں طرز عمل رہا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورا ساز و سامان مہیا نہ ہونے کے سبب اکثر یہ تحریکیں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔

خوارج اگر عدالت و انصاف کے طالب ہوتے تو علیؑ ہی کے پاس انھیں یہ چیز مل جاتی کیونکہ وہ اپنی سیرۃ سیاست اور انسانی ہمدردی میں مثالی حیثیت رکھتے تھے ان کا سخت سے سخت دشمن بھی انھیں یہ تہمت نہیں لگا سکا کہ وہ بال برابر بھی کبھی قرآن و سیرۃ رسولؐ سے منحرف ہوئے مگر اس کے باوجود ان خوارج نے ان کے خلاف خروج کیا انھیں کافر کہا ان سے قتال جائز سمجھا اور حالت نماز میں انھیں دھوکہ سے شہید کر دیا۔

مختصر یہ کہ خوارج ایک طرف رہے اور سارے مسلمان دوسری طرف۔ خوارج نے اپنے لئے وہ راہ متعین کی جس میں سارے ہی مسلمانوں کی مخالفت تھی انھوں نے اپنی من مانی حرکتوں کو دین سے چپکانے کی کوشش کی اس نقطہ نظر سے جو خود ان کا اپنا نقطہ نظر تھا اور وہ یہ کہ حکومت پر قابض ہو جاؤ اور قریشیوں کے ہاتھ سے اسے نکال لو۔ اُنھوں نے اپنے تصرفات اور نظریات کی صحت پر کلام مجید کی آیتوں سے اپنی سمجھ کے مطابق دلیلیں پیش کیں مگر ان کے قول و عمل میں ہمیشہ تضاد رہا۔ ایک مرتبہ تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک گناہ کرنے والے کو بھی کافر قرار دے رہے عبداللہ

بن خباب جیسے صحابی جلیل کو قتل اور اُن کی بیوی کا پیٹ چاک کرتے ہیں اور پیٹ سے بچہ نکال کر اسے ماں کے سینہ پر حلال کرتے ہیں۔ بھتیجی بھانجی پوتی سے نکاح جائز قرار دیتے ہیں اور ٹھیک اسی وقت وہ حرام سے بچتے اور غذر سے ڈرتے ہوئے ان کھجوروں کو بغیر قیمت ادا کئے کھانے سے انکار کرتے ہیں جو کسی کافر ذمی نے بلا قیمت پیش کی تھیں انھیں وجوہ سے اُن کے حالات کی چھان بین کرنے والا انھیں اپنے تمام تصرفات میں ہر لحاظ سے دین و علم منطق و حقیقت کی تمام حدوں سے گذرا ہوا پاتا ہے اور اسی وجہ سے مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نزدیک اُن کی حیثیت اچھوتوں کی سی رہی انھوں نے جتنی بھی لڑائیاں لڑیں کسی ایک میں بھی عوام کی ہمدردیاں حاصل نہ کرسکے نہ اُنھوں نے عوام کی کوئی امید و آرزو پوری کی بیسیوں برس تک لڑتے بھڑتے رہے لیکن انھیں ہمیشہ ناکامی ہی نصیب ہوئی۔

جس وقت حکومت و اقتدار ظالم و مفسد ہاتھوں میں تھا جو حقیر سے حقیر چیزوں میں بھی خیانت کیا کرتے اگر اس وقت یہ خوارج بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے۔ عدالت و انصاف کو عالم وجود میں لانے اور اُس راستہ پر گامزن ہونے کی کوشش کرتے جو اسلام نے حاکموں کے لئے متعین کیا ہے تو یقیناً اُن کی تحریکات اسلام اور مسلمانوں کے لئے خیر و برکت اور شان و شوکت کا باعث ہوتیں۔

تیسری فصل

بعض بدعتی اور گمراہ فرقے

خوارج کے ظہور سے مسلمانوں کی صفوں میں ایک نئی تقسیم کی ابتدا ہوئی جب کہ اس زمانے میں خوارج کو بلحاظ عقائد کے خواہ وہ فرعی ہوں یا اصولی کوئی خصوصی امتیاز حاصل نہیں تھا نہ انھوں نے کوئی ایسا مسئلہ پیش کیا تھا جس کے سبب انھیں دوسرے مسلمانوں سے کوئی جداگانہ حیثیت حاصل ہوتی بس لے دے کے اُن کی یہی ایک ناراضگی تھی ان حکام و سلاطین کے سامنے جو معرکہ صفین کے بعد مسلمانوں کے امیر ہوئے جب کافی دن گزر گئے ان کی باغیانہ تحریکیں مختلف اسلامی شہروں میں کافی پھیل چکیں تب اُن کی کچھ خصوصی رائیں اصول میں بھی ظاہر ہوئیں اور بعض فرعی مسائل میں بھی اور اس وقت وہ اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ قرار پائے اور خوارج کے نام سے موسوم ہوئے حالانکہ وہ حقیقتاً جمہور اہل سنت ہی کا ایک فرقہ تھے خلافت اسلامیہ کے بارے میں وہ اور اہل سنت ایک ہیں کئی ایک اصول اور بکثرت فرعی مسائل میں بھی وہ اہل سنت سے متحد ہیں البتہ شیعہ امامیہ سے کسی نقطہ پر اُن کا اتحاد نہیں اس لئے کہ خوارج کے تمام فرقے علیؑ اور اُن کے پیرووں کو کافر قرار دیتے ہیں جب کہ ابوبکر و عمر اور عثمان کی خلافت کے وہ قائل اور صحابہ سے متعلق اُن کی وہی رائے ہے جو اہل سنت کی ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خوارج کے ظہور سے پہلے مسلمانوں کے صرف دو ہی فرقے تھے ایک فرقہ اس کا مدعی تھا کہ پیغمبرؐ خدا بغیر کسی کو اپنا جانشین مقرر کئے دنیا سے اُٹھ گئے اور انتخاب کا حق اُمت والوں کو دے گئے کہ وہ جس کو اس قابل

[illegible] منتخب کرلیں اور آیت والوں نے ابوبکر کو منتخب کیا وہ مرتے وقت عمر کو خلیفہ مقرر کر گئے - یہاں تک کہ سلسلہ
[illegible] اور [illegible] افراد یعنی شیعہ جو پیغمبرؐ کے صریحی ارشادات کے پابند تھے جو کہ آنحضرت نے مختلف مواقع پر فرمائے
[illegible] اس بات کے قائل تھے کہ علیؑ ہی خدا کے منتخب کردہ خلیفہ ہیں۔ پیغمبرؐ کے ان ارشادات کو شیعہ و سنی دونوں علماء دینی کتابوں
میں اس وقت سے لکھتے آرہے ہیں جب سے کہ تدوین و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا لیکن اہل سنت حضرات نے ان ارشادات کی
تاویلیں کیں۔

ہم پہلی فصل میں یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ تشیع اپنے اس معنی کے لحاظ سے جو پیغمبرؐ کے بعد سے آج تک فقہاء و متکلمین
[illegible] مشہور [illegible] کی زندگی ہی میں وجود میں آچکا تھا اور صحابہ کی ایک جماعت اس پر ایمان رکھتی تھی اور یہ جماعت پیغمبرؐ کی رحلت کے
[illegible] کی خلافت کو تسلیم نہیں ابوبکر کی اس وقت تک بیعت نہ کی جب تک علیؑ نے خود صلح و مصالحت کو ترجیح نہ دی۔
[illegible] کے بعد بھی تشیع کا نظریہ لوگوں کے ذہنوں میں زندہ اور پھلتا پھولتا رہا اور مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز
[illegible] قرآن و حدیث کا مطالعہ جتنا گہرا ہوتا گیا اس کی نشر و اشاعت ہوتی گئی اور یہ تشیع اسلام کی ایک پہلو

[illegible] اور خلفائے اربعہ کے بعد کے زمانہ میں اس کا مفہوم اور وسیع ہوتا گیا اور امامت ائمہ اثنا عشر کا اعتقاد ایمان
[illegible] کا جزء سمجھا جانے لگا۔ پیغمبرؐ کے ان صریحی ارشادات کی پابندی میں جو پیغمبرؐ خدا اور اہل بیت کے واسطہ سے ان
[illegible] پہنچی تھیں۔ بعض حدیثوں میں ائمہ اثنا عشر کی صراحت اور ہر ایک کے نام و اوصاف کی صراحت بھی ہے۔
منجملہ ان حدیثوں کے ایک یہ حدیث بھی ہے۔ ان الخلفاء من بعدی اثنا عشر
ایک اور حدیث رواۃ و محدثین میں کافی مشہور ہے کہ ان الحسن والحسین امامان قاما او قعدا
خود شیعوں کی صفوں میں امامت کے متعلق تقسیم امام حسینؑ کی شہادت اور امامت کے امام زین العابدینؑ کی طرف منتقل
ہو جانے کے بعد پیدا ہوئی جیسا کہ اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کا دعویٰ ہے۔
اسلامی فرقوں پر کتابیں لکھنے والوں نے نیز عربی مورخین اور مستشرقین یورپ نے شیعہ کی لفظ کو وسعت دے کر ہر اس
بدعتی اور فتنہ پرور کے لئے اسکو استعمال کرنا شروع کیا جس نے سادہ لوح افراد کو گمراہ کرنے اور اہل بیتؑ کی محبت اور انکی
نسبت سے شرف یابی ظاہر کر کے اپنا کام نکالنے کی کوشش کی لہٰذا ہر وہ شخص جو کتاب و رسالت اور انبیاء و مرسلین کی لائی
ہوئی باتوں کا انکار کرے [illegible] اہل سنت کے نزدیک شیعہ ہے جب تک کہ وہ دوستدار اہل بیتؑ ہے۔
حالانکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل بیتؑ اور شیعان اہل بیت کے عقائد و افکار میں کسی قسم کی کجی نہیں نہ قرآن و تعلیمات
رسولؐ سے کوئی انحراف ہے۔ انھوں نے قرآن و تعلیمات اسلامی کی راہ میں زندگی بھر جہاد کیا اسی راہ میں قتل ہوئے جلا وطن
ہوئے اور کسی قوم نے اتنے مصائب و آلام نہیں برداشت کئے ہوں گے جو شیعوں اور شیعوں کے ائمہ نے حکام و سلاطین کی
طرف سے جھیلے اور کسی وجہ سے نہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ چشم زدن کے لئے بھی اصول و ضروریات اسلام [illegible]
اس کے بعد بھی ہر بدعتی اور ہر افترا پرداز شخص خواہ اس کی بدعتیں اور افترا پردازیاں کتنی ہی کیوں نہ ہوں وہ شیعہ ہے

باہر نہیں صرف اس بنا پر کہ وہ اہل بیتؑ کی محبت کا دعوے دار ہے اور ان کی عزت و توقیر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اہل سنت نے اکثر گمراہ فرقوں کو شیعوں میں شمار کیا ہے انھیں گمراہ فرقوں میں سے فرقہ سبائیہ ہے جو عبداللہ بن سبا کی طرف منسوب ہے جس نے علیؑ کے متعلق غلو ظاہر کیا تھا اور علیؑ نے اس سے توبہ کرا کر مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا تھا اور وہاں بھی اس کی شدید نگرانی کی جاتی تھی لیکن اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ عبداللہ بن سبا حضرت علیؑ کی وفات کے بعد پھر اپنے پہلے عقیدہ پر پلٹ آیا تھا اور جیسے فرقہ بیانیہ جو بیان بن سمعان کی الوہیت کے قائل ہو گئے تھے[1]۔

اور جیسے فرقہ مغیریہ مغیرہ بن سعید عجلی کے پیرو۔ یہ مغیرہ محبت اہل بیتؑ کا مدعی تھا اس نے ہزاروں حدیثیں تصنیف کر کے احادیث اہل بیت میں شامل کر دیں بعد میں اپنی نبوۃ کا دعویٰ کر بیٹھا۔ امام جعفر صادقؑ کو جب اس کے حالات معلوم ہوئے تو آپ نے اس پر لعنت فرمائی اور شیعوں کو اس کے خیالات اور مرویات سے اجتناب کی تاکید کی۔

اور جیسے فرقہ منصوریہ ابو منصور عجلی کے پیرو اس نے دعویٰ کیا تھا کہ امام محمد باقرؑ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور آپ نے آسمان پر جانے سے پہلے میری امامت کی وصیت کی اور سورۂ طور کی آیت وان یروا کسفا من السماء ساقطا یقولوا سحاب مرکوم میں امام محمد باقرؑ ہی مراد ہیں۔ اس کے پیرو جنت و نار کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ جنت سے مراد دنیا کی نعمتیں اور جہنم سے مراد وہ مصائب و آلام ہیں جو انسان اپنی زندگی میں اٹھاتا ہے۔ یہ ابو منصور یوسف بن عمر ثقفی کے ہاتھوں مارا گیا۔ (التبصیر ص۱۰۱ فرق نوبختی ص۳۸)

اور جیسے فرقہ جناحیہ جو عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار کے پیرو تھے اس فرقہ کی طرف یہ عقائد منسوب ہیں کہ خدا کی روح انبیاءؑ میں حلول کر گئی تھی اور حضرت پیغمبر خداؐ سے ائمہ میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی یہ نہ قیامت کے قائل تھے نہ جنت و نار کے، زنا، شراب لواطہ اور تمام محرمات اور ترک واجبات کو جائز جانتے ہیں ان کے آقا عبداللہ بن معاویہ اب بھی اصفہان کے کسی پہاڑ میں زندہ ہیں۔ (تبصیر ص۱۱۱)

اور جیسے فرقہ خطائیہ جو ابو الخطاب، محمد بن ابی زینب کے پیرو تھے۔ ابو الخطاب کا لقب اجدع تھا اس نے دعویٰ کیا کہ ائمہ خدا تھے اور اولاد حسنؑ و حسینؑ انبیاء و دوستان خدا ہیں۔ آخر میں اس ابو الخطاب نے خود اپنے متعلق خدائی کا دعویٰ کیا۔ امام جعفر صادقؑ کو جب اس کے اقوال معلوم ہوئے تو آپ نے مغیرہ بن سعید، بشار اشعری، حمزہ بربری سری وغیرہ کے ساتھ اس پر بھی لعنت فرمائی۔

شہرستانی نے ملل و نحل میں نوبختی نے الفرق میں اشعری نے اپنی کتاب مقالات الاسلامیین میں اسفرائنی نے تبصیر میں ان مذکورہ بالا اشخاص کے اقوال ——— و نظریات ذکر کئے ہیں اور وہ سب کے سب ان کے کفر کا صریحی ثبوت ہیں۔ امام جعفر صادقؑ ان کے کفر و ضلالت کی تشہیر میں بیحد کوشاں رہے تاکہ سادہ لوح افراد ان سے دھوکہ نہ کھائیں

---

[1] اس بیان بن سمعان نے دوسری صدی ہجری میں عراق میں ظہور کیا اور مدعی ہوا کہ خدا کا ایک جزو علیؑ میں حلول کر گیا، پھر محمد بن حنیفہ میں اور ان سے ان کے فرزند ابو ہاشم میں منتقل ہوا آخر میں اس نے اپنے متعلق دعویٰ کیا۔ خالد بن عبداللہ قسری گورنر ہشام بن عبدالملک نے اس کو مار ڈالا۔ (حاشیہ بر کتاب تبصیر ص۔۔ الدین شیخ محمد زاہد ابن حسن کوثری ص۷۲)

اور جیسے فرقہ غرابیہ جو اس کے قائل تھے کہ خداوند عالم نے جبرئیل کو علیؑ کے پاس بھیجا لیکن وہ حضرت محمد مصطفےٰؐ کے پاس چلے گئے کیونکہ محمد مصطفےٰؐ اور علیؑ بالکل اسی طرح تھے جیسے غراب (کوے) ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اس فرقے والے قائل ہیں کہ خداوند عالم نے انتظامات خلق کا معاملہ محمدؐ کو سونپا اور محمدؐ نے علیؑ کو۔

یہ عقیدہ بھی ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ علیؑ نے محمدؐ کو رسولؐ بنایا تاکہ وہ لوگوں کو ان کی الوہیت کی طرف دعوت دیں مگر اُنھوں نے دوسرے کی الوہیت کی دعوت دی۔

اور جیسے فرقہ نمیریہ محمد بن نصیر نمیری کے پیرو جو امام حسنؑ کو خدا مانتے اور نمیر کو رسول، نیز تناسخ اور محرمات کے مباح ہونے کے قائل تھے

اور جیسے فرقہ سبعیہ جو اس کے قائل تھے کہ امامت اسماعیل بن جعفر صادقؑ سے محمد ابن اسماعیل کی طرف منتقل ہوئی۔ اولو العزم سات ہیں اُن میں سے ایک محمد بن اسماعیل بھی ہیں محمد بن عبد اللہ کی شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔

ہم نے نمونہ کے طور پر ان چند فرقوں کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق ان مولفین نے جنھوں نے اسلام کے فرقوں پر کتابیں لکھی ہیں دعوئ کیا ہے کہ یہ سب فرقے شیعوں کے تھے۔ یہ مولفین انکی ساری خرافات کا بار شیعوں کے سر ڈالتے ہیں حالانکہ اگر مان بھی لیا جائے کہ تاریخ میں کبھی ان فرقوں کا وجود رہا تو جو اقوال و نظریات ان فرقوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ ثبوت ہیں کہ ان فرقوں کو اسلام ہی سے کوئی ربط نہیں چہ جائیکہ تشیع سے اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ لوگ اپنے کو شیعوں میں شمار کرتے تھے تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ شیعیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے نظریات اور اتہامات کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ ایک بات یہاں اور بھی غور کے قابل ہے وہ یہ کہ اموی و عباسی حکام ائمہ اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں کو بدنام کرنے کے لئے دن رات انتہائی سرگرمی سے کوشاں رہتے انھوں نے ساری توانائیاں اس کام میں صرف کر دیں کہ مسلمانوں کو شیعوں سے جہاں تک ہو سکے متنفر و بیزار بنا دیا جائے انھوں نے شیعوں کی صفوں میں اپنے ایسے جاسوس شامل کر دیئے جو اُن کو بدنام کرنے والی حرکتیں کریں اور اصول و فروع کے متعلق نت نئی بدعتیں اور مہمل سے مہمل عقائد ان کی طرف سے مشہور کریں یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب سلاطین و حکام شیعیت کی روک تھام کرنے سے قاصر رہے تو انھیں ذلیل و رسوا کرنے کے لئے اس قسم کی ذلیل سے ذلیل حرکتیں کیں۔

غرض یہ فرقے جن کے وجود کے مورخین اہل سنت دعویدار ہیں ان فرقوں کے وجود میں آنے کے جو بھی اسباب رہے ہوں اور خواہ ان کا وجود رہا ہو یا نہ رہا ہو اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں نے آنکھیں بند کر کے انھیں تسلیم کیا اور ان فرقوں کو شیعوں کی طرف نسبت دیدی۔ ان کے فرضی وجود کو وسیلہ بنا لیا اہل بیت اور شیعیان اہل بیت پر طعن و تشنیع اور انھیں بدنام کرنے کا۔ اس فرقہ وارانہ تعصب کی بنا پر جو انھیں خاندانی میراث میں ملا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو لوگ تاریخ میں ان فرقوں کے وجود کو مانتے ہیں وہ بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ یہ فرقے اپنے زمانہ میں پیدا بھی ہوئے اور اپنے ہی زمانہ میں ختم بھی ہو گئے۔ ان سب حقائق کے باوجود آج کل کے مصنفین ان فرقوں کا زور و شور سے چرچا کرتے ہیں جو اموی و عباسی حکام و سلاطین کی کارستانیوں کا شاہکار تھے ان فرقوں کا ڈھول پیٹ کر اپنے کو بھی خوش کرتے ہیں اور اپنے دشمنان اسلام آقاؤں کا بھی۔ شیعوں کا ان فرقوں کے متعلق ان کے تمام مراحل میں جو موقف رہا وہ کوئی ڈھکا چھپا نہیں نہ آج کل کے زمانہ میں نہ آج سے پہلے۔

انھوں نے تاریخ میں اُن کا ذکر دیکھتے ہی اُنھیں کافر قرار دیا وہ ہر موقع و محل پر، کتابوں میں منبروں پر اپنے عقائد و اصول دین و مذہب کا علانیہ ذکر کرتے ہیں اور بیانگ دہل ہر اُس شخص کو جو اصول اسلامیہ کا مخالف ہو کافر قرار دیتے ہیں ایسے اصول اسلامیہ جن پر تمام جمہور مسلمین کا اتفاق ہے اور جو کتاب و سُنّت پیغمبرؐ سے مستفاد ہیں اس شخص کو تو خصوصیت کے ساتھ کافر کہتے ہیں جو خصوصیات خالق کو مخلوقین کے لیے قرار دے۔ اُن کے ائمہ طاہرین کے صریحی اقوال و ارشادات حدِ تواتر تک پہونچے ہوئے ہیں جن میں ان حضرات نے ان مذاہب والوں کو کافر قرار دیا ہے اُن سے بیزاری ظاہر کی ہے اور ہر ہر منبر ہر موقع و محل پر لعنت فرمائی ہے وہ دن دور نہیں جس دن مسلمان خاندانی کینیوں کو بالائے طاق رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے ان تہمتوں پر غور کریں گے سیاست نے جن کی تخلیق کی اور اُن عناصر نے جنم دیا جو مسلمانوں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے اور اُن کی تعلیمات کو برباد کرنے کے لیے گھس آئے تھے ایسی تعلیمات جنھوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا اور جن کی بدولت نصف صدی تک وہ ترقی کے میدان میں زقند بھرتے رہے۔

ہم آئندہ فصلوں میں دکھائیں گے کہ اصول اسلامیہ کے متعلق شیعہ امامیہ کے خیالات مسلمانوں کے دوسرے فرقہ معتزلہ، مرجئہ اور اشاعرہ وغیرہ سے جو ہر زمانہ میں سوادِ اعظم کے نمائندے کہے جاتے رہے ملتے جلتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ فرقۂ امامیہ تمام مسلمانوں سے زیادہ خداوند عالم کی تنزیہ و تقدیس اور صفات مخلوقین سے بلند و برتر ثابت کرنے اور ہر اس بات کا اقرار کرنے میں کتنا حریص رہا جو اُس کی وحدانیت اور قدرت کے لائق ہے۔ یہی فرقہ تمام فرقوں سے زیادہ نصوص قرآن کا معتقد رہا اور ان لوگوں کا سخت ترین مخالف جو اسلام کے صحیح راستہ اور اُس کے تعلیمات اور احکام سے منحرف رہے۔

جب کہ شیعوں کے فرقوں کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم بعض دوسرے فرقوں کا بھی ذکر کرتے چلیں جن کے وجود پر اہل سنت مؤرخین نے بڑا زور دیا ہے۔

(۱) فرقہ کیسانیہ یہ لوگ محمد بن حنفیہ کی امامت کے قائل تھے جو امام حسنؑ و حسینؑ کے بعد امیر المومنینؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ بعض مؤلفین کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس فرقے میں دو طرح کے لوگ تھے ایک فرقہ قائل تھا کہ حضرت علیؑ کے بعد محمد بن حنفیہ ہی امام ہوئے حسنؑ و حسینؑ نے معاویہ و یزید سے جنگ کی تو انھیں کی اجازت سے دوسرا فرقہ قائل ہے کہ حسنؑ و حسینؑ کے بعد حقیقی امام یہی ہیں۔ (فرق الشیعہ نوبختی ص۲۲)

فرقہ کیسانیہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ محمد بن حنفیہ کی امامت کے تو قائل تھے ہی اسی کے

ساتھ اسکے بعد قائل کہ وہی مہدی منتظر ہیں وہ مرے نہیں نہ مریں گے اور عنقریب لوگوں میں پلٹ کر آئیں گے اور زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اُن کی ایک تیسری جماعت تو اور بھی حد سے گزر گئی اور ایسی باتیں ان کے متعلق کہیں جو انھیں کافر اور خارج عن الاسلام قرار دیتی ہیں۔ اس فرقہ کے لوگوں نے محمدؐ کی الوہیت کا اعلان کیا نیز یہ کہ انھوں نے حمزہ بربری کو نبی بنا کر لوگوں کی طرف بھیجا۔ اسی طرح اُن کا ایک فرقہ اس کا قائل ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے رضوی پہاڑ میں روپوش ہیں اور پہاڑی ہرن کا دودھ اُن کی غذا ہے۔ ان کی نگرانی کا فریضہ خدا نے درندوں کے سپرد کیا ہے جو اُن کے خروج تک اُن کی حفاظت کریں گے۔ اسی فرقہ سے سید اسمٰعیل حمیری تعلق رکھتے تھے۔

اسی فرقہ کی ایک جماعت نے جو محمد بن حنفیہ کی امامت کی قائل تھی۔ یہ دعویٰ کیا کہ محمد بن حنفیہ کے مرنے کے بعد امامت اُن کے بیٹے ابوہاشم عبداللہ بن محمد حنفیہ کی طرف منتقل ہوئی کچھ لوگوں نے ابوہاشم کے متعلق بھی اسی طرح غلو کیا جس طرح محمد بن حنفیہ کے متعلق کر چکے تھے انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ زندہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور یہی ابوہاشم وہ مہدی ہیں جن کی پیغمبر خدا کی حدیثوں میں بشارت دی گئی ہے۔

مگر ایک اور جماعت اُن کی یہ کہتی ہے کہ ابوہاشم کا انتقال ہو گیا اور امامت اُن کے بھائی علی ابن محمد بن حنفیہ کی طرف منتقل ہوئی اسی قسم کے اور بہت سے اقوال ہیں جو اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں نے فرقۂ کیسانیہ کی طرف منسوب کیے ہیں۔

ہمیں ان فرقوں کے اصل وجود ہی میں شک ہے۔ محمد بن حنفیہ کے متعلق یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے امامت کا دعویٰ کیا ہو یا کسی کو اس کی اجازت دی ہو کہ انھیں امام سمجھے وہ اپنے پدر بزرگوار امیرالمومنین سے ائمۂ طاہرین کے اسمائے گرامی بھی سُن چکے تھے اور ان کے اوصاف بھی۔

فرقۂ کیسانیہ کا نام کیسانیہ کیوں پڑا اس کی توجیہ میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ سب سے پہلے جو شخص محمد ابن حنفیہ کی امامت کا قائل ہوا وہ مختار بن ابی عبیدہ ثقفی تھے اور ان کا لقب کیسان تھا۔

اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ میں نے مختار کو امیرالمومنینؑ کے زانو پر بیٹھا دیکھا جبکہ وہ خورد سال بچے تھے امیرالمومنینؑ اُن کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے اور فرماتے یا کیّس اسی وقت سے اُن کا یہ نام پڑ گیا۔ اُن کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب امام حسینؑ کی طرف سے سفیر ہو کر مسلم ابن عقیل کوفہ آئے تو یہ مدد کرنے کے لیے کوفہ پہونچے۔ ابن زیاد نے انھیں قید کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ابن زیاد نے کئی مرتبہ مختار کو قتل کرنا چاہا مگر مختارؒ کے بہنوئی عبداللہ بن عمر نے یزید سے اُن کی سفارش کی یزید نے ابن زیاد کو خط لکھا اور حکم دیا کہ مختار کو رہا کر دیا جائے۔ مختارؒ کوفہ سے نکل کر حجاز پہونچے جہاں عبداللہ بن زبیر نے علم حکومت بلند کر رکھا تھا اور امام حسینؑ کے بعد وہ خلیفہ بننے کے خواب دیکھ رہے تھے اور بنی امیہ کے خلاف عوام کی اس ناراضی اور برہمی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو

جو امام حسینؑ اور اہل بیتؑ کی تباہی کے بعد عام طور پر پائی جاتی تھی مختار نے ابن زبیر کی اس شرط پر بیعت کر لی کہ وہ انھیں کوفہ کا حاکم مقرر کر دیں گے اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

یزید بن معاویہ کے مرنے پر مختارؒ پھر کوفہ پلٹ آئے اور دعویٰ کیا کہ میں محمد بن حنفیہ کا سفیر ہوں جو حسینؑ کے جائز وصی ہیں اور اُن کے انتقام کے حقیقی حقدار اور اُنھوں نے مجھے اپنا وزیر مقرر کیا ہے اور خون حسینؑ کا انتقام لینے پر مامور کیا ہے۔

کوفہ میں مختارؒ کو بہت سے ہمدرد مل گئے خصوصاً درمیانہ درجہ کے شیعوں نے اُن کی دعوت کو دل سے قبول کیا بہت سے لوگوں نے انتقام کے نام پر اُن کی بیعت کر لی اور اُن کے گرد سمٹ آئے مختار نے قاتلین حسینؑ میں سے ایک ایک شخص کی تلاش شروع کی اور جن جن لوگوں کو ابن زیاد نے مجبور کر کے حسینؑ سے لڑنے کیلئے بھیجا تھا اُنھیں چن چن کر قتل کیا اس بات پر شیعہ اُن کے مزید گرویدہ ہو گئے اور سب ہی ان کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔

مؤرخین مختارؒ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ مختار مدعی تھے کہ ملائکہ اُن کے پاس خبریں اور محمد بن حنفیہ کے احکام پہونچاتے ہیں مختارؒ نے تنہائی میں کبوتروں کو یہ عادت ڈالی تھی کہ وہ اپنے کان میں دانے بھر لیتے اور کبوتر اُن دانوں کو چبا کرتے جب کبوتر اسکے عادی ہو گئے تو وہ اُن کی نشست گاہ میں بھی پہونچنے لگے اور اُن کے کان کے گرد اڑا کرتے جیسا کہ اُنھوں نے ان کبوتروں کو سکھا رکھا تھا۔ مختارؒ لوگوں سے کہتے کہ ملائکہ سفید کبوتروں کی شکل میں میرے پاس آتے اور محمد بن حنفیہ کے احکام سناتے ہیں، اسی طرح کے اور بہت سے مکر و فریب کے ہتھکنڈے اور شعبدہ بازیاں مؤرخین نے اُن کی طرف منسوب کی ہیں۔

ایک دوسری وجہ مختار کے کیسان نام ہونے کی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ مختارؒ کی فوج کا سپہ سالار ابو عمرہ تھا جس کا نام کیسان تھا اور وہ قاتلین حسینؑ کا سخت ترین دشمن تھا اسی کے ساتھ محمد ابن حنفیہ کی امامت کا بھی قائل تھا اور مختارؒ کو اُن کا وصی قرار دیتا تھا مؤرخین نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ کیسان مدعی تھا کہ جبرئیل خدا کی طرف سے خبریں لے کر مختارؒ کے پاس آتے ہیں۔ (فرق نوبختی صـ۲۳ رجال کشی صـ۸۵)

ابو مظفر اسفرائنی اپنی کتاب التبصیر فی الدین میں لکھتے ہیں کہ فرقہ سبائیہ والوں نے مختارؒ کو فریب دیا اور انھیں دعوائے نبوت کرنے کی ترغیب دلائی جن دنوں مختارؒ اور مصعب میں معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں مصعب کے کچھ سپاہی مختارؒ کی فوج نے گرفتار کئے انھیں میں ایک شخص سراقہ بن مرداس بارقی تھا جب یہ مختارؒ کے پاس لایا گیا تو اس نے کہا تم نے ہمیں اپنی فوج سے شکست نہیں دی نہ تمھاری قوم نے ہمیں قید کیا اصل بات یہ ہے کہ ملائکہ نے آکر تمھاری اور تمھارے لشکر کی مدد کی اور انھیں ملائکہ نے ہمیں شکست دی اور قید کیا اس سراقہ نے مختارؒ سے معافی مانگی اور اُن ملائکہ کی قسم دی جو اُن کے لشکر میں تھے۔ مختارؒ نے معاف کر کے آزاد کر دیا۔ سراقہ نے مصعب کے پاس واپس پہونچکر مختارؒ کو مسخرہ و استہزا بھرے اشعار لکھ بھیجے۔

مؤرخین نے مختارؒ کی طرف اس بات کی بھی نسبت دی ہے کہ وہ بداء کے قائل تھے اور اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ مختار اپنے اصحاب کو کچھ باتوں کی خبر دیا کرتے اور دعوے کرتے کہ یہ آسمانی وحی ہے مگر جب وہ باتیں ظہور میں نہ آئیں تو کہتے کہ تمھارے پروردگار کو بداء واقع ہوا اور جس بات کی مجھے خبر دی تھی اس کا ارادہ بدل دیا۔ (تبصیر فی الدین ص۲۲، مذاہب اسلامیہ شیخ محمد ابوزہرہ ص۷۷، العراق فی ظل العھد الاموی ص۱۴۹)

پھر وہ اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔

یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب

محمد ابوزہرہ نے اپنی کتاب مذاہب اسلامیہ میں اس فرقہ کیسانیہ کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس فرقہ والے تناسخ کے قائل تھے یعنی روح کا ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں حلول کر جانا روح کے معذب ہونے کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک حیوان کے جسم سے نکل کر پست درجہ کے حیوان کے جسم میں منتقل ہو۔ جنت یہ کہ پست حیوان کے جسم سے نکل کر اونچے درجہ کے حیوان کے جسم میں جائے۔

حلول و تناسخ کا عقیدہ سب سے پہلے فرقہ حربیہ نے ظاہر کیا جو ابوالحسن اشعری کی گنتی کے مطابق گیارھواں فرقہ تھا۔ یہ لوگ عبداللہ بن عمرو بن حرب کے پیرو تھے اُن کا دعویٰ تھا کہ ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ نے اپنے بعد عبداللہ بن حرب کی امامت کی تصریح کی تھی اور ابو ہاشم کے مرنے پر اُن کی روح عبداللہ بن حرب کے جسم میں حلول کر گئی ابن حرب نے جب اس عقیدہ کا اعلان کیا تو اُسکے پیرو ں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر کی امامت کے قائل ہو گئے جو عقیدہ تناسخ و حلول اور اباحت محرمات کے عقیدہ کے موجد تھے۔

(مقالات الاسلامیین جلد ۱ ص۹۵، ۹۵، التبصیر فی الدین وغیرہ)

بہرحال جن لوگوں نے اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھی ہیں اُن کا اتفاق ہے اس بات پر کہ اس فرقہ کیسانیہ کا آغاز مختار ثقفی سے ہوا انھیں نے اس فرقہ کی ترویج کی اس کی طرف لوگوں کو بلایا اور [illegible] کے پردے میں شیعوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اُن کے طرفدار ہو جائیں۔

لیکن شیعوں کی کتابوں میں مختارؒ کے متعلق ان باتوں کا وجود نہیں جن باتوں کو اہل سنت نے اُنکے متعلق لکھا ہے ہر دلدادہ تحقیق چھان بین کر کے اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ مختارؒ کے متعلق جتنی باتیں کہی گئیں وہ سب بنی اُمیہ اور زبیریوں کی طبع زاد تھیں چونکہ مختارؒ نے ان دونوں سے ٹکر لی تھی اس لئے دونوں جماعتوں نے انھیں بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

سیاست۔ ہمیشہ تاریخ پر حاوی رہی ہے اور انھیں باتوں نے تاریخ میں جگہ پائی جنھیں سیاست کے بازیگروں نے پسند کیا۔ امویوں نے باقاعدہ تنخواہ دار علماء مقرر کر رکھے تھے جو اُن کے مخالفین کے متعلق

حدیثیں تصنیف کرتے انھیں ذلیل و خوار ثابت کرنے اور اُن کو انتہائی گھناؤنی شکل میں پیش کرنے کے لئے۔
سب سے بڑی بات یہ کہ مختارؒ جس زمانہ میں ہوئے اُس زمانہ میں تناسخ و حلول وغیرہ جیسے نظریات و افکار کا وجود بھی نہ تھا نہ اُس وقت عرب کا کوئی مسلمان یا کوئی دوسرا ہی شخص ان خیالات سے واقف تھا۔ کوفہ میں جو شیعیت کا گہوارہ تھا بہت سے ایسے لوگ سکونت رکھتے تھے جنھیں ائمہ طاہرینؑ سے دائمی وابستگی تھی ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے حضرت علیؑ کا زمانہ پایا آپ کی درسگاہ میں مدتوں اکتساب علم کرتے رہے۔ امیر المومنینؑ کے جو نظریات و خیالات دین اور اصول دین کے متعلق تھے وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں تھے۔ حضرت علیؑ پانچ برس تک منبر کوفہ پر ان نظریات و خیالات کو دہراتے رہے اور ابھی آپ کی وفات کو ۲۵ برس بھی نہیں ہوئے تھے (جبکہ مختارؒ کا ظہور ہوا) تو جب یہ حالت اندر کوفہ میں شیعوں کی اتنی کثرت تھی تو مختارؒ انھیں لوگوں کے درمیان نبوت اور وحی وغیرہ کے دعوے کیونکر کر سکتے تھے جن لوگوں نے مختارؒ کی حمایت کی تھی اور اُن کے گرد و سمٹ آئے تھے اُن میں سے کسی نے بھی اُن پر کوئی گرفت نہیں کی ان میں سے اکثر لوگ ولایت اہل بیتؑ کے عقیدہ کے حامل تھے بہت سے ایسے بھی تھے جو علیؑ کا زمانہ دیکھ چکے تھے اور علیؑ کی اولاد میں جو امام ہوئے اُن سے وابستہ و پیوستہ تھے ——— یہ ساری باتیں ان تمام روایتوں کو مشکوک بنا دیتی ہیں جو مختارؒ کے متعلق تاریخ وغیرہ کی کتابوں میں درج ہیں۔
سب سے بڑی بات یہ کہ مختارؒ کے زمانہ کے ائمہ طاہرینؑ سے جو روایتیں مروی ہیں وہ صریحی طور پر مختارؒ کو تمام اتہامات سے بری قرار دیتی ہیں چنانچہ عبد اللہ بن شریک سے مروی ہے کہ ہم لوگ بروز عید قربان امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا اتنے میں کوفہ کے ایک معمر شخص حاضر ہوئے اور چاہا کہ امامؑ کے ہاتھوں کو بوسہ دیں مگر امامؑ نے روک دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا میں مختارؒ کا فرزند ابو الحکم ہوں۔ یہ امام محمد باقرؑ سے دور تھے امام نے انھیں ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف گھسیٹا قریب تھا کہ اپنی گود میں بٹھا لیں حالانکہ پہلے آپ انھیں دست بوسی سے روک چکے تھے ابو الحکم نے کہا خدا حضور کا بھلا کرے لوگ میرے باپ (مختارؒ) کے متعلق بہت کچھ کہتے ہیں مگر صحیح بات وہی ہوگی جو آپ فرمائیں۔ امامؑ نے پوچھا لوگ کیا کہتے ہیں؟ ابو الحکم نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھے آپ مجھے جو حکم دیں گے میں قبول کر لوں گا۔ امامؑ نے فرمایا سبحان اللہ! مجھ سے میرے پدر بزرگوار نے فرمایا کہ میری ماں کا مہر مختارؒ کے بھیجے ہوئے روپے سے ادا کیا گیا۔ کیا مختارؒ نے ہمارے گھر نہیں تعمیر کئے ہمارے قاتلوں کو قتل نہیں کیا ہمارے انتقام کے طالب نہیں ہوئے؟ خدا اُن پر رحم کرے۔ امام محمد باقرؑ نے دو مرتبہ فرمایا خدا تمھارے باپ پر رحم کرے، خدا تمھارے باپ پر رحم کرے۔ ہمارا حق وصول کر کے رہے ہمارے قاتلوں کو قتل کیا اور ہمارا انتقام لیا۔
عمر بن علی ابن الحسین کی روایت میں ہے کہ جب امام زین العابدینؑ کے پاس عبید اللہ ابن زیاد

اور عمر ابن سعد کے سر پہونچے تو آپ سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا اُس خدا کا شکر جس نے میرے دشمنوں سے میرا انتقام لیا خدا جزائے خیر دے مختارؒ کو۔

ابن ابی عمر۔ ہشام مثنی سے اُس نے سدیر سے روایت کی ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا مختار کو بُرا نہ کہو انھوں نے ہمارے قاتلوں کو قتل کیا ہمارے انتقام کے طلبگار ہوئے ہماری بیوہ عورتوں کی تزویج کی اور جبکہ ہم ضرورت مند تھے ہم میں مال تقسیم کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مختارؒ ویسے ہی ہوتے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو اُن کا حال امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ سے ہرگز مخفی نہ رہتا کیونکہ ان دونوں اماموں کے کوفہ والوں سے مستقل تعلقات تھے جو مرکز تھا مختارؒ کا وہاں ایسے شیعہ آباد تھے جو ہر شرعی مسئلہ میں امامؑ کی طرف رجوع کرتے۔ مختار کے ظہور کے زمانہ میں امام زین العابدینؑ کوفہ کے حالات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور برابر وہاں کی خبریں دریافت کرتے رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ اُس وقت سے جبکہ تحریک مختار کی آگ پوری طرح بھڑک اُٹھی تھی کیونکہ تحریک آپ کے پدر بزرگوار کے قاتلوں اور آپ کے دشمنوں سے انتقام لینے ہی کیلئے چلائی گئی تھی اس صورت حال کی بنا پر نا ممکن تھا کہ اُن کا حال امام زین العابدینؑ سے پوشیدہ رہتا اگر مختارؒ ویسے ہی ہوتے جیسا کہ اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں نے نیز بعض مورخین نے بیان کیا ہے تو یقینی طور پر یہ اسلام سے خارج اور اصول وضروریات اسلام کے منکر قرار پاتے اور نا ممکن تھا کہ ایسے شخص کے لیے امام دعائے رحمت فرمائیں اپنی صحبتوں میں مدح وستائش کریں۔ تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نا ممکن ہے کہ کسی امام نے محض اپنی مصلحت کی بنا پر کسی دشمن اسلام سے بے تعلقی نہ ظاہر کی ہو۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مختارؒ نے شیعوں کی جمعیت کو اپنا طرفدار بنانے کے لیے یہ اعلان کیا ہو کہ محمد بن حنفیہ نے مجھے قاتلین حسینؑ سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے کوفہ میں شیعوں کی بہت بڑی آبادی رہ چکی تھی اور سبھی کو معلوم تھا کہ محمد ابن حنفیہ کی کیا علمی وجاہت اور دینی منزلت ہے۔ وہ علی ابن ابی طالبؑ کی زبان سے محمد کی مدح وستائش بھی سُن چکے تھے مختارؒ اس وقت اعوان وانصار کے بہت زیادہ محتاج تھے تاکہ وہ کسی طرح اپنے منصوبۂ انتقام حسینؑ کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھ کر کہ ابن زبیر نے حجاز میں علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اُن کے مبلغین ہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوفہ میں بھی آ گئے ہیں جو مختارؒ کا شہر تھا۔ اور جو بہ نسبت دیگر اسلامی شہروں کے ہر اُس شخص کا بہت جلد طرفدار ہو جاتا تھا جو علم بغاوت بلند کر دے۔ خصوصیت کے ساتھ وہاں کے شیعہ جو ہر باغی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے تاکہ کسی طرح بنی امیہ اور قاتلین حسینؑ سے انکو خلاصی حاصل ہو۔

اس کی تائید مسعودی کی مروج الذہب کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب مختارؒ امام زین العابدینؑ کی طرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے محمد بن حنفیہ سے درخواست کی کہ ہم انتقام حسینؑ کے لیے جو

اُٹھنا چاہتے ہیں اُس میں ہماری تائید کیجیئے اور اس کی بھی اجازت چاہی کہ کوفہ والوں سے آپ کے لیئے بیعت لوں۔ عبداللہ بن عباس نے محمد بن حنفیہ کو مشورہ دیا کہ آپ کھل کر مختارؒ پر نکتہ چینی اور اعتراض نہ کیجیئے۔ ابن زبیر اپنے دل میں اہلبیتؑ کی جو عداوت و عناد چھپائے ہوئے تھے ابن عباس نے اس کا بھی ذکر کیا اور زور دیا کہ مختارؒ کو دوست بنائے رکھیئے تاکہ اگر ابن زبیر اہلبیتؑ کے درپے آزار ہوں تو مختارؒ سے مدد مل سکے شیعوں کیساتھ ہو جانے اور کوفہ کے اکثر باشندوں کے طرفدار ہو جانیکی وجہ سے مختارؒ کے لیئے قاتلین حسینؑ سے انتقام لینا آسان ہو گیا۔

جب ابن زبیر نے مکہ میں خروج کیا اور اُن کا اقتدار قائم ہو گیا تو ابن حنفیہ اور دیگر بنی ہاشم اُن کی بیعت سے کنارہ کش رہے ابن زبیر اُن لوگوں کے پیچھے پڑ گئے اُن کو مکہ کی گھاٹیوں میں مقید کر دیا اور لکڑیاں اکٹھا کیں کہ اگر اب بھی یہ لوگ بیعت نہ کرنے پر اڑے رہیں تو انھیں زندہ جلا دیا جائے۔ مختارؒ کو ابن زبیر کی ان کارروائیوں کا علم ہوا انھوں نے چار ہزار کا لشکر تیار کر کے ابو عبداللہ جدلی کی قیادت میں مکہ روانہ کیا اور تاکید کی کہ فوراً وہاں پہونچو قبل اس کے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ ابن زبیر کو خبر بھی نہ ہونے پائی اور یہ لشکر اُن کے سر پر پہونچ گیا اور اُنھوں نے خانۂ کعبہ میں بھاگ کر جان بچائی۔ جب اس لشکر نے بنی ہاشم کو حصار سے باہر نکال لیا تو اُن کا ارادہ ہوا کہ ابن زبیر اور اُن کے ساتھیوں کا کام ہی تمام کر دیا جائے مگر ابن حنفیہ نے اجازت نہ دی اور خود مکہ سے شہر ایلہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں لوگوں سے الگ تھلگ مقیم رہے یہاں تک کہ ابن زبیر مارے گئے۔ (مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۹۸ و ۹۹ و ۱۰۰)

ان واقعات سے ایک جویائے تحقیق کو اُس وقت کی سیاسی صورت حال پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے نیز یہ کہ جس نے بھی حکومت کی طمع کی اُس نے بنی ہاشم سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی

ابن زبیر نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ بنی ہاشم اُن کے طرفدار ہو جائیں اور آخر دھمکیوں پر اُتر آئے کہ اگر ہمارے طرفدار نہ ہوئے تو ہم انھیں ہولناک ترین سزائیں دینگے دوسری طرف مختارؒ منبر پر علی الاعلان کہتے ہیں کہ بنی ہاشم ہماری انقلابی تحریک کے پورے پورے مؤید ہیں وہ محمد بن حنفیہ کے سکوت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور محمد بن حنفیہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان افواہوں کے مقابلہ میں سکوت سے کام لیں جو مختارؒ نے پھیلائی تھیں اس لیئے کہ مختار کی تحریک کی غرض و غایت قاتلین حسینؑ سے انتقام کی تھی اور قاتلین حسینؑ سے انتقام علویوں کی سب سے بڑی مراد تھی جن کے کلیجے ابتک شہادت حسینؑ کے سبب خوں تھے اور جو ایک طویل عرصہ تک زندگی کے مزے سے محروم رہے۔

مختصر یہ کہ محمد بن حنفیہ جن کی طرف یہ فرقہ کیسانیہ منسوب کیا جاتا ہے خود انھوں نے ہرگز امامت کا دعویٰ نہیں کیا تاریخ میں اسکا ذکر ملتا ہے کہ اُنھوں نے امامت میں کبھی نزاع کی بس زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُنھوں نے مختارؒ کی علانیہ مخالفت نہیں کی نہ اُن سے خصومت برتی ان اسباب کے تحت جن کی طرف مسعودی کی روایت اشارہ کرتی ہو۔ رہ گئے مختار تو ممکن ہے انھوں نے اپنے متعلق بعض دعوے کیئے ہوں جیسا کہ فرق و مذاہب کے حالات

لکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام و امام محمد باقر علیہ السلام سے اُن کے متعلق جو مدح و ستائش کے الفاظ منقول ہیں ان حضرات نے اُن کے متعلق جو دعائے رحمت فرمائی ہے وہ صریحی طور پر انھیں ان تہمتوں سے پاک و صاف قرار دیتی ہیں اس لیئے کہ ائمہ اہل بیتؑ نے ان اسلامی فرقوں کے متعلق جنکا انداز فکر اصول و فروع اسلام کے مخالف تھا جس طرح بے لاگ اپنے خیالات کا اظہار کیا وہ سب کو معلوم ہے انھوں نے کسی بھی مخالف اسلام کی طرف سے چشم پوشی جائز نہیں سمجھی۔

رہ گئی مروج الذہب مسعودی کی وہ روایت کہ مختارؒ نے امام زین العابدینؑ کو خط لکھا کہ میں کوفہ والوں سے آپ کے لیئے بیعت لینا چاہتا ہوں اور امامؑ نے صاف صاف انکار کر دیا مختارؒ اور اُن کی تحریک پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور اپنے چچا محمد بن حنفیہ کو مشورہ دیا کہ آپ مختارؒ سے نرمی نہ برتیں اور نہ اُن کے لیئے کوئی گنجائش چھوڑیں کہ وہ لوگوں کو آپ کی طرف دعوت دیں۔ (مروج الذہب جلد [illegible])

یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے اس بات کا ہرگز ثبوت نہیں ملتا کہ مختارؒ فاسد عقائد رکھتے تھے جیسا کہ مورخین اور اسلامی فرقوں کے متعلق لکھنے والوں نے دعویٰ کیا ہے ہو سکتا ہے کہ مختارؒ نے پیشکش امام زین العابدینؑ کو کی ہو اور آپ نے یہ پیشکش نامنظور کر دی ہو کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ کوفہ والوں کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں ان کی اصل حقیقت امامؑ کے پیشِ نظر تھی اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ کس طرح کوفہ والوں نے آپ کے جد بزرگوار علی ابن ابی طالبؑ اور آپ کے عم بزرگوار امام حسنؑ کی مدد سے پہلو تہی کی اور کربلا میں بجائے امام حسینؑ کے ساتھ ہونے کے بنی اُمیہ کے ساتھ ہو گئے مزید برآں بنی اُمیہ کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا وہ واقعات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے، عراق پر حملہ کرنے اور اپنے مخالفین سے انتقام لینے کی تیاریاں جاری تھیں، دوسرے دشمن ابن زبیر تھے جنھوں نے حجاز میں سر اُٹھایا تھا اپنے مبلغین شہروں میں پھیلا رکھے تھے اور اُن کا خطرہ بنی اُمیہ کے خطرے سے کسی طرح کم نہ تھا۔

ان حالات و واقعات نے امامؑ کو مجبور کیا کہ آپ مختارؒ کے بارے میں بے تعلقی کا موقف اختیار کریں مصلحت بھی یہی کہتی تھی اور دوراندیشی کا بھی یہی تقاضا تھا۔ ہماری غرض یہاں مختارؒ کی طرف سے مدافعت کرنے کی نہیں، نہ ہم اُن کے لیئے عذر اکٹھا کرنا چاہتے ہیں، نہ ہم فرقہ کیسانیہ کے وجود ہی کو مشکوک قرار دینا چاہتے ہیں۔ ہم تو صرف محمد بن حنفیہ کی پوزیشن صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ آپ کو اُن فرقوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ فرقے آپ کے زمانہ میں موجود بھی نہ تھے اور اگر اُس زمانہ میں اُن کا وجود صحیح بھی ہو تو یقیناً یہ فرقے آپ کی وفات کے بعد عالم وجود میں آئے۔ شیعوں کا موقف بھی ان فرقوں کے متعلق ٹھیک وہی ہے جو دیگر مسلمانوں کا کہ یہ لوگ گمراہ اور گمراہ کرنے والے تھے۔ یہ لوگ اصولِ اسلام سے منحرف تھے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے تھے۔

شیعوں کا دوسرا فرقہ زیدیہ ہے یہ لوگ ہیں جو زید بن علی ابن الحسین ؑ کی امامت کے قائل ہیں۔ اس فرقہ کی نشو و نما اس زمانہ میں ہوئی جب کہ جناب زید کا چرچا عام اور اُن کی شہرت ہمہ گیر ہوئی، اُن کا شمار اعلام و اکابر مسلمین اور اُن رہنمایان اسلام میں کیا جانے لگا جنھوں نے اصلاح معاشرہ کی غیر معمولی جد و جہد کی اس فرقہ کے قائدین نے اسلامی حکومتوں کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔ بیسیوں اسلامی فرقوں کی طرح آج بھی یہ فرقہ زندہ ہے۔ اور یمن کے باشندوں کی اکثریت اسی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اولین بنیاد جس پر اس فرقہ کی عمارت قائم ہوئی یہ عقیدہ ہے کہ

امامت اولاد علی ؑ میں بس اسی سے مخصوص ہے جو تلوار بلند کرے۔

اس مذہب کے کچھ اور بھی اصول اور خصوصی مسائل ہیں جن کی طرف ہم آگے چل کر اشارہ کریں گے۔

جناب زید کے خروج کا سبب وہ مصائب و آلام تھے جن کا عام طور پر اُس وقت کے مسلمانوں کو سامنا تھا۔ بنی اُمیّہ نے جو ظلم جبر و تشدّد اور مقدسات اسلامیہ کی بے حرمتی کی انتہا کر دی تھی اُن کی ظالمانہ سیاست کا سب سے بڑا نشانہ شیعہ تھے، قتل و غارت، قید و بند تخویف و تہدید نے سب کی جان عذاب میں کر رکھی تھی، کسی کو بھی اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی طرف سے اطمینان نہ تھا ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں خالد بن عبد اللہ قسری عراق کا گورنر مقرر ہوا اُس نے عراق کے شیعوں کے ساتھ کوئی خاص سختی نہیں برتی۔ یوسف بن عمر ثقفی نے ہشام سے خالد کے اس رویہ کی شکایت کی خصوصیت کے ساتھ اُس نرمی کی جو اُس نے اہل بیت ؑ او بنی ہاشم سے روا رکھی اُس نے اپنے خط میں ہشام کو لکھا۔

وہ بنی ہاشم بھوک سے مر رہے تھے، اپنے بال بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے ہی پر اُن کی

ساری توجہ مرکوز تھی۔ خالد نے انھیں روپے پیسے دے کر موٹا کر دیا ہے اور اب وہ خلافت کی طرف تکنے لگے ہیں۔"

ہشام نے فوراً ہی خالد کو معزول کر دیا اور یوسف بن عمرو کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اُس نے شیعوں کو ستانے پریشان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور جس کسی کو بنی ہاشم کا ہمدرد دیکھا اُس کو واسطے کے قید خانہ میں بند کر دیا۔ (العراق فی ظل العہد الاموی صفحہ ۱۱۴ و ۱۱۵)

اس پر شیعوں کی ناراضی اور بڑھی اور وہ پہلے سے زیادہ اُن کے دشمن ہو گئے۔ اسی ذلت و اہانت، اور جبر و تشدد سے بھری فضا میں جناب زید کی زندگی گزری۔ بنی اُمیہ کے مظالم کا خصوصی نشانہ بنے رہے جب اُنھوں نے محسوس کیا کہ کسی طرح اُن کی جان نہ بچ سکے گی بنی اُمیہ اُن کا کام تمام ہی کر کے رہیں گے چاہے اُس میں جتنی بھی دشواریاں پیش آئیں۔ اُنھوں نے ذلت و رسوائی اور خطروں میں گھری ہوئی زندگی بسر کرنے پر تلوار کے سایہ تلے جان دے دینے کو زیادہ بہتر سمجھا۔

اسی ہولناک فضا میں جس میں جناب زید کی زندگی گزر رہی تھی یوسف بن عمر ثقفی نے ہشام بن حکم کو خط لکھا کہ خالد قسری سابق گورنر عراق نے ۶ لاکھ درہم زید کے پاس رکھ چھوڑے ہیں اور زید اُس سے انکاری ہیں۔ ہشام نے فوراً حاکم مدینہ کو خط لکھا کہ زید کو میرے پاس بھیج دو۔ جناب زید جب ہشام کے پاس پہونچے تو آپ نے یوسف ثقفی کے دعوے کی تردید کی، اور کہا کہ مجھے ایسی کسی رقم کا علم نہیں۔ ہشام نے کہا کہ بہتر ہے آپ یوسف کے پاس عراق جا کر اپنی صفائی پیش کریں۔ جناب زید نے انکار کر دیا۔ اور سمجھ گئے کہ یہ میرے لیے جال پھیلایا جا رہا ہے، سازش کی جا رہی ہے کہ عراق پہونچ جاؤں اور یوسف مجھ پر قابو حاصل کر کے مجھے اپنے مظالم کا نشانہ بنائے۔ ہشام اپنی بات پر مُصر رہا اور اُس میں اور جناب زید میں عرصہ تک ردّ و کد ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ اس ہشام نے جناب زید سے کہا۔ مجھے معلوم ہوا ہے تم خلافت کی خواہش رکھتے ہو حالانکہ تم کنیز کے فرزند ہو۔ جناب زید نے اس کی ناراضی و برہمی سے انتہائی بے پروا ہو کر جواب دیا اُن کی لونڈی ہونے سے لڑکوں کی عزت و جلالت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اگر ایسا ہوتا تو حضرت اسمٰعیل پیغمبر کا درجہ بھی حقیر ہوتا کیونکہ اُن کی ماں بھی لونڈی تھیں انھیں اسمٰعیلؑ سے آج سارا عرب ہے اور اسی عرب میں حضرت سرورِ کائناتؐ کی ذات بھی ہے، پھر آپ نے اسے وعظ و نصیحت کرنا شروع کی کہ خدا سے ڈرو اور بندگانِ خدا سے نرمی برتو۔ ہشام نے فرعونیت سے کہا۔ تمہارے ایسا آدمی بھی میرے ایسے بادشاہ کو خدا سے ڈرنے کے لیے کہہ سکتا ہے؟ زید نے کہا جو شخص بھی کسی کو خدا سے ڈرنے کے لیے کہتا ہے اس سے بڑا کون شخص بن سکتا ہے اور اُس شخص سے بھی بُرا کون ہوگا جس کو لوگ خدا سے ڈرنے کو کہیں۔

پھر آپ اس کے یہاں سے چل کر عراق کی طرف روانہ ہوئے اور یہ طے کر کے کہ اب ہشام سے ایک لشکر جرار کے ساتھ ہی ملاقات کروں گا۔ یہ فطری بات ہے کہ آپ کے حالات سے کوفہ والے لاعلم نہ رہے

ہوں گے وہاں کوفہ میں جب آپ پہونچے تو یوسف بن عمر نے پھر اسی مال کا مطالبہ کیا جو اس کے دعوے کے مطابق خالد قسری آپ کے حوالے کر گیا تھا اس نے آپ کے ساتھ ہر ممکن بدسلوکی کی وہ آپ کو قتل کرنے میں بھی کوتاہی نہ کرتا مگر ہشام نے یوسف کو اس کی ممانعت کر رکھی تھی۔ آپ نے وہاں سے مدینہ واپس جانا چاہا۔ کوفہ والوں نے آپ سے فریادکی بنی امیہ سے جنگ کرنے کا آپ سے عہد و پیمان کیا ساری آبادی آپ کے گرد سمٹ آئی اور بقول مقریزی ۱۴ ہزار آدمیوں نے آپ کی بیعت کرلی۔ روض نضیر جلد اول ۵۰ پر درج روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ۸۰ ہزار آدمیوں نے بیعت کی تھی۔

علامہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں اور ابن قتیبہ عیون الاخبار میں بیان کرتے ہیں کہ جب جناب زید حاکم مدینہ کی شکایت لے کر ہشام کے پاس پہونچے ہشام نے ان کے ساتھ بہت اہانت آمیز برتاؤ کیا کئی دن تک تو دربار میں آنے کی اجازت ہی نہ دی اور جس دن اجازت دی اس دن اپنے ہم نشینوں کو اشارہ کیا کہ انھیں بیٹھنے کی جگہ نہ دینا۔ جب زید دربار میں پہونچے ہشام نے ان سے پوچھا تمہارے بقرہ بھائی کا کیا حال ہے، مراد اس کی امام محمد باقرؑ سے تھی۔ زید نے جواب دیا خود رسول اللہ نے ان کا نام باقر رکھا اور تم انھیں بقرہ کہہ کر پکارتے ہو کتنا فرق و اختلاف ان میں اور تم میں ہے اور خبر کی قسم تم آخرت میں بھی اسی طرح ان کے برخلاف رہو گے جس طرح دنیا میں رہے تم جہنم میں جاؤ گے اور وہ جنت میں۔ ہشام نے نوکروں کو حکم دیا انھیں یہاں سے نکال دو۔ آپ یہ کہتے ہوئے نکلے جس نے بھی تلوار کی آنچ سے کراہت کی وہ ذلیل ہوا۔ جناب زید کوفہ چلے آئے ان کے آنے پر کوفہ کے سب ہی باشندے ان کے پاس اکٹھا ہوئے اور انھیں فریب دیا کہ ہم آپ کی ہر طرح مدد کریں گے اور ہر ممکن قربانی دیں گے خواہ کچھ بھی نتیجہ نکلے۔ کوفہ کے باشندوں کے ساتھ بہت سے علماء و فقہاء نے بھی ان کے ہاتھوں پر بیعت کی جن میں امام ابوحنیفہ بھی تھے ان سے مالی امداد کا وعدہ کیا اور لوگوں کو ترغیب دی کہ زید کے ساتھ خروج کریں۔

ابوحنیفہ کا یہ فقرہ بھی کتابوں میں ملتا ہے:۔

"ان کا خروج بالکل ویسا ہی ہے جیسے غزوۂ بدر کے لئے پیغمبرؐ کا نکلنا۔"

(مناقب ابی حنیفہ جلد ۱ ص۲۵۵)

لوگوں نے زید کی بیعت جیسا کہ طبری نے تصویر کشی کی ہے کتاب و سنت اور ظالموں سے جہاد کرنے پر کی اور یہ کہ کمزوروں کی پشت پناہی کی جائیگی کسی کو محروم نہ رہنے دیا جائے گا مسلمانوں میں مال خراج برابر برابر تقسیم ہوگا جن لوگوں پر زیادتیاں کی گئی ہیں ان کی تلافی کی جائے گی۔ جو شخص ان باتوں میں موافقت کرتا زید اس سے قول و قرار لیتے اور اس کی بیعت قبول کرتے۔

تاریخیں بتاتی ہیں یوسف بن عمر ثقفی نے اپنے ابن عم حجاج بن یوسف کی یاد تازہ کر دی اور اہل بیتؑ اور شیعوں کے ساتھ ویسی ہی بدسلوکی کی جیسے حجاج کر چکا تھا۔

اس کی تائید ہشام کے نام اس کے اس خط سے ہوتی ہے جس میں اس نے گورنر عراق خالد قسری کی شکایت کی تھی اور لکھا تھا کہ خالد کوفہ والوں سے نرمی کا برتاؤ کرتا ہے۔ اسی خط کے نتیجہ میں ہشام نے خالد کو فوراً معزول کر کے اس کی جگہ یوسف کو گورنر مقرر کر دیا اور زید نے امویوں کے خلاف اس وقت تک خروج نہیں کیا جبتک انھیں یقین نہ ہو گیا کہ یوسف ہم پر قابو حاصل کرنے کے لئے جال پھیلا رہا ہے۔ ہشام نے جب زید سے کہا تھا کہ آپ جا کر یوسف سے ملئے تو آپ نے کہا تھا اگر تم مجھے وہاں مجبور کر کے بھیجو گے تو پھر مجھے زندہ نہ دیکھو گے آخر کار انھیں دو ہی راستے نظر آئے یا تو وہ ذلت کی زندگی بسر کریں کوفہ کے قبائل میں چھپتے پھریں آج ایک قبیلہ کی پناہ میں رہیں کل دوسرے قبیلہ کی اور ہر وقت حکام کی غداری کا دھڑکا لگا رہے یا یہ کہ ان حکام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے نظریات کا صریحی اعلان کر دیں خواہ کچھ بھی نتیجہ ہو آپ نے ظالموں کے ساتھ رہ کر ذلت کی زندگی بسر کرنے کو ٹھکرا دیا اور یہ فقرہ فرمایا جو ضرب المثل بن چکا ہے کہ

ما احب امرء الحیاۃ الا ذل جس شخص نے بھی زندگی سے پیار کیا وہ ذلیل ہو۔

ائمہ اہل بیتؑ سے جو صحیح و مستند روایتیں مروی ہیں وہ بھی صراحۃً بتاتی ہیں کہ جناب زید نے ہرگز امامت کا دعویٰ نہیں کیا اُن کا مطمح نظر محض یہ تھا کہ ظالموں کے ظلم اور سرکشی سے گلو خلاصی ہو۔ کسی نے فضیل الرسان سے روایت کی ہے وہ بیان کرتا ہے کہ

"میں جناب زید کی شہادت کے بعد امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا امام نے فرمایا فضیل میرے چچا زید بن علی شہید کر ڈالے گئے میں نے عرض کی جی ہاں! میری جان آپ پر قربان! آپ نے فرمایا خداوند عالم اُن پر رحمتیں نازل فرمائے وہ مومن تھے بامعرفت تھے عالم اور صدوق تھے اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ایفائے وعدہ کرتے اگر حکومت اُن کے ہاتھوں میں آجاتی تو وہ بخوبی آگاہ تھے کہ کن ہاتھوں میں سونپیں۔"

بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب امام جعفر صادقؑ کو اپنے چچا زید کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے گریہ فرمایا اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہا اور فرمایا اللہ رحم کرے میرے چچا زید پر وہ دین و دنیا دونوں میں ہمارے بہترین چچا تھے وہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے جس طرح وہ مومنین جنھوں نے پیغمبر خدا علی مرتضیٰ اور امام حسینؑ کی رفاقت میں جانیں دیں۔

عیص بن قاسم امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتا ہے کہ امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا یہ نہ کہو کہ زید نے خروج کیا زید عالم تھے صدوق تھے انہوں نے اپنی طرف تمہیں دعوت نہیں دی اُنھوں نے رضائے آل محمد کی طرف دعوت دی تھی اگر کامیاب ہو جاتے تو یقیناً ان باتوں کو پورا کرتے جنکی طرف انھوں نے تمہیں دعوت دی تھی۔

امام علی رضاؑ نے مامون سے جناب زید کی مدح و ستائش کرتے ہوئے فرمایا۔

"وہ علمائے آل محمد سے تھے خدا کے لئے غضبناک ہوئے اور دشمنان خدا سے انھوں نے جہاد کیا یہاں تک کہ راہ خدا میں شہید ہوگئے۔"

مامون نے کہا اے ابوالحسن! دعوے امامت کرنے والوں کے متعلق جو حدیثیں پیغمبر کی وارد ہوئی ہیں انھیں تو آپ جانتے ہی ہیں آپ نے فرمایا زید نے ہرگز کسی ایسی چیز کا دعویٰ نہیں کیا جو اُن کے لئے جائز نہ ہوتی وہ اس بارے میں حد سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے تھے انھوں نے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کو رضائے آلِ محمدؐ کی طرف بلاتا ہوں زید اُن لوگوں میں سے تھے جنھیں اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے۔

وجاھدوا فی سبیل اللہ حق جھادہ ھو اجتباکم — خدا کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ حق ہے جہاد کرنے کا اسی نے تمہیں منتخب کیا۔

زید کے فرزند یحییٰ نے بھی اسی پر زور دیا تھا یحییٰ اور کسی شیعہ میں گفتگو ہو رہی تھی یحییٰ نے کہا میرے پدر بزرگوار کو زیادہ اس بات کی سمجھ تھی کہ وہ ایسی بات کا دعویٰ کریں جس کا دعویٰ انھیں زیب نہیں دیتا انھوں نے صرف یہ کہا تھا۔

"میں تمہیں رضائے آل محمد کی طرف دعوت دیتا ہوں۔"

اُن کی مراد میرے چچا امام جعفر صادقؑ سے تھی۔

جناب زید کے حالات تمام علمائے شیعہ نے لکھے ہیں متقدمین نے بھی اور متاخرین نے بھی سبھی نے اُن کے زہد و ورع خیر و صلاح علم و عمل کی تعریف کی ہے اور اُن کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دعوائے امامت کیا تھا اس کی صریحی لفظوں میں تردید کی ہو کہ سبھی کا اس پر اتفاق ہے کہ انھوں نے رضائے آلِ محمدؐ کی طرف دعوت دی اور اُن کی مراد امام جعفر صادقؑ کی ذات تھی۔

علی بن محمد خزاز اپنی کتاب کفایۃ الاثر میں لکھتے ہیں۔

"جناب زید کا صلاح و تقویٰ خاص و عام میں مشہور ہے اُن کا خروج امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تھا انہوں نے اپنے بھتیجے امام جعفر صادق سے امامت میں اختلاف نہیں کیا تھا اختلاف اُن کے بعض پیرو ان کا جنم دیا ہوا ہے جنھیں یہ وہم ہوا کہ امامت اسی کا حق ہے جو تلوار علم کر کے خروج کرے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے لیکن جو شخص گھر میں بیٹھ رہے اس کا دروازہ بند کرلے وہ لوگوں کا امام نہیں ہوسکتا۔"

بہت سے مورخین پہلے زمانہ کے بھی اور بعد کے بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ زید نے خود اپنی امامت کا دعویٰ کیا ان مورخین نے یہ نظریہ اس مذہب زیدیہ کے مبلغوں کی بنا پر قائم کیا جو جناب زید کی وفات کے نصف صدی بعد عالم وجود میں آیا۔ ان مورخین نے جناب زید کی طرف یہ نظریہ منسوب کیا ہے کہ خلافت خاندانی میراث نہیں یا بطور میراث کوئی خلافت نہیں پاتا پیغمبر خدا نے حضرت علی کے اوصاف ذکر کیے ان کی امامت کی صراحت کی نہ کہ نام لیکر اور کوئی شخص اس وقت تک امام نہیں ہوسکتا جب تک اپنی طرف دعوت دیتا ہوا خروج نہ کرے۔

ان مورخین نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ زید نے کوفہ میں جس صورت سے بیعت لی اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ

وہ اپنے کو امام سمجھتے تھے کیونکہ انھوں نے کتاب خدا، مظلوموں کے ساتھ انصاف، مالی محصولات کی تقسیم، رد مظالم وغیرہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی تھی اور یہ سب امام شرعی کے فرائض میں داخل ہیں۔

ہم اوپر جناب زید کے ہم عصر ائمہؑ کے اقوال جناب زید کے متعلق نقل کر چکے ہیں ان اقوال سے ان مورخین کے اس قول کی پوری طرح تردید ہو جاتی ہے کہ جناب زید طالب امامت تھے اسی کے ساتھ اگر ہم اُن حقائق کو بھی شامل کر لیں کہ بنی امیہ کے حکام جناب زید کے درپے ایذا تھے زید کو نہ حجاز میں ٹکنے دیا جاتا نہ عراق میں۔ شیعہ اور سادات علویین پر یوسف بن عمرو ثقفی نے جبر و تشدد قید و بند کی انتہا کر دی تھی تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جناب زید کی تحریک محض ان حکومتوں سے نجات پانے کے لئے تھی جنھوں نے مظلوموں کو مردہ اور بدعتوں کو زندہ کر رکھا تھا اور لوگوں کے لئے ارتکاب جرائم و منکرات میں ڈھیل دے رکھی تھی۔

بعض روایتوں میں جناب زید سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ

میں نے ہشام کے دربار میں یہ منظر دیکھا کہ رسول اللہ کو گالیاں دی جا رہی ہیں مگر ہشام نے اس پر کسی خفگی کا اظہار کیا نہ برہمی کا خدا کی قسم اگر میں اکیلا ہی ہوتا کوئی بھی میرا ساتھ نہ دیتا تب بھی میں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے سے باز نہ رہتا (سفینۃ البحار شیخ عباس القمی جلد ا ص ۵۷۷)

ہم نے اس بیعت کی لفظیں بھی اوپر ذکر کر دی ہیں جو جناب زید نے لوگوں سے لی تھی اس میں ایک لفظ بھی ایسی نہیں جس سے ثبوت مل سکے کہ زید خلافت کے طلبگار تھے ان لفظوں سے زیادہ سے زیادہ یہی نکلتا ہے کہ وہ بنی اُمیہ کو اقتدار سے محروم کر دینا چاہتے تھے۔

سب سے بڑا ثبوت اس بات کا کہ زید امامت کے طلبگار نہ تھے یحییٰ ابن زید کی وہ لفظیں ہیں جو انھوں نے متوکل بن ہارون سے کہیں۔

"میرے پدر بزرگوار امام نہ تھے البتہ وہ معززین سادات اور اُن کے زاہدوں میں تھے وہ اس بات کی زیادہ سمجھ رکھتے تھے کہ ایسی امامت کا دعویٰ کریں جس کے وہ حقدار نہیں انھوں نے لوگوں کو رضائے آل محمدؐ کی طرف دعوت دی اور اُن کی مراد ہمارے ابن عم جعفر صادقؑ سے تھی۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ شیعہ اور بعض فقہائے مسلمین زید کی امامت کے قائل تھے اور بنی اُمیہ کے خلاف خروج کرنے میں اُن کے ہمخیال تھے لیکن یہ کہ خود جناب زید نے امامت کا دعویٰ کیا ہو اور اسی امامت کے حصول کے لئے انھوں نے بنی اُمیہ کے خلاف خروج کیا اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جناب زید کے اوصاف و کمالات اور اُن کی صلاحیتوں نے زید کے کچھ ایسے عقیدت مند پیدا کر دیئے جنھوں نے ائمہ اہل بیتؑ کی صف میں زید کو بھی لا کھڑا کیا۔ ابن ابی لیلیٰ جو اس زمانہ کے مشہور فقیہ اور اکابر علمائے اہل سنت سے تھے زید کے متعلق فرماتے ہیں۔

"مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ کوفہ والے اسی طرح زید کے ساتھ غداری کریں گے جس طرح اُن کے بزرگوں کے ساتھ کر چکے تھے تو یقیناً میں بھی اُن کی معیت میں جہاد کرتا کیونکہ زید امام برحق تھے۔"

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں :۔

"میں نے جناب زید سے بڑھ کر ان کے زمانہ میں کسی کو فقیہ و اعلم حاضر جواب اور واضح بات کہنے والا نہیں پایا وہ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔"

سفیان ثوری جو علم حدیث میں مشہور شخصیت کے مالک گزرے ہیں زید کا جب ذکر کرتے تو رونے لگتے اُن کا رونا علم و فضل و تقویٰ کی محرومی پر تھا جو زید کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ علامہ محمد ابو زہرہ فرماتے ہیں کہ تمام قاریان فقہاء و محدثین اور صلحاء بنی اُمیہ کے خلاف خروج کرنے میں زید کے ہم خیال تھے (الامام زید محمد ابو زہرہ ص۲۵)

معتقدین امامت زید کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب زید کی شہادت پر امامت یحییٰ بن زید کی طرف منتقل ہوئی کیونکہ یہی تلوار لے کر اُٹھے۔ یہ بڑے زاہد و عابد اور حلال و حرام کے عالم تھے اپنے باپ کی معیت میں کوفہ میں داد شجاعت دے چکے تھے ان کی شہادت کے بعد کچھ لوگوں کے ساتھ مخفی طور پر کربلا گئے وہاں سے مدائن پھر رے پہونچے جو ایران کا ایک شہر ہے وہاں ایک شہر سے دوسرے شہر میں چھپتے رہے یہاں تک کہ بلخ پہونچے اور حریش بن عبد الرحمان شیبانی کے مہمان ہوئے اور ولید بن یزید بن عبد الملک کے خلیفہ ہونے تک اس کے پاس مقیم رہے یوسف بن عمر ثقفی نے نصر بن سیار گورنر خراسان کو لکھا کہ یحییٰ کو گرفتار کر کے میرے پاس روانہ کر دو۔ نصر نے حاکم بلخ کو لکھا کہ حریش بن عبد الرحمن کو پکڑ کر جیل میں ڈال دو جب تک وہ یحییٰ کو حوالہ نہ کرے حریش نے یحییٰ کو حوالہ کرنے سے انکار کیا جس پر حاکم بلخ نے اسے قید میں ڈال دیا اور ۶ سو کوڑے مارے قتل کر ڈالنے کی دھمکی دی۔ آخر کار حریش کے کسی بیٹے کی مدد سے جناب یحییٰ گرفتار ہوئے حاکم بلخ نے یحییٰ کو نصر بن سیار کے پاس روانہ کر دیا جس نے انھیں پیروں میں بیڑیاں ڈال کر قید خانہ میں ڈال دیا پھر ولید بن یزید کو اطلاع دے کر اس کی مرضی دریافت کی اور اس کا ایما پا کر انھیں قید سے رہا کر دیا تو رہا کر بلایا گیا کہ ان کے پیروں سے بیڑیاں کاٹ کر الگ کر دے۔ شیعوں کو معلوم ہوا کہ یحییٰ کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ انھوں نے ہر قیمت پر ان بیڑیوں کو حاصل کرنا چاہا اور آخر بیس ہزار درہم میں وہ بیڑیاں خرید لی گئیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آپس میں تبرک کے لئے تقسیم کر لئے گئے۔ جناب یحییٰ وہاں سے روانہ ہو کر پھر ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہے جہاں پہونچتے وہاں بہت سے لوگ یحییٰ کے ساتھ ہو جاتے یہاں تک کہ تقریباً سات سو ہو گئے۔ نصر بن سیار نے طوس اور سرخس کے حاکموں کو لکھا کہ چھاپا مار کر یحییٰ اور اُن کے ساتھیوں کو گرفتار کر لو یحییٰ اور اُن حاکموں کے درمیان متعدد جھڑپیں ہوئیں ہر مرتبہ ان حاکموں کے سپاہیوں کو شکست فاش ہوئی۔ آخر یحییٰ جوزجان پہونچے وہاں ان میں اور نصر بن سیار میں خوں ریز جنگ ہوئی جناب یحییٰ کی پیشانی پر ایک تیر آ کر لگا جس سے آپ کی شہادت واقع ہو گئی۔

جناب زید کے دوسرے فرزند جناب عیسیٰ نے بھی خروج کیا ان کی عمر جناب زید کی شہادت کے وقت ۱۱ سال کی تھی جوان ہونے پر یہ محمد بن عبد اللہ المحض کی تحریک میں شریک ہو گئے ان کی شہادت کے بعد ابراہیم بن عبد اللہ کے ساتھ اُن معرکوں میں شریک رہے جو اُن میں اور عباسیوں میں ہوئے ابراہیم نے اپنے بعد کے لئے

عیسیٰ کو مقرر کیا اور آخر میں جناب عیسیٰ کو روپوشی اختیار کرنا پڑی اور آپ نے ایک طویل عمر بسر کی مگر مہدی عباسی کے خوف سے برابر روپوش رہے۔ (زید شہید مولانا سید عبدالرزاق المقرم)

ملل و نحل شہرستانی میں ہے کہ فرقہ زیدیہ کے حالات زید، ان کے فرزند یحییٰ اور محمد بن عبداللہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی شہادت تک منظم نہیں ہو پائے یہاں تک کہ ناصر اطروش[1] نے ۳۰۱ھ میں بلاد دیلم میں ظہور کیا اس نے وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور سب نے زیدیہ مذہب اختیار کیا اور ان شہروں میں فرقہ زیدیہ برابر زندہ رہا ایک کے بعد دوسرا ان کا منظر عام پر آتا رہا۔

علامہ محمد ابوزہرہ اس بات کے مدعی ہیں کہ جناب زید کا نظریہ یہ تھا کہ خلافت انتخاب و اختیار سے ہوتی ہے نہ کہ نص سے اسی بنیاد پر جائز ہے کہ بہتر کے رہتے ہوئے کمتر خلیفہ ہو جائے۔ ابوزہرہ نے اس کے ثبوت میں جناب زید کا وہ فقرہ نقل کیا ہے جسے شہرستانی نے زید سے روایت کر کے ملل نحل میں درج کیا ہے، جناب زید نے کہا کہ علی تمام صحابہ سے افضل تھے لیکن لوگوں نے ابوبکر کو خلیفہ بنا لیا مصلحت کو دیکھتے ہوئے فتنہ کو فرو اور لوگوں کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے کیونکہ غزوات رسولؐ کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور علی کی تلوار اب تک نہیں خشک ہوئی تھی لوگوں کے دلوں میں علی کے خلاف آتش انتقام بھڑک رہی تھی اس بنا پر لوگوں کے دل علی کی طرف پوری طرح مائل ہی نہیں ہو سکتے تھے اور نہ لوگ علی کے اس طرح مطیع و فرماں بردار ہو سکتے تھے جس طرح واقعاً ہونا چاہیئے تھا۔

اسی قسم کے اور بھی کئی اسباب جناب زید نے گنائے ہیں جیسا کہ شہرستانی کی روایت ہے۔

شہرستانی کی بیان کردہ اس روایت سے ابوزہرہ نے دو نتیجے نکالے ہیں ایک یہ کہ بہتر کے رہتے ہوئے کمتر کی خلافت جائز ہے، دوسرے یہ کہ امام کے لئے معصوم ہونا کوئی ضروری نہیں۔ پہلا نتیجہ نکالنے کی وجہ ابوزہرہ نے یہ قرار دی ہے کہ زیدیہ یہ اقرار کرتے ہوئے بھی کہ علی تمام صحابہ سے افضل تھے اس بات کے معتقد تھے کہ علی سے پہلے جو تین خلیفہ ہوئے ان کی خلافت صحیح اور ان کی اطاعت واجب تھی اور دوسرا نتیجہ امام کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ ابوزہرہ نے یوں نکالا ہے کہ عصمت امام کے مفروضہ کی بنیاد پیغمبرؐ کی نص پر نہیں اس پر ہے کہ پیغمبرؐ جو کچھ کرتے تھے وحی سے کرتے تھے اور یہ ناممکن ہے کہ پیغمبر خدا وحی ربانی کی روشنی میں ایسے شخص کو امام نامزد کر دیں جس سے خطا کا صدور ممکن ہو۔

جناب زید کی طرف منسوب اس روایت سے ابوزہرہ انھیں دونوں نتیجوں پر پہونچے ہیں اور یہ نتیجے نکال کر انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امامت کے بارے میں زید کا نظریہ فرقہ امامیہ کے نظریہ کے مخالف تھا۔ ابوزہرہ نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا کہ اس زمانہ میں شیعیان عراق خلافت کے متعلق جو نظریہ رکھتے تھے جس نظریہ پر سب ہی کا اتفاق تھا اور ہر صحبت و نشست میں جس کا عام طور پر چرچا رہا کرتا، زید اس نظریہ کے خلاف تھے مگر انھیں زید کے مخالف ہونے کا کوئی صریحی ثبوت نہیں مل سکا اس لئے انھوں نے شہرستانی کی بیان کردہ

---

[1] ملل و نحل جلد اص ۲۵۴ ناصر اطروش کا نام حسن بن علی بن حسن ابن حسن بن عمر بن علی ابن حسین ہے ان کا لقب ناصر تھا انھوں نے طبرستان پر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

روایت کا سہارا لیا حالانکہ یہ روایت زید کے نظریہ کی ہرگز ترجمان نہیں۔ اس روایت سے ہرگز اس کا پتہ نہیں چلتا کہ جناب زید نے انتخاب خلیفہ کے اصول و قواعد بیان کئے ہیں اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب اس طرح ہونا چاہیئے بلکہ انھوں نے صرف یہ بیان کیا ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد خلافت کس طرح منعقد ہوا کی علیؑ کو چھوڑ کر یہ خلافت ابوبکر تک کیسے جا پہونچی۔ جناب زید نے صدر اول کے مسلمانوں پر نکتہ چینی کرنے سے پرہیز کیا ہے اُن پر حرف گیری نہیں کی کہ انھوں نے علیؑ کو چھوڑ کر ابوبکر کو خلیفہ بنا لیا مگر ایک لفظ بھی ایسی نہیں کہی جس سے یہ پتہ چل سکے کہ وہ اس بات کا عقیدہ بھی رکھتے تھے یا اُن کا نظریہ یہ تھا کہ پیغمبرؐ خدا نے علیؑ کی خلافت کی صراحت نہیں فرمائی۔

ابوزہرہ نے شہرستانی کی بیان کردہ اس روایت سے استدلال کیا کیونکہ اس میں تدلیس اور فریب کی زیادہ گنجائش تھی اور وہ روایت نظر انداز کر گئے جو زید کے نظریہ و عقیدہ کی حقیقی آئینہ دار تھی کہ خلافت ہمارا حق ہے پہلے والے اُسے ہتھیا بیٹھے اور ہمیں اس سے نکال باہر کیا۔

ابن اثیر و ابن کثیر دونوں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جناب زید کے پیرؤوں نے اُن سے سوال کیا کہ آپ ابوبکر و عمر کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

زید نے کہا۔ خدا ان دونوں کو بخشے اپنے گھر والوں میں سے کسی کو اُن سے تبرا کرتے ہوئے نہیں سُنا میں بھی اُن کے متعلق کلمہ خیر ہی کہوں گا۔

ساتھیوں نے پوچھا پھر آپ انتقام اہلبیت کے کیوں طالب ہیں؟

جناب زید نے کہا ——— تم لوگوں نے جن کا ذکر کیا ان کے متعلق میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم زیادہ حق دار خلافت تھے مگر لوگوں نے خلافت ہتھیا لی ہمیں نکال باہر کیا مگر اس بات سے وہ کافر نہیں ہوئے

ساتھیوں نے پوچھا تو پھر ان لوگوں (بنی امیہ) سے کیوں برسرپیکار ہیں؟

آپ نے فرمایا یہ لوگ ان لوگوں جیسے نہیں انھوں نے لوگوں پر بھی ظلم کیا اور خود اپنے پر بھی میں کتاب خدا سنت نبی۔ سنتوں کو زندہ اور بدعتوں کو مردہ کرنے کی طرف تمہیں دعوت دیتا ہوں اگر تم نے میری بات مانی تو میرے لئے بھی بہتر ہوگا اور تمہارے لئے بھی اور اگر تم برگشتہ ہوئے تو میں تمہارا کوئی ٹھیکیدار نہیں۔

یہ روایت صاف صاف بتاتی ہے اس میں کسی اختلاف و نزاع کسی تاویل کی گنجائش نہیں کہ زید کا یہ عقیدہ تھا کہ ابوبکر و عمر نے اُن کا حق غصب کر لیا ان کو محروم کر کے خود خلیفہ بن بیٹھے۔

جناب زید کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ وہ امام کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں قرار دیتے تو اسکے متعلق زید کا کوئی بھی قول نہیں ملتا ان کا ایک فقرہ بھی اس کے ثبوت میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ سارا زور اس پر دیا جاتا ہے کہ عصمت کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ پیغمبرؐ اپنی زندگی میں اپنا جانشین و وصی مقرر کر گئے تھے اور پیغمبرؐ کا ہر فعل وحی ربانی کی روشنی میں ہوتا اور وحی ربانی کسی ممکن الخطاط کے متعلق نشان دہی

نہیں کر سکتی تھی اور چونکہ جناب زید اس کے قائل ہی نہ تھے کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو اپنا وصی مقرر کیا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ زید امام کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

ہم پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ جناب زید آئمہ اہل بیتؑ کے مخالف نہ تھے انھوں نے کبھی بھی اپنے امام ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس موضوع پر ہمیں زید کے جتنے فقرے ملتے ہیں وہ صراحتاً بتاتے ہیں کہ امامت کے متعلق نہ تو زید کوئی اپنا مخصوص نظریہ رکھتے تھے نہ مذہب اہل بیت کے وہ مخالف تھے۔

سب سے حیرت انگیز چیز بعض مصنفین کا یہ دعویٰ ہے کہ جناب زید واصل بن عطا کے شاگرد تھے اور چونکہ واصل بن عطا فرقہ معتزلہ کے امام اول تھے لہٰذا اُن کی شاگردی کی وجہ سے جناب زید بھی معتزلہ ہی جیسے عقائد کے حامل ہوئے۔ شہرستانی اپنی کتاب الملل والنحل میں لکھتے ہیں کہ جناب زید نے واصل بن عطا کی شاگردی اختیار کی اور ایسے لوگوں سے اکتساب علم کیا جو اُن کے جد بزرگوار کو جائز الخطاء سمجھتے تھے اور قضا و قدر کے متعلق مذہب اہلبیتؑ کے خلاف عقیدہ رکھتے تھے (ملل ونحل جلد ۱ ص ۲۵)

انھیں جیسی روایتوں پر بھروسہ کر کے مصنفین و مورخین نے جناب زید کے متعلق ایسی باتیں مشہور کر دیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ خلافت کے متعلق زید کا وہی نظریہ تھا جو فرقہ معتزلہ کا ہے یعنی یہ کہ بہتر کے رہتے ہوئے کمتر امام ہو سکتا ہے اور یہ امامت انتخاب و الیکشن سے ہوتی ہے نہ کہ خدا اور رسولؐ کی صراحت سے نیز یہ کہ جناب زید امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے داعی تھے اور یہ چیز فرقہ معتزلہ کے بنیادی اصولوں میں شمار ہوتی ہے۔

علامہ ابوزہرہ نے بھی یہ بحث اپنی کتاب میں چھیڑی ہے اور اسی خیال کو ترجیح دی ہے کہ زید واصل بن عطا کے شاگرد تھے حالانکہ جناب زید قریب قریب واصل بن عطا کے ہم سن تھے خود ان کا علم و فضل مشہور اور دوسروں سے اُن کی بے نیازی مسلم تھی۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ اگر وہ واصل بن عطا سے ملے بھی ہوں گے تو تبادلہ خیال کے لئے ملے ہوں گے نہ کہ زانوئے ادب تہ کرنے اور ان کی شاگردی اختیار کرنے کے لئے جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے۔

محمد ابوزہرہ نے ابن مرتضیٰ کی کتاب المنیۃ والامل کی ایک روایت کی بنا پر یہ نتیجہ بھی نکالا ہو کہ آئمہ اہل بیتؑ امام حسنؑ و امام حسینؑ محمد بن حنفیہ امام زین العابدینؑ اور آپ کے فرزند امام محمد باقرؑ اصول میں معتزلی المسلک تھے حالانکہ ہم پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ مسئلہ امامت میں زید کے نظریات معتزلہ کے نظریات سے میل نہیں کھاتے ان کا واصل بن عطا کا شاگرد ہونا بھی ناممکن تھا جو علیؑ و معاویہ میں سے کسی ایک کو فاسق قرار دیتے تھے جو علیؑ کی گواہی ناقابل قبول سمجھتے تھے ائمہ اہل بیتؑ کی طرف اعتزال کی نسبت دینا تو اور بھی مضحکہ انگیز ہے۔ اصول میں معتزلہ کے جو نظریات تھے وہ فرقہ امامیہ کے نظریات سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتے جو شخص بھی معتزلہ اور فرقہ امامیہ کے اصولوں کو ملا کر دیکھے گا محمد ابوزہرہ کے اس دعویٰ کو ٹھکرا دے گا۔ انھوں نے یہ دعویٰ یا تو اصول شیعہ سے ناواقفیت کی بنا پر کیا ہے یا خالی تعصب کی بنا پر۔

بہر حال جناب زید کی شہادت کے بعد شیعوں کی ایک جماعت ان کی امامت کی قائل ہوئی۔ شہرستانی وغیرہ نے

زیدیہ کی ۳ قسمیں گنائی ہیں جارودیہ۔ سلیمانیہ بتریہ ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب مقالات الاسلامیین میں ۳ فرقوں کا اور اضافہ کیا ہے۔

نعیمہ، نعیم بن یمان کے پیرو۔ یعقوبیہ ایک شخص یعقوب نامی کے پیرو۔ تیسرا فرقہ جو کسی کی طرف منسوب نہیں اشعری نے دعوی کیا ہے کہ یہ تینوں فرقے ابوبکر و عمر کے ارادتمند رجعت اموات کے منکر اور اس کے معتقد سے بیزاری کا اظہار کیا کرتے۔

نوبختی اپنی کتاب فرق الشیعہ میں لکھتے ہیں کہ زیدی فرقے فرقہ جارودیہ سے پھوٹے اور یہی فرقہ جارودیہ بنیاد ہے زیدی فرقے کی ۳ بڑی شاخوں کا۔

فرقہ جارودیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت رسولخداؐ نے اوصاف بتا کر علیؑ کی امامت کی صراحت کی تھی نہ کہ نام لے کر جن لوگوں نے پیغمبرؐ کے بعد علیؑ کی اقتدا نہیں کی وہ گمراہ و کافر ہوئے۔ علیؑ کے بعد یہ امامت آپ کے فرزندوں حسنؑ و حسینؑ کی طرف منتقل ہوئی حسنؑ کے بعد حسینؑ امام ہوئے اور حسنؑ و حسینؑ کے بعد ان کی اولاد میں سے وہ شخص امام ہے جو خدا کی طرف دعوت دیتے ہوئے خروج کرے اور وہ عالم و فاضل بھی ہو۔

فرقہ جارودیہ کے کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ

محمد[1] بن عبداللہ بن حسنؑ ابتک زندہ ہیں اور عنقریب حق کو ثابت کرنے کے لئے ظہور فرمائیں گے۔

اسی طرح فرقہ زیدیہ کے کچھ لوگ اس کے مدعی ہیں کہ محمد بن قاسم[2] صاحب طالقان زندہ ہیں مرے نہیں اور وہ حق کو زندہ اور باطل کو مردہ کرنے کے لئے ضرور خروج فرمائیں گے۔ انہوں نے معتصم عباسی کے زمانہ میں بلاد طالقان میں خروج کیا عبداللہ بن طاہر نے انھیں شکست دی اور معتصم کے پاس انھیں قید کر کے بھیجدیا معتصم نے انھیں سامرا میں قید کر دیا اور وہاں سنہ ۲۱۹ھ تک زندہ رہے پھر قید خانہ کے بعض پہریداروں کے ذریعہ جو شیعہ تھے وہ قید خانہ سے باہر آگئے پھر اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھیں زہر سے شہید کر دیا گیا۔

کچھ دوسرے لوگ فرقہ جارودیہ والے اس بات کے معتقد ہیں کہ یحییٰ بن عمر بن حسین بن زید بن علی ابتک زندہ ہیں اور عنقریب خروج کریں گے۔ انھیں بھی عبداللہ بن طاہر نے گرفتار کر کے متوکل کے پاس بھیجدیا تھا متوکل نے عمر بن فرج رخجی کے حوالے کیا عمر نے اُن سے سخت کلامی کی یحییٰ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا عمر نے متوکل سے ان کی شکایت کی اور انھیں کوڑوں سے پیٹا پھر فتح بن خاقان کے گھر میں قید کر دیا کچھ دنوں کے بعد یہ رہا ہوئے تو کوفہ کی طرف چلے گئے وہاں لوگوں کو رضائے آل محمدؐ کی طرف دعوت دی لوگوں کے ساتھ عدل و حسن سیرۃ سے

---

۱ محمد بن عبداللہ جو نفس زکیہ کے نام سے مشہور ہیں سنہ ۱۴۵ھ میں منصور کے گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے انھیں شہید کیا۔ اسی سال ان کے بھائی بھی شہید ہوئے۔ یہ دونوں عبداللہ بن حسن کے فرزند اور فرقہ زیدیہ کے امام ہیں۔ ۲ محمد بن قاسم بن علی بن عمر بن علی بن الحسین۔ ان کی ماں صفیہ بنت موسیٰ بن عمر بن علی بن الحسین تھیں ان کی کنیت ابوجعفر تھی، عوام الناس انھیں صوفی کے لقب سے یاد کرتے تھے کیونکہ یہ زیادہ تر اونی لباس پہنا کرتے تھے فقہ و علم و زہد میں مشہور زمانہ تھے۔ ۱۲

پیش آئے۔ عبد اللہ بن طاہر نے اُن سے لڑنے کے لئے اُن کے چچازاد بھائی حسین بن اسماعیل کو متعین کیا نیز دوسرے افسران فوج کو بھی ساتھ کر دیا گھمسان کی جنگ ہوئی اور آخر کار جناب یحیٰی ۲۴۸ھ میں مستعین باللہ کے عہد میں شہید ہوئے (مقالات الاسلامیین جلد اول ص ۱۳۵)

فرقہ زیدیہ کی دوسری شاخ فرقہ سلیمانیہ جو سلیمان بن جریر زیدی کے پیرو تھے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ امامت رسول اللہؐ کے بعد اس کا حق ہے جسے مسلمان منتخب کر لیں انتخاب میں اجماع کی شرط نہیں اگر دو نیکوکار آدمی بھی کسی کو منتخب کر لیں تو وہ امام ہو جائے گا چاہے مسلمانوں میں اس سے زیادہ افضل کیوں نہ موجود ہوں اس طرح وہ لوگ ابو بکر و عمر کی خلافت کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

اس فرقہ کے سرغنہ سلیمان بن جریر کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ابو بکر و عمر کی خلافت غلط تھی۔ اُمت والوں نے ان کو منتخب کر کے "زیادہ بہتر و مناسب" کو ترک کیا۔ یہ سلیمان، عثمان بن عفان کو کافر قرار دیتا تھا اور کہتا کہ علیؑ گمراہ نہیں ہوئے نہ اُن کی گمراہی پر کوئی قاعدہ کی شہادۃ ہے۔

فرقہ زیدیہ کی تیسری شاخ تبریہ والے جو حسن بن صالح[1] بن حی کے پیرو ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے بعد علی ہی سب سے افضل اور سب سے زیادہ حقدار امامت ہیں لیکن آپ نے امامت دوسروں کے لئے چھوڑ دی اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کے سابق کے خلفاء کی خلافت جائز نہ ہوتی۔ یہ لوگ عثمان اور ان کے قاتلین کے بارے میں توقف سے کام لیتے ہیں اور علیؑ کو اسی دن سے خلیفہ تسلیم کرتے ہیں جس دن اُن کی بیعت ہوئی۔

باقی تین فرقے جو ابو الحسن اشعری نے فرقہ زیدیہ کے مزید بتائے ہیں یہ مستقل فرقے نہ تھے بلکہ یہ جارودیہ سلیمانیہ اور تبریہ کی شاخیں ہیں۔

اصول میں فرقہ زیدیہ کے خصوصی نظریات ہیں کچھ تو شیعہ امامیہ سے ملتے جلتے ہیں اور کچھ ان کے مخالف ہیں جب ہم شیعوں کے نظریات کا معتزلہ و اشاعرہ کے نظریات سے موازنہ کریں گے اس وقت ہم اُس کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

ہم شروع بحث میں اس کی پوری وضاحت کر چکے ہیں کہ جناب زید مسلک امامیہ کے خلاف کوئی رائے نہیں رکھتے تھے خصوصیت کے ساتھ مسئلہ امامت میں جناب زید کی طرف جتنے اختلافات منسوب کئے جاتے ہیں وہ سب ان کی شہادۃ کے بعد کی پیداوار ہیں ان کے خصوصی عقیدت مندوں نے ان اختلافات کو جنم دیا جب سے کہ زیدیین سیاسی اور عقائدی پہلوؤں سے ایک مستقل فرقہ بن کر منظر عام پر آئے۔

بہر حال فرقہ زیدیہ کے ان لوگوں کو چھوڑ کر جو مسلک امامیہ سے منحرف ہوئے (جیسا کہ اسلامی فرق و مذاہب پر

---

[1] حسن بن صالح فرقہ زیدیہ کے اکابر سے ہیں ان کا لقب ابتر تھا اسی لئے ان کی طرف منسوب فرقہ جبریہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حسن بن صالح فرقہ زیدیہ کے مشہور علمائے فقہ اور متکلمین سے تھے توحید و امامت میں کئی کتابیں لکھیں فقہ میں ان کی ایک مشہور کتاب جامع نام کی ہے ۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔

کتابیں لکھنے والوں کا دعویٰ ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ شیعوں کی غالب اکثریت امام زین العابدینؑ کے بعد امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کی امامت کی معتقد رہی کسی نے بھی ان دونوں اماموں کی امامت میں اختلاف نہیں کیا سوائے اُن سازشی لوگوں کے جو اہلبیتؑ کے بنیادی عقائد کو خلط ملط کرنے کے لئے شیعوں کی صفوں میں گھس آئے تھے جیسے خطابیہ اور مغیرہ وغیرہ اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ائمہ طاہرینؑ نے ان سب سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور مسلمانوں کو ان سازشی لوگوں سے محتاط اور ان کے فاسد خیالات سے ہوشیار رہنے کی تنبیہ فرمائی۔

البتہ امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد شیعوں کی صفوں میں بہت کچھ خلل پیدا ہوا ان کے بنیادی عقائد سے انحراف اور بہت سی باتوں میں اُن کی مخالفت کی گئی گو ناگوں وجوہ و اسباب کے علاوہ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ حکام و سلاطین امام حقیقی موسیٰ کاظمؑ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اُن کی کڑی نظریں آپ پر تھیں اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ جہاں تک ہو سکے آپ اپنے کو مخفی رکھیں۔

جب اتنی سخت پردہ داری پر بھی آپ کی امامت پوشیدہ نہ رہی اور آپ کا شہرہ عام ہو گیا تو اب تشیع کو کچلنے کے لئے حکام و سلاطین کے پاس کوئی چارہ نہ رہا سوا اس کے کہ آپ کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیں اسی وجہ سے آپ کی زندگی کا بہت کچھ حصہ قید خانہ میں گزرا اور قید خانہ ہی میں آپ نے رحلت فرمائی۔

اسی سبب سے نیز اور دوسرے اسباب کی بنا پر شیعوں کے درمیان بہت کچھ انحرافات و اختلافات کی داغ بیل پڑی فرقہ ناؤسیہ نے جو عجلان بن ناؤس کے پیرو تھے یہ دعویٰ کیا کہ امام جعفر صادقؑ کی رحلت نہیں ہوئی اور آپ عنقریب خود کو زندہ اور بدعتوں کو مردہ کرنے کے لئے ظہور فرمائیں گے۔

کچھ دوسرے لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آپ کے فرزند عبد اللہ امام ہوئے جو افطح کے نام سے مشہور اور اسماعیل کے حقیقی بھائی تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دعوے کی تائید میں امام جعفر صادقؑ کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ حدیث بھی روایت کی کہ امامت امام کے فرزند اکبر میں رہے گی جس طرح یہ حدیثیں روایت کیں کہ امام میرے بعد وہ ہوگا جو میری جگہ بیٹھے اور امام کو امام ہی غسل دے سکتا ہے یہ تمام باتیں ان کے خیال کے مطابق عبد اللہ الافطح میں موجود تھیں۔

ان لوگوں نے ایک بات کا اور بھی اضافہ کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے کسی صحابی کے پاس کچھ روپئے رکھوائے اور تاکید کی کہ جو تم سے مانگنے آئے اسی کو دینا اور اسی کو اپنا امام سمجھنا اور سوا عبد اللہ کے ان روپئوں کو کسی نے طلب نہیں کیا۔

انھیں باتوں کی بنا پر کچھ شیعوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد عبد اللہ الافطح امام ہوئے۔

اگر ہم ان باتوں کو صحیح مان بھی لیں اور جو حدیثیں بیان کی جاتی ہیں بالفرض تسلیم بھی کر لیں کہ واقعی امام جعفر صادقؑ نے فرمائیں تو ان سے غرض صرف یہ رہی ہوگی کہ حکام و سلاطین کو اندھیرے میں رکھا جائے اور امام حقیقی موسیٰ کاظمؑ پر ان کی نظریں پڑنے نہ دی جائیں کیونکہ حکام و سلاطین یہ معلوم کرنے کے لئے انتہائی بے چین

تھے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد کون امام ہوا۔ منصور نے اپنے گورنر مدینہ کو تاکیدی خط لکھا تھا کہ یہ پتہ چلاؤ جعفر صادقؑ نے کس کے لئے وصیت کی کون آپ کا وصی ہوا۔ امام جعفر صادقؑ کو ان کی نیتوں کا بخوبی علم تھا اسی لئے آپ نے اپنا وصیت نامہ چار آدمیوں کے نام لکھا۔ محمد بن سلیمان مدینہ کا گورنر، منصور دوانیقی، جناب حمیدہ مادر امام موسیٰ کاظمؑ۔ محمد بن سلیمان نے یہ سب نام منصور کو لکھ بھیجے۔ ظاہر ہے کہ منصور ان سب لوگوں کو کسی صورت قتل نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دوسرے شیعہ اس بات کے مدعی ہوئے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آپ کے فرزند محمد بن جعفر امام ہوئے امام محمد باقرؑ نے آپ کی امامت پر نص فرمائی تھی اس کے ثبوت میں انھوں نے امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث کی روایت کی ہے کہ آپ نے امام جعفر صادقؑ سے فرمایا جب تمھارے فرزند متولد ہو تو اس کا نام میرے نام پر رکھنا اور وہی تمھارے بعد امام ہوگا اس عقیدہ کے قائلین فرقہ شمطیہ کے نام سے مشہور ہیں یعنی یحییٰ بن شمیط کے پیرو، جیساکہ اسلامی فرق و مذاہب کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کا کہنا ہے۔

ایک جماعت نے یہ مسلک اختیار کیا کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آپ کے فرزند اسماعیل امام ہوئے امام جعفر صادقؑ نے ان کی امامت پر نص کی تھی اس جماعت کے لوگ دو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک فرقہ قائل ہے کہ اسماعیل امام جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے مگر چونکہ امام جعفر صادقؑ نے انھیں کی امامت پر نص کی تھی لہٰذا امامت اُن کی اولاد میں منتقل ہو گئی اور محمد بن اسماعیل امام ہوئے۔ یہ قول فرقہ مبارکیہ کی طرف منسوب ہے جو جناب اسماعیل کے آزاد کردہ غلام مبارک کے پیرو تھے۔

دوسری جماعت کہتی ہے اسماعیل زندہ ہیں امام جعفر صادقؑ نے محض بنی عباس کے خوف سے ان کی موت کا اعلان کیا، لوگوں سے گواہیاں دلوائیں، حاکم مدینہ کو بھی گواہ بنایا۔

اس فرقے والے بھی دو فرقوں میں بٹ گئے ایک فرقہ تو بس محمد بن اسماعیل تک آکر رُک گیا اور ان کے بعد کسی کی امامت کا قائل نہیں ہوا، دوسرے فرقے نے اس سلسلے کو محمد بن اسماعیل سے آگے بھی جاری سمجھا اور امامت سات ظاہر اور سات مخفی اماموں میں قرار دی پہلا مخفی امام محمد ابن اسماعیل پھر ان کے فرزند جعفر مصدق پھر اُن کے فرزند محمد حبیب پھر عبداللہ المہدی جنھوں نے شمالی افریقہ میں ظہور کیا اور انھیں سے دولت فاطمیہ کی بنیاد پڑی۔

اسلامی فرقوں کے بارے میں کتابیں لکھنے والوں نے صراحت کی ہے کہ اسماعیل کی امامت کے قائلین دو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ اسماعیل اپنے باپ کی زندگی میں فوت کر گئے۔ دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ نہیں وہ اپنے باپ کے بعد زندہ رہے اور امامت امام جعفر صادقؑ سے ان کے فرزند اسماعیل کی طرف منتقل ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقہ اسماعیلیہ یعنی اسماعیل کی امامت کے قائلین کئی جماعتوں میں منقسم ہوئے ہر جماعت کے اصول و فروع میں کچھ خصوصی اقوال و نظریات ہیں بعض لوگ تو ایسے نرالے اقوال ہیں جو انھیں اسلام ہی سے خارج کئے دیتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ سبعیہ کے نام سے مشہور ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ امامت

سات سات اماموں کے گرد دائر ہے، سات ظاہری امام اور سات مخفی امام جیسے ہفتہ سات دن کا ہوتا ہے آسمان بھی سات ہیں زمین بھی سات ہیں۔ پہلے سات اماموں میں اول امام حضرت علیؑ اور آخر اسماعیل بن جعفر ہیں اور دوسرے سات اماموں کا آغاز محمد بن اسماعیل سے ہوا۔ یہ مخفی امام ہیں جو پوشیدہ طریقہ سے بلاد و ممالک میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اپنے مبلغین کو علانیہ بھیجتے ہیں اس لیے کہ زمین کسی زندہ قائم امام سے خالی نہیں رہ سکتی خواہ وہ امام ظاہر و علانیہ ہو یا مخفی اور پوشیدہ ساتویں امام جب آئیں گے تو وہ اپنے پہلے کی ساری شریعتوں کو منسوخ کر دیں گے۔ (ملل و نحل شہرستانی جلد ۱ ص۲۳۲)

اس مذہب نے عراق میں نشو و نما پائی کیونکہ یہی عراق شیعوں کا مرکز تھا لیکن شروع شروع اس کو مقبولیت نہیں نصیب ہوئی انھوں نے شیعہ امامیہ کو بھی اپنا سخت مخالف پایا اور ہر اس شخص کو جو صحیح تشیع اور مسلک اہل بیت سے منحرف ہو چنانچہ اس کے مبلغین فارس و خراسان اور دیگر اسلامی شہروں میں پھیل گئے اور ان مبلغین نے وہاں کے باشندوں اور ان کے فلسفہ کو پوری طرح متاثر کیا بعض مبلغین اپنے انداز فکر میں اعتدال کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔

اور چونکہ اسماعیلی مبلغین ان ممالک کے باشندوں سے جو مختلف مذہبوں کے پیرو تھے کافی گھل مل گئے تھے اس لیے اُن میں مذہبی انحراف کا پیدا ہو جانا ناگزیر سی بات تھی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی یہ رہی کہ وہ اپنے عقائد کو حتی الامکان مخفی رکھتے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے اسماعیلیوں میں اگرچہ بہت سے فرقے ہو گئے اور ہر فرقہ اصول و فروع میں دوسرے فرقے سے کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور رکھتا ہے مگر اپنے عقائد چھپانے میں سبھی ایک جیسے ہیں یہاں تک کہ اسماعیلیوں کا معتدل فرقہ بھی تمام مسلمانوں سے اپنے عقائد مخفی رکھتا ہے کسی کو ان کے عقائد کی ہوا بھی لگنے نہیں پاتی۔

انھیں اسماعیلیوں کا ایک فرقہ قرامطہ بھی ہے اس فرقہ کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اسماعیل امام جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے اور انھوں نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے فرزند محمد بن اسماعیل کو امام مقرر کیا تھا چنانچہ اسماعیل کے بعد یہی محمد امام ہوئے اسماعیلیوں کی یہ شاخ مبارکیہ کے نام سے موسوم ہے اسماعیل بن جعفر کے آزاد کردہ غلام مبارک کی نسبت سے انھیں کو قرامطہ بھی کہا جاتا ہے حمدان بن اشعث ملقب بہ قرمط کے تعلق سے[۱] جس نے سنہ ۲۷۸ھ میں خروج کیا تھا۔ بعض روایتوں میں قرمط نام ہونے کی وجہ یہ مذکور ہے کہ یہ سرخ

۱؎ فصول المختارہ من العیون و المحاسن جناب شیخ مفید ص۹۹

محمد بن اسماعیل اسماعیلیوں کے پہلے امام ہیں انھوں نے اپنے چچا حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے عراق جانے کی اجازت لی آپ نے اجازت مرحمت فرمائی اور زادِ راہ کے علاوہ ۳ تھیلیاں بھی دیں جن میں ۱۵۰ دینار تھے پھر بہت سے درہم بھی دیئے جب یہ ہارون رشید کے پاس پہنچے تو اس سے کہا زمین پر دو خلیفہ ہیں تم اور موسیٰ بن جعفرؑ ہارون رشید ان کی اس چغل خوری سے بہت خوش ہوا اور انھیں ایک لاکھ درہم دیئے کہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے ان پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور اسی وقت انتقال کر گئے (ملل و نحل جلد ۱ ص۲۷۹)

رنگ کا تھا جیسے پکی ہوئی اینٹ کا ہوتا ہے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب قرامطہ کی بنیاد عبداللہ بن میمون قداح نے رکھی تھی یہ اصلاً یہودی تھا اور مضافات حمص کا رہنے والا تھا یہودیوں کا عالم بھی تھا فلسفہ کی تعلیم بھی اس نے حاصل کی تھی اور دیگر مذاہب کا بھی اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا پھر اس نے ازراہ مکر و فریب اسلام ظاہر کیا فرقہ اسماعیلیہ میں داخل ہو کر تشیع کا لبادہ اوڑھا اس کی شعبدہ بازیوں کے سبب بہت سے جاہل اور سادہ لوح افراد گمراہ ہوئے پھر اس کی ملاقات قرمط سے ہوئی دونوں نے مل کر لائحہ عمل تیار کیا عبداللہ القداح نے مستقل سکونت کوفہ میں اختیار کی اور قرمط نے بغداد کا رخ کیا۔

بعض مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ عبیداللہ سلطنت عبیدیہ یعنی فاطمی سلطنت کا بانی اسی میمون قداح کی اولاد سے تھا بعض لوگوں نے اس کا نام سعید بن حسن بن احمد بن عبداللہ بن میمون قداح بتایا ہے۔ یہ عبیداللہ بھیس بدل کر پہلے مصر پہونچا پھر وہاں سے مغرب (یعنی مراکش) گیا اور وہاں دعویٰ کیا کہ میں علوی و فاطمی ہوں اس نے اپنا نام عبیداللہ اور لقب مہدی رکھا اور اس کی سلطنت قائم ہوئی جسے سلطنت عبیدیہ بھی کہا جاتا ہے اور سلطنت فاطمیین بھی۔

چونکہ ان عبیدیین یا فاطمیین کے متعلق کئی طرح کی باتیں کہی گئی ہیں اس لئے ان کے علوی ہونے میں بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہوئے جب ان کی حکومت مراکش میں پوری طرح مضبوط ہو گئی اور ان کا اقتدار مصر تک پھیل گیا اور معز لدین اللہ الفاطمی نے قاہرہ کو اپنا دار السلطنت بنا لیا تو قادر باللہ خلیفہ عباسی نے بغداد کے تمام علماء کو اکٹھا کیا ان لوگوں نے خلفائے فاطمیین کا ایک نسب نامہ تیار کیا اور انھیں میمون قداح کی اولاد بتایا اس نسب نامہ پر بہت سے علماء نے دستخط کئے جیسے ابو حامد اسفرائنی ابو عبداللہ الضمیری۔ ابوالحسین قدری ابوالفضل نسوی جناب سید مرتضیٰ اور سید رضی وغیرہ جیسا کتاب کشف اسرار الباطنیہ واخبار القرامطہ میں مذکور ہے۔

اسی کتاب کے حاشیہ پر یہ بھی درج ہے کہ جب معز عبیدی کے سپہ سالار جوہر نے تمام مصر پر قبضہ کر لیا تو قاہرہ کے معززین واشراف معز عبیدی کے پاس اکٹھا ہوئے اور کہا کہ ہم اپنے سید و آقا کو کس خاندان کا ظاہر کریں معز نے کہا ہم جلد ہی ایک بزم ترتیب دینگے اور تمھیں اکٹھا کر کے اپنا نسب تفصیل سے تمھیں بتائیں گے جب معز قصر حکومت میں آ کر جم گیا تو اس نے ایک جلسہ عام طلب کیا اور حاضرین جلسہ سے پوچھا کیا تمہارے سرداروں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اس جلسہ میں حاضر نہ ہو سکا ہو لوگوں نے کہا کوئی بھی باقی نہیں بچا سبھی آ چکے ہیں معز نے اپنی آدھی تلوار نیام سے کھینچ لی اور کہا یہ ہے ہمارا نسب پھر حاضرین پر سونے جواہرات نچھاور کئے اور کہا یہ ہے ہمارا حسب سارے مجمع نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔

لہ دیکھئے کتاب کشف اسرار الباطنیہ جو کتاب التبصیر فی الدین کے ساتھ چھپی ہے۔ اسی کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ عبیداللہ میمون قداح کی اول اولاد تھا جب ابو عبداللہ الشیعی کے واسطے سے اسکا اقتدار مغرب (یعنی مراکش) پر قائم ہو گیا تو اس نے اپنا لقب مہدی اختیار کیا پھر مراکش سے اس کی سلطنت مصر تک پھیل گئی

اس روایت کو اگر بالفرض صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خلفائے فاطمیین غلط طور پر اپنے کو اہل بیتؑ کی طرف منسوب کرتے تھے یہ روایت تو بس یہ بتاتی ہے کہ معز لدین اللہ حسب و نسب کو حکومت کی بنیاد نہیں قرار دیتا تھا۔ لوگ دو ہی چیز کے آگے جھکتے ہیں ایک قوت و طاقت کے آگے دوسرے روپیہ کے آگے۔ انھیں دونوں چیزوں کی بدولت بنی اُمیہ کی حکومت قائم ہوئی اور بنی عباس کی بھی۔ لہذا لوگوں کی عام روش کی بنا پر جب کے لوگ سیکڑوں سال سے عادی چلے آرہے تھے معز کا جواب کوئی غلط نہ تھا۔ کوئی شخص کتنا ہی بلند نسب کا مالک ہو مگر وہ قوت اور دولت سے کبھی بے نیاز نہیں ہوگا۔ معز کے پہلے کے تمام حکام و سلاطین نے قوت و دولت سے بڑھ کر کوئی کارگر ہتھیار لوگوں کو مطیع و فرمانبردار بنانے اور اپنی حکومت مضبوط کرنے کا نہیں پایا۔

اکثر مورخین نے صراحت کی ہے کہ خلفائے فاطمیین، عبید اللہ بن محمد ملقب بہ مہدی بن محمد بن جعفر بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کی نسل سے ہیں اور ابو عبد اللہ الشیعی نے جو پہلے اثنا عشری شیعہ تھا بعد میں اسماعیلی ہو گیا تھا مراکش وغیرہ میں ان کے لئے زمین ہموار کی اور لوگوں کو اسماعیلی مذہب کی طرف دعوت دی۔

مصطفےٰ غالب نے بھی اپنی کتاب دعوۃ اسلامیہ میں اسی پر زور دیا ہے کہ سب سے پہلے امام محمد مہدی ہی نے بلاد مغرب مراکش وغیرہ پر اپنا اقتدار قائم کیا ایک حکومت کی تشکیل کی ان کے بعد یہ حکومت ان کے فرزند قائم بامر اللہ کے ہاتھوں میں آئی۔ اُن کے بعد ان کے فرزند امام منصور کے ہاتھوں میں جو معز لدین اللہ کے باپ تھے اور انھیں معز لدین اللہ نے مصر پر بھی قبضہ حاصل کیا اور وہاں ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔

اسی دعوۃ اسلامیہ میں مقریزی کے حوالے سے یہ بھی درج ہے کہ جب بنی عباس کی حکومت میں ضعف پیدا ہو گیا سلطنت درہم برہم ہونے لگی ممالک اسلامیہ کے اکثر حصے ان کے دائرۂ حکومت سے باہر ہو گئے خلفائے فاطمیین سے ٹکر لینے کی اُن میں طاقت نہ رہی جو کہ مراکش، مصر، مکہ، مدینہ، یمن وغیرہ پر قابض ہو چکے تھے تو انھوں نے خلفائے فاطمیین کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے ان کے نسب پر طعن و تشنیع کی کہ اس طرح لوگوں کی نگاہوں سے وہ گر جائیں گے اور لوگ ان سے نفرت کرنے لگیں گے بغداد کے جن علماء و قضاۃ نے ان کا نسب نامہ تیار کیا اور اس پر اپنے دستخط ثبت کئے وہ سادات فاطمیین کے سخت ترین دشمن اور بنی عباس کے خصوصی مخلصین سے تھے کوئی بھی ان کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ انھوں نے ہوا و ہوس جنبہ داری اور احکام پہنچنے کے جذبے سے خالی ہو کر اور صدق دل سے اس پر گواہی دی تھی بلکہ یہ لوگ اولاد علیؑ سے نفرت کرنے ان سے بغض و عناد رکھنے میں حد سے زیادہ بدنام تھے

ابن اثیر کی روایتوں سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ خلفائے فاطمیین کا نسب ہر شک و شبہ سے پاک تھا خلیفہ معتضد نے اپنے عاملوں کو جو فرمان روانہ کیا تھا وہ بھی خلفائے فاطمیین کے صحیح النسب ہونے کا صریحی ثبوت ہے اور اس کے بعد کوئی گنجائش شک و شبہ کی اس میں باقی نہیں رہ جاتی کہ یہ فاطمیین واقعاً اولاد علیؑ و فاطمہؑ سے تھے۔ (دیکھئے تاریخ الدعوۃ الاسماعیلیہ مولفہ مصطفےٰ غالب، ص [illegible] مطبوعہ دمشق)

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"واہیات باتوں سے وہ بات بھی ہے جو اکثر مورخین عبیدیین کے متعلق کہتے ہیں یعنی قیروان وقاہرہ شیعہ
خلفاء کہ یہ لوگ نسل اہل بیتؑ سے نہیں تھے۔ اسماعیل بن جعفر کی طرف ان کے منسوب ہونے پر طعن کرتے
ہیں اور اس سلسلہ میں ان حدیثوں کا سہارا لیتے ہیں جو خلفائے بنی عباس کے زلہ خواروں نے ان کی خوشامد میں
تصنیف کی تھیں"۔

اسی طرح ابن خلدون نے اور بھی بہت سی باتیں خلفائے فاطمیین کے صحیح النسب ہونے کے ثبوت میں
لکھی ہیں اور آخر میں لکھا ہے:

جن اکابر و علمائے اسلام نے ان خلفائے فاطمیین کا نسب نامہ تیار کیا اور اہل بیتؑ سے ان کو کوئی واسطہ
نہ ہونے کی گواہیاں دیں وہ سب بنی عباس کے شیعوں سے تھے (مقدمہ ابن خلدون ص۲۱)

علامہ ابوالفداء نے بھی اپنی تاریخ میں خلفائے فاطمیین کے متعلق ان اختلافات کا ذکر کیا ہے اور ذاتی
طور پر اسی کو ترجیح دی ہے کہ خلفائے فاطمیین واقعاً نسل علیؑ و فاطمہ سے تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے جناب
سید رضیؒ کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں جو صریحی ثبوت ہیں کہ سید رضیؒ کو ان خلفائے فاطمیین کے نسل علیؑ سے
ہونے میں قطعی کوئی شک نہیں تھا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ سید رضیؒ نے بھی اس محضر پر اپنی دستخط کی تھی جو عباسی
خلیفہ کے اشارہ پر علماء نے تیار کیا تھا جس میں خلفائے فاطمیین کے نسب اور نسل علیؑ و فاطمہؑ کے ہونے سے انکار
کیا گیا تھا تو یقیناً جناب سید رضیؒ نے خلیفہ قادر عباسی کے خوف سے اس پر دستخط کی ہوگی جیسا کہ علامہ ابن ابی
الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں تحریر کیا ہے کہ جناب سید رضیؒ نے اولاً اس محضر پر دستخط کرنے سے انکار کیا تھا
تو ان کے والد بزرگوار سے شکایت کی سید رضیؒ اور ان کے والد میں بہت کچھ باتیں ہوئیں اور آخر میں جناب
سید رضیؒ نے کہا۔ مجھے فاطمیین کے جاسوسوں سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میں دستخط کروں اور وہ مصر
اس کی خبر کر دیں ان کے والد نے کہا۔ خلفائے فاطمیین سے تو تم اتنا ڈرتے ہو جو ہزاروں میل تم سے دور ہیں
اور قادر عباسی سے نہیں ڈرتے کہ تم اور وہ ایک ہی شہر میں ہیں۔

بہر حال اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ خلفائے بنی عباس ہی نے ان سارے شکوک و شبہات کی تخلیق کی
وہ جب خلفائے فاطمیین کے مقابلہ سے عاجز رہے فاطمیین کے مبلغین مملکت اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں
پھیل چکے تھے حتی کہ اسلامی دار السلطنت بغداد تک میں منبروں پہ ان کے مقررین کی تقریریں ہونے لگی تھیں تو اب
بنی عباس کے لئے کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے ان فاطمیوں کو بدنام کیا جائے ان کا
نسب مشکوک بنا دیا جائے۔ عباسیوں نے ان فاطمیین کو میمون قداح کی اولاد بتایا ان کے بعض حاشیہ
نشینوں نے تو اس حد تک مبالغہ کیا کہ محمد مہدی کے متعلق جو پہلے فاطمی خلیفہ تھے یہ دعویٰ کیا کہ اصل نام
سعید تھا۔ وہ یوں کہ حسین بن محمد بن احمد بن عبد اللہ القداح ایک شہر سلمیہ پہونچا وہاں اس کی بزم میں عورتوں
کا ذکر چھڑا لوگوں نے ایک یہودی شخص کی بیوی کی بڑی تعریفیں کیں جس کا شوہر مر گیا تھا حسین نے اس

عورت سے شادی کر لی اس عورت کے یہودی شوہر سے ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام سعید تھا حسین اس بچے کو بہت چاہنے لگے، ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی وہ اپنے مرتے وقت اس بچے کو وصی مقرر کر گئے اور دعوت فاطمیہ کے اسرار اُسے تعلیم کئے روپیہ پیسہ حوالہ کیا۔ یہ سعید عبد اللہ الشیعی سے جاکر ملا —— اسی عبد اللہ الشیعی نے اس کے لئے مراکش وغیرہ میں فضا ہموار کی اور وہاں اس کا اقتدار قائم کر دیا۔

مذہب قرامطہ کا دوسرا بڑا مبلغ اور داعی ابو سعید جنابی تھا۔ بحرین دیمامہ واحساء پر اس نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ میں ہی مہدی قائم بدین اللہ ہوں، یہ ۳۱۷ھ کے موسم حج میں مکہ پہونچا حاجیوں کی بے شمار تعداد قتل کی اور حجر اسود اکھاڑ کے احساء میں لے گیا اس نے تقریباً ۱۳ ہزار حاجیوں کو تہ تیغ کیا تھا۔

مذہب قرامطہ کا ایک اور داعی و مبلغ حسن بن مہران مشہور بہ مقنع تھا یہ زبردست حکیم وفلسفی تھا ماوراء النہر میں اس نے خروج کیا۔ اس نے ایک مصنوعی چاند بھی بنایا تھا جو سال میں ۴۰ راتیں نکلا کرتا۔

ایک اور مبلغ و داعی علی بن فضل جدثی تھا بنی جدث کے خاندان سے اصل میں یہ جبشیان کا رہنے والا تھا جو یمن کا ایک گاؤں ہے پہلے یہ شیعہ اثنا عشری تھا حج کے لیے مکہ معظمہ گیا وہاں سے پیغمبر ص کی زیارت کے لئے مدینہ آیا وہاں سے کربلا پہونچا قبر امام مظلوم پر بہت کچھ گریہ وزاری کی وہیں اس کی ملاقات میمون قداح اور اس کے بیٹے عبید اللہ سے ہوئی۔ باپ بیٹے نے اپنے مکر و فریب اور ہر ممکن ہتھکنڈوں سے کام لے کر اس کو ہموار کرنے کی کوشش کی اور آخر کار یہ انھیں کا ہو رہا۔ میمون قداح نے اسے یمن بھیجا کہ وہاں میرے بیٹے عبید اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دو یہ تیسری صدی ہجری کے آخر کا واقعہ ہے جب یمن کے کچھ حصہ پر اس کا قبضہ ہو گیا تو اس نے میمون قداح اور اس کے لڑکے عبید اللہ کو بالائے طاق رکھا اور خود نبی بن بیٹھا تمام محرمات حلال قرار دیئے۔ خداوند عالم نے قرآن میں یا پیغمبر ص کی زبانی جتنے فرائض متعین کئے تھے اُن پر خط تنسیخ پھیر دیا، قیامت حشر و نشر جنت و نار سے انکار کیا۔ علی بن فضل ہی کی جماعت کا ایک آدمی ان عقائد کی جو علی ابن فضل نے قرار دیئے تھے تعریف و تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

لکل نبی مضی شرعۃ　　　وھذی شرائع ھذا النبی

فقد حط عنا فروض الصلوٰۃ　　　وحط الصیام ولم یتعب

اذا الناس صلوا فلا تنھضی　　　واذا صاموا فکلی واشربی

ولا تطلبین السعی عند الصفا　　　ولا ذورۃ القبر فی یثرب

ولا تمنعی نفسک المعرسین　　　من الاقربین ومن اجنبی

فکیف تحلی لھذا الغریب　　　وصرت محرمۃ للاب

الیس الغی اس من دبہ ………… و ر ا دا ہی فی الوہن المجدب

وما الخمر الا کماء السماء ………… حلال تقدست من مذہب

تمام انبیائے ماسلف کے لئے شریعتیں رہیں اور یہ اس نبی کی شریعت ہے۔

اس نبی نے ہم سے واجب نمازیں ساقط کر دیں روزے معاف کر دیئے اور ہمیں تعجب ہے، نہیں ڈالا جب لوگ نماز پڑھیں تو تم نماز نہ پڑھنا اور جب روزے رکھیں تو تم کھانا پینا حج نہ کرنا پیغمبر کی زیارت نہ بجالانا قریبی عزیزوں یا کوئی اجنبی کسی سے شادی کرنے سے باز نہ رہنا۔

بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ تم اجنبی اور غیر مرد کے لئے تو حلال ہو جاؤ اور باپ پر حرام رہو کیا پھل پھلواری پر بونے والے اور آبیاری کرنے والے کا حق نہیں۔

شراب ایسی ہی حلال ہے، جیسا کہ آسمان کا پانی

ان اشعار سے فرقہ قرامطہ کے بنیادی عقائد کی واضح تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اگر واقعاً قرامطہ کے ایسے ہی عقائد تھے تو لازمی طور پر یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ یہ ساری کارستانیاں دشمنان اسلام کی تھیں جو تخریب کاری اور لوگوں کو صحیح راستہ سے گمراہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی صفوں میں گھس آئے تھے۔

قرامطہ کے قائدین یمن کے بہت بڑے حصہ پر قابض ہوئے اور وہاں سے دیگر ممالک میں پھیلے یمن والوں پر قرامطہ کے مظالم کا سلسلہ اس وقت کچھ سست پڑا جب پانچویں صدی ختم ہونے کے قریب تھی اب بھی وہاں کئی ایک قبائل اسماعیلی مذہب پر ہیں انہیں قبائل سے ایک یام قبیلہ ہے جس کے عقائد ہند و پاکستان کے اسماعیلی بوہروں سے ملتے جلتے ہیں اور یہ فرقہ بہ نسبت دیگر اسماعیلی فرقوں کے کسی حد تک معتدل ہے۔ (کشف اسرار الباطنیہ و اخبار القرامطہ تالیف محمد بن مالک یمانی المتوفی ۵۰۰ھ۔ ملل و نحل شہرستانی ص ۲۲۱۔ التبصیر فی الدین ص ۱۲۳)

قرامطہ کا ظہور کس زمانہ میں ہوا اس مذہب کے کون بڑے بڑے رہنما ہوئے اس میں مورخین نے بڑا خلط ملط کیا ہے شہرستانی اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کی تحریک میمون قداح کے ظہور سے پڑی بمقام کوفہ اور ۲۷۶ھ اس میمون قداح کا مسلک یہ تھا کہ جتنے فرائض ہیں وہ سب رموز و اشارات ہیں اس نے غائب و مفقود امام کا عقیدہ رکھنا واجب قرار دیا اس فرقہ والے تمام لذائذ و منہیات کو حلال جانتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مگر کتاب کشف اسرار الباطنیہ والقرامطہ سے جو اہل سنت کے ایک جلیل القدر فقیہ محمد بن مالک یمانی کی تصنیف ہے جن کا انتقال پانچویں صدی ہجری کے درمیان ہوا تھا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن میمون قداح کی ملاقات حمدان اشعث ملقب بہ قرمط سے ہوئی جس نے ۲۶۱ھ میں خروج کیا۔ یہ دونوں ایک ساتھ عمل اور ایک مذہب پر متفق ہوئے اور ہر ایک نے ایک ایک سمت اپنے لئے منتخب کی اور لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف دعوۃ دی۔

ابو الفداء کی تاریخ بتاتی ہے کہ قرامطہ کا اول اول ظہور کوفہ کے مضافات میں ہوا ان کے سرغنہ کا نام فرج بن عثمان ہے یہ فرج بن عثمان مدعی تھا کہ مجھ پر آسمان سے کتاب نازل ہوئی (تاریخ ابی الفداء طبع بیروت ص ۵۴)

ابو الفدا نے قرامطہ کے جو حالات و واقعات لکھے ہیں ان میں کہیں بھی میمون قداح اور اس کے فرزند عبداللہ کا نام نہیں ملتا۔

ہمیں فرقہ قرامطہ کے تمام حالات سے کوئی غرض نہیں نہ ہمیں ان کی چھان بین ہی کرنا مقصود ہے کہ واقعاً وہ کون تھے اور کیا تھے ہمیں تو صرف مورخین اور اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کے اس ظلم و تعدی کی فریاد کرنا ہے کہ انہوں نے محض افترا و بہتان تراشی سے کام لیتے ہوئے فرقہ قرامطہ والوں کو بھی شیعوں ہی میں شمار کیا اور اسی لئے انہوں نے عبداللہ بن میمون اور ان کے باپ کو اس فرقہ کے رہنماؤں میں قرار دیا ہے۔ حالانکہ عبداللہ بن میمون امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کے اصحاب و تلامذہ میں سے تھے ان دونوں اماموں سے انہوں نے حدیثیں روایت کیں ان کا شمار ثقات میں ہوتا تھا عبداللہ بن میمون نے کئی کتابیں بھی لکھیں، ایک بعثت پیغمبر کے متعلق دوسری جنت و نار کے حالات میں۔ طوسی نے مصنفین میں ان کا نام بھی لکھا ہے۔ اسی طرح نجاشی و کشی وغیرہ نے بھی۔ مرزا محمد اپنی کتاب منہج المقال میں لکھتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے عبداللہ بن میمون سے پوچھا تم لوگ مکہ میں کتنے ہو؟ عبداللہ نے کہا کہ ہم چار آدمی ہیں۔ امام نے فرمایا تم لوگ زمین کی تاریکیوں میں خدا کا نور ہو۔

رجال کی بعض کتابوں میں ہے کہ یہ عبداللہ بن میمون زیدیہ عقائد کے حامل تھے اور تلوار لے کر خروج کرنا واجب سمجھتے تھے مگر تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اکثر علمائے رجال نے ان کی وثاقت اور دین و عقیدہ میں ثبات و استقامت کی مدح و ستائش کی ہے (منہج المقال مرزا محمد ص۲۱۲ کشی ص۱۶۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ بن میمون قداح اور ان کے والد میمون دونوں شیعیان اہل بیتؑ اور انکے شاگردوں سے تھے شہرستانی اور فقیہ اہل سنت محمد بن مالک نے جو کچھ بھی ان باپ بیٹوں کے متعلق لکھا ہے انکا کہیں بھی اور نشان نہیں سب سے بڑی بات یہ کہ شہرستانی نے عبداللہ القداح کے ظہور کا جو زمانہ لکھا ہے کہ فلاں سن میں اس نے قرامطہ کے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کی یہ اس زمانہ کے قطعی مغائر ہے جو اسرار باطنیہ کے مصنف محمد بن مالک نے معین کیا ہے۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ عبداللہ القداح نے سنہ ۲۷۶ھ میں قرامطہ کے نظریات کی تبلیغ و اشاعت شروع کی اور محمد بن مالک لکھتے ہیں کہ سنہ ۲۷۸ھ میں قرامطہ کی ملاقات میمون قداح اور ان کے فرزند عبداللہ سے ہوئی۔

یہ دونوں ہی قول غلط ہیں۔ فرقہ شیعہ کے تمام مولفین اور علمائے رجال نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ عبداللہ اور انکے باپ میمون امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کے زمانہ کے تھے اور یہ طے شدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی وفات سنہ ۱۴۸ھ میں ہوئی اور امام محمد باقرؑ کا انتقال سنہ ۱۱۴ھ میں ہوا اندازہ زمانہ جس میں عبداللہ القداح کا وجود رہا نہ تو اس زمانہ سے ملتا ہے جس کے شہرستانی مدعی ہیں نہ اس زمانہ سے جس میں قرامطہ کا ظہور ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کی ورق گردانی اور چھان بین کرنے پر ایک سے ایک عجوبے نظر کے سامنے آتے ہیں کذب و افترا کی شرمناک مثالیں اور حقائق پر صریحی ظلم اور یہی سب چیزیں تاریخ کی اکثر باتوں کو مشکوک بنا دیتی ہیں خصوصیت کے ساتھ وہ باتیں جو شیعوں کے متعلق لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فرقوں پر کتابیں لکھنے والوں نے خواہ وہ آج کل کے ہوں یا پہلے زمانہ کے ایسے ہی بہت سے فرقوں کے نام گنائے ہیں اور محض شیعوں کو بدنام کرنے ان کے عقائد اور اصول دین کو قابل تمسخر ثابت کرنے کے لئے ان سب کو شیعوں کی طرف منسوب کردیا ہے جیسے ناووسیہ۔ خمطیہ۔ زراریہ ہشامیہ حسینیہ حسین ابن ابی منصور کے پیرو جن کا بقول علمائے اہل سنت دعویٰ تھا کہ امام محمد باقرؑ نے ابو منصور کو اپنا وصی مقرر کیا۔

واقفیہ جو امام موسیٰ کاظمؑ پر آکر رک گئے فرقہ بشیریہ محمد بن بشیر کے اصحاب جس نے امام موسیٰ کاظمؑ کی غیبت کا دعویٰ کیا تھا نیز یہ کہ آپ نے اپنی غیبت میں مجھے اپنا جانشین مقرر کیا ہے اسی طرح کے اور بیسیوں فرقوں کے نام گنائے گئے ہیں اور سب شیعوں کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ مورخین اہل سنت نے شیعوں کے جن جن فرقوں کے نام گنائے ہیں ان کا کہیں نام ونشان بھی باقی نہیں نہ تاریخ میں ان مذاہب کے نام لیواؤں کا کوئی ذکر اذکار موجود ہے بس صرف نظریات و افکار ہیں جو زیادہ سے زیادہ ان مذاہب کے دعاۃ و مبلغین تک محدود رہے انھیں نے ان نظریات و افکار کی تخلیق کی انھیں نے اشاعت کی اور ان کے مرنے کے بعد ان کے نظریات و افکار بھی مر گئے اس کی تائید شیخ مفیدؒ کے اس فقرہ سے ہوتی ہے کہ

"وہ فرقے جو شیعوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں چوتھی صدی ہجری میں ان کا کوئی وجود نہ تھا نہ اس صدی میں ان کا کوئی وجود ہے آج کل جتنے بھی شیعہ ہیں سب ہی حضرت حجت ابن عسکری کی امامت کے قائل ہیں انھیں میں علماء بھی داخل ہیں فقہاء و متکلمین بھی فخر روزگار عباد صالحین بھی ادباء و شعراء بھی۔ یہی اصل تصویر ہیں تشیع کی اور انھیں پر مذہب شیعہ کے بارے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر فرقے محض خیالی ہیں ان کا اس زمانہ میں کوئی وجود نہیں البتہ قصے کہانیاں رہ گئی ہیں جو ان کا وجود بتاتی ہیں۔"

شیخ مفید کا یہ فقرہ جس طرح یہ بتاتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں ان فرقوں کا کوئی وجود نہ تھا اسی طرح یہ بھی بتاتا ہے کہ ان فرقوں کا اصل وجود ہی مشکوک ہے۔ یہ فرقے کبھی وجود میں آئے ہی نہیں یہ کس کی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ایسے فرقے پائے بھی جائیں ان میں ایسے خصوصیات و امتیازات بھی موجود ہوں اور آناً فاناً نیست و نابود بھی ہو جائیں انکا نام و نشان ہی باقی نہ رہے اگر اس قسم کے فرقے واقعاً وجود ہوتے تو انھیں ایسے مددگار بھی ضرور مل جاتے جو انکی اشاعت اور بقا کی آسانیاں فراہم کردیتے حکام و سلاطین تو ہر ایسی بات کو دل و جان سے قبول کر لیتے جو شیعوں میں پراگندگی پھیلانے والی اور حقیقی ائمہ اہل بیتؑ سے جدا کرنے والی ہوتی تھیں وہ اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتے کہ کچھ دنوں تک تو اس مذہب کا نام چلتا رہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ تمام شیعوں کا ایمان اور ان کے سوچنے سمجھنے کا انداز ایک ہی جیسا نہ تھا جن حالات سے وہ دوچار تھے ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کچھ لوگ تردد اور حیرت و سرگشتگی میں پڑ کر بعض اوقات غیر شرعی امام کو امام مان لیں مگر بہت جلد ہی ان پر حقائق منکشف ہو جاتے اور جانچنے پر کھنے کے بعد صحیح صورت انکے سامنے آجاتی شیعوں کے دشمنوں نے اسی

اسی تردد اور شتابی کیفیت سے جس میں کبھی کبھی بعض شیعہ مبتلا ہوتے رہے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور انکی طرف جیسوں فرقے منسوب کر دیئے ایسے ایسے فرقے اور ان کے ایسے ایسے عقائد جو اسلام ہی سے خارج ہیں۔ ان دشمنوں نے ان فرقوں کے سارے گناہ و ثواب شیعوں کے سر تھوپ دیئے۔

شیعوں کی طرف جو فرقے منسوب کئے جاتے ہیں جن نظریات و عقائد کی نسبت ان فرقوں کی طرف دی جاتی ہے اگر انکا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے اور پوری طرح چھان بین کی جائے تو یہ حقیقت آئینہ ہو کر رہتی ہے کہ تاریخ بہت مضبوط ہاتھوں کا کھلونا بنی رہی اس میں جو چیزیں درج ہو سکیں جو ان مضبوط ہاتھوں کے لئے مفید مطلب ہوئیں یہ مضبوط ہاتھ شکوک و شبہات کو جنم دیکر حقائق کو مسخ کرکے ہمیشہ تشیع سے برسرپیکار رہے۔ اموی و عباسی سلاطین نے دیکھا کہ خلافت کے متعلق شیعوں کا انداز فکر یہ ہے کہ تمام وہ حکومتیں جن کی بنیاد وصایت پر نہ ہو یعنی پیغمبر خدا کی طرف سے کوئی صراحت نہ ہوئی ہو وہ ناجائز اور غیر شرعی ہیں چنانچہ انھوں نے مختلف طریقوں سے اس انداز فکر کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک خیالی شخصیت عبداللہ بن سبا کی تخلیق کی اور تاریخ نے اپنے دامن میں بڑے شد و مد سے اُسے جگہ دی اس عبداللہ بن سبا نے جو اندرونی طور پر پکا یہودی تھا محض تعلیمات اسلامی کو غارت کرنے اور مسلمانوں کو فریب دینے کے لئے ظاہری طور پر اسلام ظاہر کیا اس نے ایک فرقہ کی بنیاد رکھی اور اس فرقہ کو حضرت عثمان کے قتل پر صف بستہ کیا نظریہ وصایت (یعنی یہ کہ پیغمبر خدا نے علی کو اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے جس کے امامیہ معتقد ہیں) اسی کی ایجاد ہے۔ آگے چل کر اسنے علی کی الوہیت کا دعویٰ کیا یہی عبداللہ بن سبا تمام تخریب کاروں اور دشمنان اسلام کا نقطہ مرکزی ہے اسلام کی تباہی و بربادی جس نے بھی کی یا اندھی اسی کے سہارے قرآن و حدیث رسول کے مقرر کردہ اسلامی دستور و قوانین سے جس نے بھی بغاوت کی اسی کی تعلیمات کی بدولت۔ حالانکہ اگر تاریخ کی صحیح طور پر چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نام کا کوئی شخص کبھی دنیا میں گزرا ہی نہیں مگر اسکو کیا کیا جائے کہ تمام قدیمی مورخین اور عصر حاضر کے ارباب قلم اس کے وجود کو ایسا ہی یقینی سمجھتے ہیں جیسے بلا تشبیہ حضرت عیسیٰ کا وجود جس نے بھی اسلامی فرقوں کی تاریخ میں کوئی کتاب تصنیف کی اور تشیع کے ذکر پر پہونچا یہی دعویٰ کیا کہ علی کے وصی پیغمبر ہونے کا نظریہ عبداللہ بن سبا کے ایجادات سے ہے اسی طرح رجعت کا عقیدہ اور نظریہ اشتراکیت بھی اسی کی ایجاد ہے جس کے سب سے بڑے مبلغ ابوذر صحابی پیغمبر تھے۔ یہ عبداللہ بن سبا صنعاء یمن کا یہودی تھا حضرت عثمان کے زمانہ میں اس نے ظاہری طور پر اسلام ظاہر کیا دل میں اسلام کی بدخواہی اور مکر و فریب چھپائے رہا اس نے ہر ہر آبادی میں گھوم پھر کر زہر پھیلایا حضرت عثمان کے خلاف لوگوں کو صف بستہ کرنے اور علی کی طرف لوگوں کو بلانے میں اہم کردار ادا کئے۔ احمد امین بھی یہی کہتے ہیں اور دیگر مورخین اہل عرب اور مستشرقین یورپ بھی یہی۔

مقریزی لکھتے ہیں:

"عبداللہ بن سبا نے سب سے پہلے یہ بات زبان سے نکال کہ پیغمبر خدا نے علی کو اپنا وصی اور اپنے بعد کے لئے امام مقرر کیا تھا چنانچہ وہی نص پیغمبر کی وجہ سے وصی رسول اور مسلمانوں میں آپ کے خلیفہ ہیں نیز اسی نے یہ بات بھی کہی کہ علی مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں پلٹ کر آئیں گے اور رسول اللہ بھی آئیں گے اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ علی قتل نہیں ہوئے وہ زندہ ہیں ان میں جزو الٰہی ہے وہ عنقریب بادلوں میں آئیں گے۔"

اسی سلسلہ میں مقریزی لکھتے ہیں :

ابن سبا کے اقوال کی روشنی میں غالی رافضیوں نے بہت سے اضافے کئے اور وقف کے قائل ہوئے مطلب یہ ہے کہ امامت چند اشخاص پر موقوف ہے۔

نیز ان غالیوں نے امام کی غیبت اور مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں پلٹ کر آنے کا عقیدہ اختیار کیا جیسا کہ شیعہ امامیہ صاحب سرداب (حضرت حجۃ) کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہی عبد اللہ بن سبا تناسخ کا قائل تھا نیز یہ کہ خدا کا ایک جزء ائمہ کے بدن میں حلول کر گیا اور اسی وجہ سے وہ واجبی طور پر مستحقین امامت ہیں جس طرح آدم واجبی طور پر ملائکہ کے سجدہ کے مستحق تھے۔

مقریزی مزید لکھتے ہیں :

اسی عبد اللہ بن سبا کے انصار اور پیروؤں کی وجہ سے جو بلاد و امصار میں پھیلے ہوئے تھے شیعوں کی کثرت ہوئی اور ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی اور ان کا معاملہ روز بروز زور پکڑتا جاتا ہے۔ بعض اہل سنت مورخین اور ارباب قلم نے تو دشمنی میں اسراف سے کام لیا ہے کہ ہٹ دھرمی کی انتہا کر دی وہ مسلم الثبوت حقائق تک کو جھٹلا بیٹھے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں تجسیم اور تشبیہ کا مورد و مصدر شیعہ ہیں یعنی مسلمانوں میں بہت سے لوگ جو مجسمہ اور مشبہہ ہوئے جو خدا کو جسم و جسمانیات والا ثابت کرتے ہیں اور خدا کو غیر خدا سے تشبیہ دیتے ہیں اس کی جڑ بنیاد شیعہ ہیں شیعوں ہی کے ذریعہ یہ عقائد اسلام میں داخل ہوئے اور شیعوں نے یہ چیز عبد اللہ بن سبا سے لی تھی۔ علی الغرابی اپنی کتاب تاریخ الفرق میں لکھتے ہیں :۔

”قدیمی محدثین اہل سنت ان آیات کی تاویل کرنا اپنے لئے جائز نہیں سمجھتے تھے جن کے ظاہری الفاظ سے تجسیم کا وہم ہوتا تھا جیسے کلام مجید کی آیت ولتصنع علی عینی نوح کشتی کو میری آنکھوں کے سامنے بنا دیا جیسے ید اللہ فوق ایدیھم۔ خدا کا ہاتھ ان سب کے ہاتھوں پر ہے الرحمان علی العرش استوی اسی قسم کی دوسری آیتوں کا مطلب ان محدثین نے معتزلہ کے برخلاف وہی سمجھا جو آیتوں کے ظاہری الفاظ کا مطلب تھا ان محدثین اہل سنت میں احمد بن حنبل اور داؤد ظاہری بھی ہیں اور دوسرے فقہاء محدثین بھی۔ ان حضرات کا یہ موقف تسلیم و انقیاد کا موقف قرار دیا گیا ہے۔“

اسی سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں :۔

ان حضرات کو مشبہہ کہنا ہمارے لئے ٹھیک نہیں ہم انھیں اصحاب تسلیم البتہ کہہ سکتے ہیں مشبہہ تو شیعہ ہیں اور ان شیعوں میں سے ایک جماعت یونسیہ بھی ہے جو یونس بن عبد الرحمان کے پیرو تھے[1]

غرابی اتنے ہی بس نہیں کرتے بلکہ آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

---

[1] یونس بن عبد الرحمان اکابر علمائے امامیہ سے ہیں استقامت دینی اور سلامت العقیدہ میں کافی مشہور اور ائمہ طاہرین سے انکی وابستگی مسلم و معلوم ہے وہ ائمہ طاہرین جنھوں نے عقیدہ اسلامی کی عمارت قائم کی ملحدوں کے حملوں اور معتزلہ و محدثین اہل سنت کی تہمت تراشیوں کا سد باب کیا۔ ائمہ طاہرین سے ہم اگر انصراف نظر کر لیں یونس کی مدت زندگانی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے افکار و خیالات میں بہت نکھرے اور منقعہ علیہ کے عالم و متبحر تھے انھوں نے محدثین اہلسنت اور معتزلہ سے بڑے معرکے کے مناظرے کئے۔ ان حضرات سے جب ان کا مقابلہ ممکن نہ ہو سکا تو انھیں تجسیم کی تہمت لگا دی۔

"تشبیہ کا نظریہ یہودی نظریہ ہے مشبہہ کا اولین فرد عبداللہ بن سبا تھا جس نے حضرت عثمان کے زمانہ میں فتنہ کھڑا کیا... شیعوں نے عقیدہ تشبیہ وحلول اور اُن تمام صفات کو دل سے قبول کیا جو شان الوہیت کے منافی ہیں اس لئے کہ اس عقیدہ سے ان کے نظریہ امامت کی تائید ہوتی تھی"

اہل سنت کے اسی قسم کے بہت سے دعوے اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ شیعوں پر اُن کے آئے دن کے حملے اور نت نئی تہمت تراشیاں محض اس مقصد سے رہیں کہ دنیا والوں کی نظروں میں شیعوں کو مشکوک بنا دیا جائے اور دنیا والوں کو یہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے کہ تشیع اور پیروی اہل بیتؑ ہے کیا چیز!

تشبیہ وتجسیم اور حلول کے خود متقدمین علماء ومحدثین اہل سنت قائل تھے لیکن ارباب قلم اور مصنفین اہل سنت نے اسے شیعوں کے سر تھوپ دیا کہ انھیں سے ان عقائد کا آغاز ہوا شیعوں پر تہمت دھرنے کے لئے انھیں عبداللہ بن سبا کا بہانہ بھی ہاتھ آگیا جو لوگ خیالی اشخاص کی تخلیق کر سکتے ہیں جن کا کبھی بھی دنیا میں وجود نہ رہا ان کے لئے ان خیالی اشخاص کے عقائد تصنیف کر ڈالنا ہوا میں محل تعمیر کرنا یا سطح آب پر بڑی سے بڑی عمارت کھڑی کر لینا کیا مشکل ہے۔

خود علی غرابی جو مکہ مکرمہ کے کلیہ شرعیہ کے مدرس ہیں تسلیم کرتے ہیں کہ محدثین اہلسنت نے ان آیات کی تاویل نہیں کی جنکے ظاہری الفاظ بتاتے ہیں کہ خدا کے چہرہ بھی ہے آنکھیں بھی ہاتھ بھی اور دیگر اعضا بھی اور جب وہ تاویل ضروری نہیں سمجھتے تھے تو ظاہر کہ وہ آیات کا وہی مطلب لیتے تھے جو ظاہری الفاظ سنتے ہی فوراً ذہن میں آتے ہیں پھر بھی اُن کی طرف نہ تو تجسیم کی نسبت دی جا سکتی ہے نہ تشبیہ کی۔ بلکہ اسے عبداللہ بن سبا کے بہانے شیعوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ شیعہ ائمہ اہل بیتؑ کے ارشادات کے سختی سے پابند ہیں وہ عقائد اسلامی کے متعلق ان حدود سے تجاوز کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ائمہ اہل بیتؑ متعین فرما گئے ہیں۔

ہم آگے چل کر اصول دین اسلام کے متعلق اسلامی فرقوں کے خیالات اور رایوں کا ذکر کرینگے جس سے یہ حقیقت پوری طرح آئینہ ہو جائے گی کہ شیعوں کے عقائد توحید و عدل ونبوۃ اور دیگر اصول دین کے بارے میں عین مطابق واقع ہیں انھوں نے ان حدود سے رتی برابر بھی تجاوز نہیں کیا جو خداوند عالم نے قرآن میں متعین کئے ہیں یا زبان رسالت نے جن کی نشاندہی فرمائی ہے۔ رہ گئیں برادران اہل سنت کی تہمت تراشیاں اور افتراپردازیاں تو اس سے حقیقت پر کوئی آنچ نہیں آنے کی۔

عبداللہ بن سبا کی شخصیت کے وہمی وخیالی ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس قصہ ابن سبا کو سب سے پہلے طبری نے اپنی کتاب میں درج کیا دی واحد مورد و مصدر ہیں اس قصہ کے ان سے پہلے نہ کسی مورخ نے اس کا ذکر کیا نہ محدث نے نہ مفسر نے طبری کے بعد جتنے آئے سبھی نے آنکھ بند کر کے ان پر اعتماد کیا اور اس قصہ ابن سبا کو اپنی کتاب میں درج کر ڈالا جیسے یہ تاریخی مسلمات سے ہو جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ تو سب سے پہلے اس قصہ کو طبری نے اپنی تاریخ طبری میں درج کیا اور انھوں نے اس قصہ کو سیف بن عمر تمیمی سے لیا جس کا انتقال ۱۷۰ھ میں ہوا تھا یہ سیف بن عمر اصل میں کوفہ کا رہنے والا تھا اور بغداد میں رہا کرتا تھا کذب افترا اور جعل گری میں کافی مشہور تھا اس پر زندقہ کی تہمت بھی لگائی گئی ہے سید مرتضیٰ عسکری نے اپنی کتاب عبداللہ بن سبا میں بیشمار محدثین اور علماء رجال کے وہ اقوال درج کئے ہیں جو انھوں نے سیف کے متعلق فرمائے اور سبھی نے متفقہ طور پر اسے ناقابل

اعتبار کہا ہے اور اسکی روایتوں پر بھروسہ کرنا ناجائز قرار دیا ہے۔

مرتضیٰ عسکری نے محدثین اور علمائے رجال کے جو اقوال اس سیف بن عمر کے متعلق نقل کئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ابن سبا کے قصہ کا موجد سیف بن عمر تمام محدثین کے نزدیک جانا پہچانا تھا اسی لئے کسی نے بھی اسکے متعلق ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جس سے اسکی بیان کردہ روایتوں کے قابل قبول ہونے کا گمان ہو سکے۔ اس قصہ ابن سبا کے بے سروپا ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جن جن مورخین نے ابن سبا کے واقعات لکھے ہیں کسی کی روایتوں کا سلسلہ اسی سیف پر جاکر ختم ہوا حالانکہ اس سیف میں اور اس زمانہ میں جس میں ابن سبا کے ظہور کا دعویٰ کیا جاتا ہے ۱۴۰ برس کی مدت حائل تھی اور اس ۱۴۰ برس کی مدت میں بہت سے ایسے واقعات ظہور میں آئے جنکے نشو ونما اور پھلنے پھولنے میں عبداللہ بن سبا کے خیالات واقوال کو بہت بڑا دخل حاصل رہا۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص جس کو اتنی غیر معمولی صلاحیتیں حاصل تھیں جس کے اقوال ونظریات میں ایسی بے پناہ اثر انگیزی تھی جو اپنی ساحرانہ طاقتوں سے جو چاہتا تھا کر گزرتا تھا ایسا شخص نہ تھا کہ سیف بن عمر سے پہلے کے مسلمان اس کو بھلائے رکھتے کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہ لاتے ۱۴۰ برس کے بعد سیف بن عمر نے آکر اسکا نام زندہ کیا اور دنیا والوں کو بتایا کہ حضرت عثمان کے زمانہ سے آجتک جو بڑے بڑے واقعات پیش آئے وہ سب عبداللہ بن سبا اور اس کی ریشہ دوانیوں کے سبب۔ اس زمانہ کے مسلمان تو معمولی معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے تدوین وتالیف اور واقعات کو قلمبند کرنے کا سلسلہ دوسری صدی ہجری سے شروع ہو چکا تھا خصوصیت کے ساتھ وہ واقعات جنکا اسلامی اُمور سے تعلق تھا اور یہ ظاہر ہے کہ سبائیوں کے کرتوت مسلمانوں کی تاریخ کے سب سے نمایاں واقعات تھے اور جیسا کہ بعض مورخین اور ارباب قلم کا خیال ہے اسکے اثرات آج بھی باقی ہیں۔ اسلئے کہ ان سبائیوں نے حضرت عثمان کے خلاف عوام الناس کو برانگیختہ کرنے میں بڑے ہی دہشتناک کارنامے انجام دیئے تھے انھیں نے مسلمانوں میں وصایت اور رجعت کے نظریہ کی اشاعت کی علیؑ کی خدائی اور الوہیت کا پرچار کیا اور قتل ہوئے اور زندہ جلائے جانے کے بعد بھی وہ ان نظریات کی تبلیغ واشاعت سے باز نہ آئے۔

پھر بھی ان سبائیوں کو مسلمان ان کے علماء ان کے محدثین بھلائے بیٹھے رہے کسی کا دھیان ہی اسطرف نہیں گیا بس لے دیکر سیف ابن عمر کو سب سے پہلے ان سبائیوں کا خیال ہوا وہ بھی اسوقت جبکہ ایک صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی اور اسوقت انہی ان تاریخی حقائق کو قلمبند کیا جو اس سے پہلے کے تمام ارباب قلم سے مخفی رہ گئے تھے اسی سیف بن عمر کو تن تنہا وہ واقعات یاد آئے اور اس سے تمام مورخین و مولفین نے لیا اور یہ سمجھ کر لیا کہ یہ ایسے حقائق ہیں جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

بہرحال اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عبداللہ بن سبا جسے مکر وفریب کا مجسمہ اور فتنہ وفساد کا ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاریخ کی وہ شرمناک کہانی ہے جو محض شیعوں کو بدنام ورسوا کرنے کے لئے تصنیف کی گئی اور اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ان فرقوں کا کبھی وجود تھا ہم ان تمام باتوں سے چشم پوشی بھی کر لیں جو ان فرقوں کے معرض وجود میں آنے کے متعلق کہی جاتی ہیں ان تمام اقوال و نظریات کو بھی ہم نظر انداز کر دیں جو ان فرقوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ جن فرقوں کے نام لئے جاتے ہیں انکا وجود رہا ہر فرقہ کے کچھ پیرو اور انصار بھی تھے اصول وفروع دین میں دیگر اسلامی فرقوں کے مقابل وہ اپنے خصوصی عقائد و نظریات بھی رکھتے تھے۔ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ یہ فرقے ایک طویل عرصہ تک موجود رہے پھر بھی ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آخر

ان فرقوں کو شیعوں میں کیوں شمار کیا جاتا ہے جب یہ تسلیم ہے کہ یہ فرقے ان تمام فرقوں سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں جو صحیح عقائد اسلام کے حامل ہیں جب یہ فرقے بہت سے ایسے نرالے عقائد و معتقدات رکھتے تھے جن کو تعلیمات اسلامی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا تو آخر انھیں شیعہ ہی کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اور انکے قول و فعل کی ذمہ داری شیعیان اہل بیتؑ کے سر کیوں ڈالی جاتی ہے؟

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں اکثر فرقے مسلمان تک کہے جانے کے قابل نہیں چہ جائیکہ انھیں شیعہ کہا جائے جو اصول و فروع میں قرآن و حدیث سے سر مو تجاوز نہیں کرتے اسلئے کہ تشیع صرف علیؑ و اولاد علیؑ کی محبت ہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کتاب و نبوۃ اور پیغمبر خدا کی لائی ہوئی تمام باتوں پر ایمان لانے کا بھی نام ہے لہٰذا ایسا شخص جو پیغمبر خدا کی نبوۃ کا منکر ہو یا بعض ضروریات دین کا انکاری ہو جو خداوند عالم نے اپنی کتاب میں فرض کئے ہیں وہ قطعی طور پر اسلام سے خارج ہے چہ جائیکہ ایسا شخص جو کسی انسان کی الوہیت کا قائل ہو یا کسی انسان کے لئے بعض خداوندی صفات و خصوصیات کا عقیدہ رکھتا ہو۔

کتنے رنج و افسوس کی بات ہے کہ علامہ محمد ابو زہرہ مصری نے اپنی کتاب مذاہب اسلامیہ میں انھیں بعض گمراہ فرقوں کے معتقدات کی آڑ لے کر شیعوں پر سخت و شدید حملے اور تہمت تراشیاں کی ہیں چنانچہ اثنا عشری فرقہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ جماعت جو شیعہ امامیہ نام کی حامل ہے اس میں شیعوں کے اکثر فرقے داخل ہیں جو آج دنیائے اسلام میں پائے جاتے ہیں ایران عراق پاکستان اور دیگر اسلامی ملکوں میں اور بعض دوسرے فرقے بھی جو اپنے اعتقادات میں اس درجہ منحرف نہیں ہیں جو قرآن کی کسی نص یا ضروریات دین میں سے کسی ضروری چیز کے مخالف ہیں۔ نیز دوسرے فرقے بھی جو اپنے اعتقادات و اعمال کو مخفی رکھتے ہیں اور انحراف شدید کے سبب اسلام میں داخل نہیں۔" (مذاہب اسلامیہ شیخ محمد ابو زہرہ ص [illegible])

علامہ ابو زہرہ دوسرے مصنفین کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ امامیہ کا نام ان تمام فرقوں کو شامل ہے حتیٰ کہ ان فرقوں کو بھی جو اپنے اعتقادات کو حد سے زیادہ چھپائے رکھتے ہیں حالانکہ ابو زہرہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بفرض محال اگر ان فرقوں کو شیعہ کے نام سے موسوم بھی کر دیا جائے تب بھی انھیں امامیہ کہنا تو کسی طرح ممکن نہیں خصوصیت کے ساتھ ان فرقوں کو جو اپنے عقائد حد سے زیادہ مخفی رکھتے ہیں جو تناسخ حلول اور اباحت محرمات کے قائل ہیں نیز اور بہت سی باتیں جو فرقہ اسماعیلیہ اور دوسرے فرقوں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اس لئے کہ امامیہ کا لفظ بس انھیں لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو سلسلہ امامت حضرت حجۃ محمد بن الحسنؑ امام زمانہ تک لے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی پر امامیہ کا اطلاق نہیں ہوتا حتیٰ کہ زیدیوں پر بھی نہیں شیعوں کی تمام نئی پرانی کتابیں صاف صاف لفظوں میں کہہ رہی ہیں کہ امامیہ بس وہی لوگ ہیں جو علیؑ اور ان کی اولاد کے حقدار خلافت ہونے کے معتقد ہیں اس بنا پر کہ انکے اسمائے گرامی کی بھی صراحت کی جا چکی ہے اور ان کے اوصاف کی بھی۔ امامیہ کے علاوہ دوسرے فرقوں کو زیادہ سے زیادہ شیعہ کہا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ علیؑ کو تنہا حقدار خلافت سمجھتے ہوں اور اپنے عقائد میں اصول و ضروریات اسلام سے خارج نہ ہوں۔

یہ کتنی ناانصافی اور زیادتی ہے کہ اکثر مصنفین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان فرقوں نے محبت اہل بیتؑ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا ان فرقوں کی چھان بین کر کے اس نتیجہ پر بھی پہونچے ہیں کہ یہ فرقے گمراہ اور کھلے ہوئے اسلام کے دشمن تھے ان سب کے باوجود ان کا یہ خیال ہو کہ تشیع کی لفظ ان سب کو شامل ہے وہ بڑے شد و مد سے یہ کہتے ہیں کہ ہر بدعت اور تمام خرافات اور ان تمام لوگوں کا جو اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں نقطہ مرکزی ہے اسم تشیع جب کہ حقیقت حال یہ ہو کہ شیعوں کے نزدیک

صرف امامت کا اعتقاد کافی نہیں نہ کوئی شخص صرف امامت کا اعتقاد رکھ کر مسلمان ہو سکتا ہے جب تک وہ خدا رسول کتاب خدا روز آخرت پر اور ان تمام باتوں پر بھی ایمان نہ لائے جو پیغمبرؐ خدا لے کر آئے تھے لطف یہ ہے کہ اگر اہل سنت کی کتابوں کی چھان بین کی جائے تو ان کتابوں میں بہت سے اقوال و نظریات ایسے ملیں گے جو اپنی رکاکت اور شرمناکیوں میں ان فرقوں کے اقوال و نظریات سے ہرگز کم نہیں جنھیں علمائے اہل سنت شیعوں میں محسوب کرتے ہیں۔ علمائے اہل سنت نے شیعوں کا ایک فرقہ، فرقہ غرابیہ بھی گنایا ہے۔ ایک شخص نے دعویٰ کیا تھا کہ اصل نبوۃ علیؑ کی تھی مگر جبرئیل غلطی سے وحی لے کر محمد مصطفےٰ کے پاس پہونچ گئے کیونکہ محمد مصطفےٰ اور علیؑ میں ویسی ہی مماثلت تھی جیسے ایک کوے کو دوسرے کوے سے ہوتی ہے مگر خود علمائے اہل سنت کی کتابوں میں اس مقالہ سے زیادہ شرمناک مقالہ حضرت ابوبکر و عمر کے متعلق موجود ہے پھر بھی علمائے اہلسنت ان مقالات والوں کو اہل سنت ہی میں داخل سمجھتے ہیں۔

علمائے اہلسنت نے روایت کی ہے کہ پیغمبر خدا نے فرمایا۔ اگر میں مبعوث بہ رسالت نہ ہوا ہوتا تو تم میں عمر مبعوث ہوئے ہوتے نیز آپ نے ارشاد فرمایا جب بھی تین دن تک وحی کا سلسلہ رکا رہا مجھے یہی خیال ہوا کہ کہیں وحی عمر کے پاس پہنچ نہ گئی ہو۔ (دیکھئے کتاب التعجب مولفہ شیخ ابو الفتح الکراجکی جن کا انتقال چوتھی صدی ہجری میں ہوا)

یہ روایت ایک طرف تو یہ بتاتی ہے کہ حضرت عمر میں بھی پیغمبر ہی جیسی صلاحیت نبوۃ تھی دوسری طرف یہ کہ پیغمبر خدا کو اپنی نبوت کا خود یقین کامل نہ تھا اس لئے کہ جب بھی نزول وحی میں تاخیر ہوتی آپ نے یہی خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے جبرئیل امین عمر کے پاس پہنچ گئے ہیں۔

ایک اور روایت ہے کہ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا کہ اے محمدؐ تمھارا پروردگار تم کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ میری طرف سے ابوبکر کو سلام پہونچا دو اور کہو کہ تمھارا خدا تمھیں سلام کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تم سے راضی ہوں کیا تم بھی مجھ سے راضی ہو۔

ایک اور روایت ہے کہ پیغمبرؐ خدا مرکب پر سوار اور ابوبکر پیدل چلے جا رہے تھے خدا نے پیغمبر پر وحی کی کہ تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم خود تو سوار ہو اور ابوبکر پیدل چل رہے ہیں (کتاب التعجب ص ۵۸)

یہ دونوں روایتیں بتاتی ہیں کہ ابوبکر کی شان پیغمبرؐ کی شان سے بھی بڑھی ہوئی تھی خداوند عالم نے پیغمبر خدا کو سرزنش کی اور بے شرم قرار دیا صرف اس وجہ سے کہ آپ مرکب پر سوار تھے اور ابوبکر پیدل چل رہے تھے نیز یہ کہ خداوند عالم ابوبکر کی رضا و خوشنودی کا طلبگار تھا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان غلاۃ نے جنھیں زبردستی شیعوں میں شمار کیا جاتا ہے شاید ہی اس سے شرمناک تر کوئی بات کہی ہو۔ فرقہ غرابیہ نے صرف یہی ایک بات کہی ہے کہ محمدؐ و علیؑ ایک دوسرے سے اس طرح ملتے جلتے تھے جیسے ایک کوا دوسرے کوے سے مگر یہ بات ان باتوں سے اگر کم شرمناک نہیں تو زیادہ بھی نہیں۔

ہمیں جس طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ ان نرالے نظریات و خیالات والے ہرگز شیعہ نہ تھے اسی طرح ہم اس میں بھی شک نہیں کرتے کہ ابوبکر و عمر کے متعلق اس حد تک غلو کرنے والے بس گنتی ہی کے لوگ رہے ہوں گے انھوں نے اپنے مقالات میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ جمہور اہل سنت کے خیالات نہیں۔

چوتھی فصل

اعتقادی مذاہب

ہم نے گذشتہ فصل میں شروع زمانۂ اسلام کے بعض عقائد و مذاہب کا ذکر کیا جو سیاسی حیثیت سے ظہور میں آئے اُس وقت اُن فرقوں کا اختلاف صرف مسئلۂ خلافت تک محدود تھا یعنی پیغمبر کے بعد پیغمبر کا جانشین ہونا کسے چاہیئے؟ اس جانشین کا انتخاب کیونکر ہوا؟ اور کن شرائط کا اسمیں ہونا ضروری ہے لیکن جب یہ اختلاف کافی مضبوط ہو گیا اور ایک مدت بھی گذر گئی تو اب یہی اختلاف دوسرے دینی مسائل تک بھی جا پہونچا اور اب مسلمان کئی فرقوں میں بٹ گئے ہر فرقہ اپنی اپنی جگہ مستقل تھا۔ سیاسی حیثیت سے بھی اور دینی حیثیت سے بھی۔

ہم نے بیان کیا کہ شیعوں کا نقطۂ نظر خلافت اسلامیہ کے متعلق کیا تھا خوارج کیا تھے اور کیوں منحرف ہوئے؟ بعض دوسرے فرقوں کا بھی ہم نے ذکر کیا جو محبت اہل بیت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئے تھے اور آخر میں وہ اسلام کی بنیادی باتوں ہی سے منحرف ہو گئے۔

انھیں فرقوں کے پہلو بہ پہلو بعض دوسرے مذاہب بھی پیدا ہوئے جن کا وجود صحابۂ سابقین کے زمانہ میں نہ تھا۔ یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا اور انتہائی سادگی اور بغیر کسی اشتباہی کیفیت کے یہ لوگ اسلام سے متاثر ہوئے۔

ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز میں جو تبدیلی واقع ہوئی یہ ناگزیر سی بات تھی جن حالات و کیفیات کا اس وقت مسلمانوں کو سامنا تھا ان کی بنا پر اُن کے انداز فکر میں تغیر واقع ہونا ضروری ہی تھا۔

اب مسلمانوں کا میل جول دوسری قوموں سے تھا جو عقائد و عادات اور تہذیب و تمدن میں مسلمانوں سے زمین و آسمان کا فرق رکھتے تھے یہ لوگ اگرچہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے لیکن اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے فوراً ہی دل سے اسلام نہیں قبول کر لیا تھا بلکہ بڑی غور و فکر بحث و نظر کی تھی اپنے قدیمی عقائد کو جنھیں باپ دادا سے میراث میں پایا تھا اُن عقائد سے ملا کر دیکھا تھا جو اسلامی حکومت کے تسلط کے سبب انھیں اختیار کرنا پڑے تھے یہ ظاہری بات ہے کہ اسلامی تعلیمات و عقائد کا اُن کے قلب و دماغ میں فوراً سمائی حاصل کر لینا اُتنا ہی آسان نہ تھا اور اگر ہم فرض بھی کر لیں بہت

جلد ہی ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اسلامی عقائد و تعلیمات سنتے ہی ان کے دل میں گھر کر گئے تھے تب بھی اُن کے معتقدات کے متعلق جن شکوک و شبہات کا چرچا عام تھا اُن کی گونج اُن کے کانوں میں اب تک باقی تھی اور ان شکوک و شبہات کو نیا دین اور بڑھاوا دیتا جارہا تھا انسان فاعل مختار ہے یا مجبور، جنت کیا ہے اور جہنم کیا؟ یہ وہ مسائل تھے جو جنگ و جدل نزاع و اختلاف کا پہلے ہی سے موضوع بنے ہوئے تھے، اسلام کے پہلے ہی سے ان پر بحثیں ہوتی چلی آرہی تھیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جہم بن صفوان جس کی طرف فرقۂ جہمیہ منسوب ہے اس بات کا مدعی تھا کہ جنت و جہنم دونوں ایک دن فنا ہو جائیں گے اور اُنھیں کے ساتھ وہ لوگ بھی جو جنت و جہنم میں ہوں گے یہ چیز عیسا کنیساؤں میں پہلے ہی سے جنگ و جدل کا موضوع بنی ہوئی تھی یونانی کنیساؤں کے رہنما ابدیت عذاب قبر کے منکر تھے۔

بعض مستشرقین کا دعوےٰ ہے کہ فرقہ معتزلہ نصرانیت سے پیدا ہوا اس لئے کہ کنیساؤں کے رہنما حرّیت ارادہ۔ انسان کے فاعل مختار و مجبور ہونے کے متعلق آپس میں شدید اختلافات رکھتے تھے اسی طرح صفاتِ خداوندی میں بھی اُن کے اندر کافی نزاع تھی اُنھیں نصرانیوں کے واسطہ سے یہ خیالات معتزلہ میں بھی سرایت کر گئے جبکہ مسلمانوں نے شام فتح کر لیا اور اُن کا میل جول دیگر قوموں سے بڑھا۔

یحییٰ دمشقی ان عیسائیوں میں سے تھا جو مسلمانوں سے کافی گھل مل گئے تھے یہ بڑا سخت نصرانی تھا اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں ایک زبردست کتاب لکھی اس طرح کہ عیسائیت پر ایک اعتراض قائم کرتا پھر اُس کا تفصیلی جواب دیتا اس طرح پوری کتاب اعتراضات اور اُن کے جوابات پر مشتمل تھی یہ اور اس کا باپ دونوں اموی محلات کی تعمیر میں کام کر رہے تھے اُس نے قضا و قدر پر بھی بحث کی اور کہا کہ اللہ خیر کا مصدر ہے اور خیر اسی طرح اس سے صادر ہوتا ہے جس طرح آفتاب سے نور۔ اسی یحییٰ دمشقی اور دیگر عیسائیوں کی پیروی میں معتزلہ نے بھی قدرِ الٰہی اور دیگر صفاتِ خداوندی پر بحث کی (جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے۔

(ضحی الاسلام احمد امین مصری جلد اول ص۳۴۴)

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ کہنا کہ معتزلہ نے اس قسم کے سارے مسائل پر بحث و نظر عیسائیوں ہی سے سیکھی نصاف کے خلاف ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں جب دیگر اقوام دلل والے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے اور عربی مسلمانوں کا ان غیر عربوں سے میل جول ہوا تو چونکہ یہ غیر عرب اپنے افکار و خیالات بھی ساتھ لائے تھے اسلئے مسلمانوں کا اندازِ فکر بھی اُن سے کافی حد تک متاثر ہوا اور اس باہمی میل جول اور طرفین کے نظریات کے

کے تصادم کے نتیجہ میں ہر فریق بیان بین کرنے اور اپنے نظریات کو دوسرے کے نظریات سے ملا کر دیکھنے اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا کہ ہمارے نظریات صحت سے قریب ہیں یا دوسرے ہمارا مذہب حق ہے یا دوسرے مختلف مذاہب۔

لیکن یہ بات کہ مسلمانوں نے بحث و تمحیص اور قضا و قدر جبر و اختیار اور صفات الٰہی میں جھگڑا کرار عیسائیوں سے سیکھا اور ان موضوعات میں انھیں کی رائیں اپنائیں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس لیئے جبر و اختیار صفات کے عین ذات ہونے یا زائد بر ذات ہونے جنّت و نار کی ہمیشگی یا آخر کار اُن کا بھی فنا ہو جانا یہ وہ باتیں ہیں جن سے خود قرآن نے تعرض کیا ہے جو عرب والوں کی زبان میں پہلے نازل ہو چکا تھا یعنی عربوں کے غیر عربوں سے میل جول اور ربط ضبط پیدا ہونے کے پچاس برس پہلے لہٰذا مسلمانوں میں جو لوگ جبر و اختیار کے قائل ہوئے وہ کلام مجید کی ان آیات کی بنا پر ہوئے جن سے جبر کا وہم پیدا ہوتا ہے اسی طرح صفات الٰہی اور دیگر موضوعات جو بعد میں علمی بحث و نزاعات کا موضوع بنے وہ بھی کلام مجید کی آیات کی بنا پر ہی نہ یہ کہ عیسائیوں سے سُن اور سیکھ کر۔

مختصر یہ کہ اسلامی انداز فکر اجنبی فلسفہ اور اغیار کی کتابوں سے بہت کچھ متاثر ہوا ان کتابوں میں بہت سے افکار و خیالات ایسے تھے جو مسلمانوں کے معتقدات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ علمائے کلام اور مذہبی رہنماؤں نے دیگر اقوام و ملل کا فلسفہ اور اُن کی کتابیں پڑھ کر انھیں کی روشنی میں قرآن اور اپنے معتقدات کو دیکھا اور بحث و نظر کی جو راہیں اس فلسفہ اور ان کتابوں میں متعین کی گئی تھیں انھیں راہوں سے انھوں نے دین کو سمجھنے اور دین کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی اب وہ دین کا درس اس طرح دینے لگے جیسے حساب ہندسہ ہیئت اور سارے علوم عقلیہ کا درس دیتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمات اسلامیہ میں گتھیاں اور علماء میں شدید اختلافات پیدا ہو گیا جس کا اندازہ اُن اسلامی فرقوں سے کیا جا سکتا ہے جن کے عقائد و خیالات ایک دوسرے سے کافی تضاد رکھتے ہیں۔

بہر حال مسلمانوں میں ایک تقسیم تو پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ہو گئی تھی اور تقسیم خالص سیاسی اسباب کی بنا پر ہوئی تھی اب عقائد کی بنا پر دوسری تقسیم ہوئی اور نظریات و افکار کے تضاد کی وجہ سے باہمی خصومت و نزاع میں بھی ترقی ہوئی ایک فرقہ معتزلہ بن گیا اور دوسرا مرجئہ تیسرا اشاعرہ کہا جانے لگا جو ابو الحسن اشعری کے پیرو تھے جنھوں نے اہل حدیث کی حمایت کی تھی ان تینوں قسموں میں سے۔ ہر قسم کے لوگوں کا الگ الگ مذہب بن گیا اور ہر ہر مذہب کے لاکھوں پیرو ہو گئے۔ ہر فرقہ نے اپنے معتقدات کے بارے میں تعصب اور جانبداری کی انتہا کر دی یہاں تک جو ان معتقدات کا حامل نہ ہو اُسے کافر و فاسق تک کہہ ڈالا۔ اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان تو تعصب کی اور بھی گرم بازاری رہی خصوصیت کے ساتھ اُس وقت جب معتزلہ کو عباسی حکّام و سلاطین کی پشت پناہی حاصل ہو گئی جنھوں نے معتزلہ کے نظریات و افکار کو دل سے قبول کر لیا تھا اور شاہی دبدبہ و اقتدار سے کام لے کر چاہا کہ تمام رعایا بھی انھیں نظریات و افکار کی حامل ہو جائے اور عمل کرے۔ علماء کو اس زور و زبردستی سے بڑے مصائب و آلام اٹھانے پڑے محض اس قصور پر کہ انھوں نے ان نظریات و افکار میں معتزلہ کی ہمنوائی نہیں کی ان بدسلوکیوں کی وجہ سے محدثین اور اُن کے پیروؤں میں نفرت و بیزاری کا پیدا ہونا لازمی بات تھی مسلمانوں کی اکثریت محدثین ہی کی پیرو تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب

زمانہ نے پلٹا کھایا حکومت متوکل کے ہاتھوں میں آئی اور متوکل نے محدثین کی طرفداری کی تو اب محدثین نے معتزلہ سے وہی سب کچھ کیا جو معتزلہ محدثین کے ساتھ کر چکے تھے معتزلہ قتل کئے گئے انھیں جلا وطن کیا گیا کیونکہ جلا ڈالے گئے اور قید خانے ان معتزلہ سے بھر گئے اور تقریباً دو سو برس سے زیادہ اس کا سلسلہ جاری رہا تو پہلی معرکہ آرائی معتزلہ اور محدثین میں ہوئی پھر معتزلہ اور اشاعرہ میں ہوئی۔ پہلے یہ لڑائی علمی اور نظریاتی لڑائی تھی خالص علمی بنیادوں پر قائم تھی پھر یہ لڑائی گلی کوچوں میں آگئی پہلے پڑھے لکھے لوگ بحث و تکرار کرتے تھے اب ان کے پیروؤں اور حلقہ بگوشوں میں دھینگا مشتی ہونے لگی۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ جنگ صرف معتزلہ اور محدثین ہی میں محدود نہ رہی ایک وقت وہ تھا کہ جب معتزلہ ایکطرف تھے اور محدثین و اشاعرہ ایکطرف مگر آگے چل کر پھر محدثین اور اشاعرہ میں ٹھن گئی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے خصوصیت کے ساتھ اُسوقت جب محدثین نے یہ دیکھا کہ اشاعرہ حدیث کے بارے میں وہ موقف نہیں رکھتے جو ہم رکھتے ہیں ہم تو ہر حدیث کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیتے ہیں اور اشاعرہ اس میں اپنی عقل سے بھی کام لیتے ہیں جب دو حدیثوں میں تعارض ہوتا ہے تو وہ عقل ہی کا فیصلہ قبول کرتے ہیں۔

معتزلہ و اشاعرہ اور محدثین کی باہمی جنگ و جدال کے مقابلہ میں شیعیان اہل بیتؑ و ائمہ طاہرین تھے جو انتہائی ثبات قدم اور پامردی کے ساتھ دین کی حمایت و دفاع میں سرگرمی سے مصروف تھے داخلی یا خارجی طور پر جتنے بھی شکوک و شبہات وارد ہوتے سب کا تشفی بخش طور پر ازالہ کرتے رہے انھوں نے قضا و قدر، جبر و اختیار، صفات خدا، نبی جنت و نار سے بھی بحث کی اور اُن عقلی بحثوں سے بھی جو اس زمانہ کے علما اور دہریوں نے اٹھائی تھیں انھوں نے اپنے مناظرات اور حصول مقصد میں درمیانی راستہ اختیار کیا انھوں نے محدثین کی طرح نہ تو تنہا حدیث پر تکیہ کیا نہ معتزلہ کی طرح تنہا عقل پر جس مسئلہ میں پیغمبرؐ کی کوئی حدیث موجود نہ تھی انھوں نے عقل سے کام لیا لیکن جب حدیث موجود رہی تو سارا اعتماد اسی پر رہا اور اسی کی روشنی میں اصول و فروع حاصل کیے۔

ان اسلامی فرقوں کے نظریات و افکار ذکر کرنے اور اُن کے نظریات اور شیعۂ امامیہ کے نظریات کے درمیان موازنہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم بیان کر دیں کہ ان فرقوں کی تاریخ پیدائش کیا ہے اور اُن کے خصوصیات کیا ہیں جیسا کہ ہم تشیع اور خوارج اور فرقوں کے متعلق جو شیعوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں کر چکے ہیں

مُرجِئہ

مرجئہ عام طور پر اُن لوگوں کو کہتے ہیں جنھوں نے خوارج اور معتزلہ کے بیچ کا راستہ اختیار کیا۔ خوارج کہتے تھے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے اور معتزلہ کہتے تھے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ مرجئہ نے کہا نہیں وہ مومن ہے اور اُس پر عذاب ہونا ضروری نہیں۔

ارجاء کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں تاخیر کرنا دیر کرنا اسی سے ہے ارجأت الامر میں نے اس کام کو بعد

پر اُٹھا رکھا قرآن مجید کی آیت ارجہ و اخاہ وابعث فی المدائن حاشرین میں لفظ ارجہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی موسیٰ اور اُنکے بھائی ہارون کو ابھی چھوڑ رکھو۔

دوسرے معنی ہیں امید دلانا۔

بہت ممکن ہے فرقہ مرجئہ کو پہلے ہی معنی کے لحاظ سے مرجئہ کہا جاتا ہو چونکہ نہ تو وہ خوارج کے ہمنوا ہیں جن کا کہنا تھا کہ گنہگار کافر ہے نہ معتزلہ کے ہمنوا جن کا کہنا تھا کہ گنہگار کو ہم نہ تو مومن ہی کہتے ہیں نہ کافر ہی البتہ یہ یقینی ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ مرجئہ نے کہا نہیں وہ مومن ہے کیونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہے عمل ایمان کا نہ تو جزء ہے نہ شرط لہٰذا کوئی بندہ اگر گناہ کا ارتکاب کرے تو اس سے ایمان کی صفت سلب نہیں ہو سکتی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مومن نہیں رہا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اُنھیں دوسرے معنی کے لحاظ سے مرجئہ کہا جاتا ہو اس لیئے کہ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ معصیت کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی نہ کفر کے ساتھ طاعت کوئی فائدہ پہونچائے گی اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ وہ گنہگاروں کو امید دلاتے ہیں (کہ جب تک تمھارے گناہ تمھیں صفت ایمان سے محروم نہیں کرتے نا امید ہونے کی کوئی وجہ نہیں) مرجئہ کے نزدیک لوگ دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں ایک فریق جنت میں ہوگا دوسرا فریق جہنم میں اور جہنم میں رہنے والے کافر ہی ہوں گے نہ کہ کوئی اور یا انھیں مرجئہ کہنے کی وجہ یہ ہو کہ وہ مرتکبین کبائر کا فیصلہ قیامت پر اُٹھا رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا میں کسی کے مستحق عذاب ہونے کے فیصلہ کا حق نہیں۔

ڈاکٹر احمد امین اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں لکھتے ہیں:۔

ارجاء ڈھیل دینے اور آئندہ پر اُٹھا رکھنے کے معنوں میں ہے اور مرجئہ ان لوگوں کا خصوصی نام ہوا جو فریقین کے مسئلہ کو جنھوں نے کشت و خون کیا مسلمانوں کے خون بہائے قیامت پر اُٹھا رکھتے ہیں نہ تو اسی فریق کو مجرم قرار دیتے ہیں نہ اسی فریق کو۔ (فجر الاسلام ص۲۹۰ طبع سادس)

اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اموی دور سے پہلے مرجئہ کی لفظ کوئی جانتا بھی نہیں تھا یہ لفظ تو خوارج کے نظریہ کی شہرت کے بعد استعمال میں آنے لگا۔ خوارج کہتے تھے جتنے بھی گنہگار ہیں سب کافر ہیں خواہ وہ حکام و سلاطین ہوں یا رعایا اور انھیں کے مقابل معتزلہ نے یہ مسلک اختیار کیا کہ گنہگار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مرجئہ نے ان خوارج اور معتزلہ کی درمیانی راہ اختیار کی اُنھوں نے مرتکبین کبائر کو نہ تو کافر کہا نہ یہی کہ وہ جہنم میں جائیں گے بلکہ ان کا معاملہ قیامت پر اُٹھا رکھا۔

اشعری کی کتاب مقالات الاسلامیین کے حاشیہ پر درج ہے کہ:۔

فرقہ مرجئہ والے قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ پر کوئی عذاب نہیں ہوگا کیونکہ ایمان کے رہتے ہوئے کوئی گناہ نقصان پہونچانے والا نہیں۔ (مقالات الاسلامیین ص۲۰۳)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مرجئہ کی لفظ ان لوگوں کے لیئے استعمال کی جاتی تھی جو مرتکب کبیرہ کے بارے میں خوارج اور معتزلہ دونوں کے خلاف تھے۔

بہر حال ان فرقۂ مرجیہ والوں کو جو گنہ گاروں کے متعلق معتزلہ کے بھی مخالف تھے اور خوارج کے بھی اموی عباسی دور حکومت میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ انھیں مرجیہ اسی لیئے کہا گیا ہے کہ یہ معتزلہ کے بھی خلاف تھے اور خوارج کے بھی بلکہ اپنے اس دعویٰ کی بنا پر کہ ایمان کے رہتے ہوئے کوئی معصیت نقصان نہ پہونچائے گی اور کفر کے ہوتے کسی طاعت سے فائدہ نہ ہوگا۔ وہ تمام جمہور مسلمین کے بھی مخالف تھے اور باقی سارے مسلمانوں کے مقابل ایک مخصوص فرقہ کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ارجاء کے خواہ کوئی بھی معنی لیئے جائیں اس کا ظہور پہلی صدی ہجری میں ہوا لیکن کب اور کس سن میں اس کا ظہور ہوا اس کے متعلق بامختلف باتیں کہی گئی ہیں بعضوں نے کہا ہے کہ صحابہ کے زمانہ اور حضرت عثمان کے عہد ہی میں اس کا ظہور ہو گیا تھا جبکہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی اسکے ثبوت میں ابو بکرہ کی ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ پیغمبر خدا نے فرمایا:۔

"عنقریب میرے بعد ایک فتنہ کھڑا ہوگا اس میں بیٹھا ہوا شخص چلنے والے سے اور چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہوگا جب فتنہ رونما ہو جائے تو جس کے پاس اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں میں لگ جائے جسکے پاس بھیڑ بکریاں ہوں وہ اُن میں اپنے کو مشغول کرے۔ اور جس کے پاس زمین ہو وہ اپنی زمین پر چلا جائے۔ ایک شخص نے عرض کی حضورؐ اگر کسی کے پاس نہ اونٹ ہو نہ بھیڑ بکری نہ زمین وہ کیا کرے آں حضرتؐ نے فرمایا وہ اپنی تلوار کو پتھر پر مار کر توڑ ڈالے اور اگر بھاگ سکے تو کہیں بھاگ جائے۔"

اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس جھگڑے میں جو عثمان اور اُن کے مخالفین میں برپا ہوا اور اس جھگڑے میں جو علیؑ اور خوارج میں ہوا کنارہ کشی کا رویہ اختیار کیا انھوں نے کسی بھی فریق کو نہ اچھا کہا نہ بُرا۔ صحابہ کا یہی طرز عمل نظریہ ارجاء کی پہلی تخم ریزی تھی۔

(فجر الاسلام ص۲۸۰ مذہب اسلامیہ ص۱۲۰)

اسی طرح جب مرتکب کبیرہ اور اموی حکام کے بارے میں خوارج اور معتزلہ کی نزاع نے طول پکڑا تو ان دونوں کے مقابل ایک تیسری جماعت نمودار ہوئی جس نے کہا کہ یہ سب کے سب مومن ہیں اور ان کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا اللہ چاہے گا تو عذاب کرے گا چاہے گا تو معاف کر دے گا۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ارجاء کا ظہور صحابہؓ کے زمانہ میں قطعی نہیں ہوا درجن لوگوں نے حضرت عثمان اور اُن کے دشمنوں کے جھگڑے میں یا حضرت علیؑ اور خوارج کے جھگڑے میں الگ تھلگ رہنے کی پالیسی اختیار کی اس پالیسی کو کسی حیثیت سے بھی ارجاء کا نام نہیں دیا جا سکتا نہ ڈھیل دینے کے معنی میں نہ امید دلانے کے معنی میں۔

اس لیئے کہ اس وقت تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ حضرت عثمان کا طرز عمل غلط ہے اسلام نے حاکم کے لیئے جو حدود معین کیئے ہیں وہ اُن تمام حدود سے تجاوز ہو گئے کسی نے بھی اُن کی خطا اور جادۂ

صواب سے منحرف ہو جانے میں تامل نہیں کیا اسی لئے ان لوگوں نے حضرت عثمان کے جھگڑے میں کنارہ کشی اختیار کی اور معاملہ بلوائیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔

اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے بصرہ و صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں حضرت علیؑ سے کنارہ کشی کی وہ بھی کسی اشتباہی کیفیت میں مبتلا نہ تھے انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ، برکون ہے اور باطل پر کون؟ اور اشتباہی کیفیت میں ہوتے بھی کب جبکہ علیؑ مسند حکومت پر فائز تھے لیکن اُن کی کنارہ کشی اور علیؑ کا ساتھ نہ دینے کی وجہ محض یہ تھی کہ علیؑ سے اُنھیں دیرینہ کینہ وعناد تھا نیز اس بات کا یقین کہ علی ہم میں اور باقی سارے لوگوں میں مساوات کا برتاؤ رکھیں گے۔ اس کی تائید معاویہ و عثمان کے متعلق خود اُن مخلفین کے اقوال و نظریات سے ہوتی ہے جسے بہت سے مؤرخین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کے متعلق سب ہی جانتے ہیں کہ یہ حضرات حضرت عثمان کے سخت ترین مخالف تھے انھیں تینوں نے سب سے زیادہ لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف بھڑکایا حضرت عائشہ کے متعلق سب ہی تاریخوں میں ملتا ہے کہ وہ کہا کرتیں۔

"لوگو! یہ رسول اللہ کا پیراہن ہے یہ ابھی تک بوسیدہ نہیں ہوا اور عثمان نے آپ کی سنت کو بوسیدہ کر دیا"

جب مروان نے بلوائیوں کے مقابلہ میں حضرت عائشہ سے مدد چاہی تو آپ نے فرمایا۔

"غالباً تمھیں غلط فہمی ہے کہ تمھارے صاحب (عثمان) کے متعلق اشتباہی کیفیت میں مبتلا ہوں۔ خدا کی قسم میرا تو جی چاہتا ہے کہ وہ میرے کسی تھیلے میں ہوتے اور میں اپنے ہاتھ سے لیجا کر انھیں سمندر میں ڈال دیتی۔ (تاریخ اعثم کوفی طبع نجف ص۱۵۲)

وہ برابر صاف لفظوں میں عثمان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتیں اور بتاتیں کہ آخر کن وجہوں سے یہ نوبت پہونچی ہے کہ لوگ اُن کے قتل کے درپے ہو گئے ہیں اسلئے کہ اس وقت سارے ہی مسلمان حضرت عثمان کے مخالف ہو رہے تھے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی اُن کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے جنھوں نے خلیفہ ہونے میں اُن کی مدد کی تھی۔

اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ جن لوگوں نے شام و عائشہ، طلحہ و زبیر کی جنگ میں کنارہ کشی اختیار کی یا علیؑ و معاویہ کی جنگ میں کنارہ کش رہے انھیں یہ واضح طور پر نہ معلوم ہو سکا کہ حق کس طرف ہے یہ بھی فرض کر لیں کہ اسی اشتباہی کیفیت کی وجہ سے ان لوگوں نے جنگ سے کنارہ کشی کی علیؑ سے حسد کی وجہ سے نہیں نہ علیؑ کی دشمنی کی وجہ سے نہ اُن کے عدل و انصاف سے ڈر کر تب بھی ان لوگوں پر ارجاء کی لفظ کسی طرح بھی صادق نہیں آتی خواہ اس کے کوئی بھی معنی لئے جائیں اس لئے کہ یہ متخلفین بقول خود یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ کون حق پر ہے کون باطل پر۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مرجبہ والوں کا ظہور اموی عہد حکومت کے درمیانی دور میں ہوا انہوں نے اسلامی ممالک میں اپنے عقائد کی بڑی سرگرمی سے تبلیغ و اشاعت کی اور اس تبلیغ و اشاعت میں اموی حکام و سلاطین نے پوری پوری مدد کی کیونکہ مرجبہ والوں کا انداز فکر انھیں مومن ٹھہراتا تھا جس کے وہ شدید ضرورت مند تھے خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر کہ خوارج انھیں بہ بانگ دہل کافر کہتے اور انھیں کو نہیں بلکہ تمام صحابہ کو بھی۔

اور معتزلہ کا کہنا تھا کہ اسلام عقیدہ و عمل کا نام ہے جو شخص صرف زبان سے اسلام کا اظہار کرے مگر فرائض و واجبات پر عمل نہ کرے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا چاہے وہ تمام ارکان اسلام کا معتقد ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا بنی امیہ یا تو کافر تھے جیسا کہ خوارج کا دعویٰ تھا یا دائمی جہنم کے مستحق جیسا کہ معتزلہ کہتے تھے لیکن مرجبہ والوں کے نزدیک وہ مومن تھے اور چاہے انھوں نے فسق و فجور کی انتہا کر دی ہو مگر دائرہ ایمان سے خارج نہ تھے بلکہ بعض مرجبۂ کا کہنا تو یہ تھا کہ ایمان صرف خدا و رسول کے اعتقاد کا نام ہے چاہے کوئی زبان سے کفر کا اقرار اور بتوں کی پرستش ہی کیوں نہ کرے اور دار اسلام میں رہتے ہوئے یہودیت یا نصرانیت پر کاربند ہو اور صرف وہ مومن ہی نہیں بلکہ اولیاء خدا سے ہے اور جنت والوں میں سے۔ (فجر الاسلام ص۲۷۱ فصل ابن حزم جلد ۴ ص۲۰۴)

فطری بات تھی کہ حکام و سلاطین اس نظریہ اور انداز فکر کو جی کھول کر سراہتے اور اپنی تمام امکانی صلاحیتوں سے کام لے کر اس کی پشت پناہی کرتے کیونکہ اب تک مسلمانوں کا کوئی فرقہ انھیں ایسا نہیں ملا تھا جو انھیں مومن اور اولیاء خدا بھی قرار دیتا اور ان کے تمام فسق و فجور، کبائر و معاصی اور دین و شریعت کے تمسخر و استہزا کو سند جواز بھی عنایت کر دیتا۔ لطف تو یہ ہو کہ جس زمانہ میں یہ عقائدی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور عاصیوں اور مرتکبین کبائر کے متعلق خوارج اور معتزلہ کے خیالات و افکار کا عام چرچا تھا خود حکام و سلاطین مرجبۂ کے نظریات کے سرگرم مبلغ بنے ہوئے تھے حالانکہ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ یہی کام وہ اس زمانہ کے علماء اور دوسرے لوگوں سے لیتے روپئے پیسے کے ذریعہ ان کو بہت سے حمایتی اور مبلغ مل جاتے جیسا کہ اور بہت مقاصد کے لئے وہ بڑی بڑی شخصیتوں کو زرخرید بنا چکے تھے۔

مرجبۂ کے افکار و خیالات کا ٹھیک ٹھیک کس زمانہ میں ظہور ہوا تاریخوں سے صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا بقول بعض مستشرقین ان کی ابتدا اور ان کے تاریخ کی بحث بڑی پیچیدہ و مبہم ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ بنی عباس ان مرجبۂ والوں کے دشمن ہو گئے اور انھیں ملیامیٹ کر دیا کیونکہ یہ لوگ بنی امیہ کے بڑے سرگرم حمایتی تھے۔ (فجر الاسلام ص۲۸۱)

کتاب التبصیر فی الدین کے حاشیہ پر درج ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے اہل سنت کو مرجبۂ کے نام سے یاد کیا وہ نافع بن ازرق خارجی ہے جو عہد اموی کے خوارج کا ایک مشہور لیڈر تھا۔ جب نافع کو معلوم ہوا کہ اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے ان باتوں کی تصدیق کا جو پیغمبرؐ لے کر آئے تھے اور ایمان میں کمی و زیادتی نہیں ہوتی اور

واجبات و فرائض کی پابندی یعنی عمل بالارکان حقیقت ایمان سے خارج ہے تو اُس نے مرجئہ کہنا شروع کیا
کتاب مقالات الاسلامیین کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ارجاء کے امام ابوحنیفہ بھی قائل تھے یعنی اُن کے نزدیک بھی ایمان ایک امر قلبی ہے اور عمل بالارکان وغیرہ حقیقت ایمان سے خارج۔ اکثر فقہاء و محدثین نے اس مسئلہ میں ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ ایمان تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے دل سے تصدیق زبان سے اقرار اور اعضاء و جوارح کے ذریعہ عمل۔
(حاشیۂ التبصیر فی الدین ۔ حاشیہ مقالات الاسلامیین ص۲۰۲)

تبصیر فی الدین کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے عہد حکومت سے پہلے مرجئہ کا نام کوئی نہیں جانتا تھا سب سے پہلے نافع بن ازرق خارجی نے جو امام ابوحنیفہ کا معاصر تھا جمہور اہل سنت کو اس نام سے یاد کیا۔

یہ ظاہر ہے کہ زیادہ تر خوارج مرتکبین کبائر ہی کو نہیں بلکہ اپنے سارے مخالفین کو کافر قرار دیتے تھے اور جمہور اہلسنت تو خوارج کے ہم زبان تھے نہ معتزلہ کے ہم زبان۔ اُن کا مسلک یہ تھا کہ ایمان نام ہے اُن تمام چیزوں کی تصدیق کرنے کا جو پیغمبر لے کر آئے وہ مرتکب کبیرہ کے متعلق سکوت کرتے اور اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ رکھتے وہ چاہے گا تو عذاب کرے گا چاہے معاف کر دیگا۔ اسی بنا پر یہ ارجاء جس کی نسبت اہلسنت کی طرف دی جاتی ہے یہ معتزلہ اور خوارج کے بیچ کی راہ تھی لیکن اس ارجاء کے بالکل خلاف ایمان کے رہتے کوئی معصیت ضرر نہیں پہونچا سکتی اور کفر کے رہتے کوئی طاعت فائدہ نہیں پہونچائے گی۔ یہ دوسری قسم کا ارجاء خوارج کے بھی خلاف ہے معتزلہ کے بھی اور تمام دوسرے مذاہب کے بھی۔

ابوالحسن اشعری نے مرجئہ کے فرقوں کی تعداد بارہ تک گنائی ہے۔ کل فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ ایمان نام ہے اعتقاد اور یقین کا اور عمل حقیقت ایمان سے خارج ہے۔ صرف ایک فرقہ کرامیہ نے مخالفت کی ہے اس فرقہ نے زبانی اقرار کو ایمان قرار دیا ہے دل کا اعتقاد ضروری نہیں اسی بنیاد پر اُن کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ کے زمانہ کے منافقین جو دل سے ایمان نہیں لائے تھے حقیقۃً وہ مومن تھے اسی طرح کفر بھی زبانی انکار کا نام ہے۔

اسفرائینی نے اپنی تبصیر میں مرجئہ کے پانچ فرقے گنائے ہیں ایک یونسیہ جو یونس بن عون کے پیرو تھے ان کا مسلک یہ تھا کہ ایمان، اعتقاد بالقلب اور اقرار باللسان دونوں کا نام ہے نیز خدا کی معرفت و محبت اور انبیاء و مرسلین اور کتب سماویہ کی تصدیق۔
فرقہ غسانیہ۔ جو غسان کا پیرو تھا ان کا مسلک یہ ہے کہ ایمان اقرار خدا اور محبت خدا کا نام ہے لیکن ایمان میں کمی و زیادتی ہو سکتی ہے۔
فرقہ ثوبانیہ۔ جو ابومعاذ کے پیرو تھے اُن کا مسلک یہ ہے کہ ایمان وہ ہے جو تمہیں کفر سے محفوظ رکھے۔

فرقہ ثوبانیہ جو ابو ثوبان کے پیرو تھے ان لوگوں نے اقرار خدا و رسولؐ کے ساتھ واجبات عقلیہ کے اقرار کو بھی شامل کیا ہے۔

فرقہ مریسیہ :- جو بشر مریسی کے پیرو تھے یہ فرقہ مذکورۂ بالا تمام باتوں کے ساتھ قرآن کے مخلوق ہونیکا بھی قائل تھا۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرجیہ کے تمام فرقے اس بات پر متفق تھے کہ عمل ایمان کا جز نہیں۔ یہ لوگ خوارج کے بھی حریف تھے جنکا نظریہ تمام مسلمانوں سے جداگانہ نظریہ تھا اور وہ اپنے مخالفین کو کافر قرار دیتے تھے اور معتزلہ کے بھی حریف تھے جو عمل کو ایمان کا جز قرار دیتے اور کہتے تھے کہ گنہگار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

جب یہ مرجیہ والے خوارج و معتزلہ کے مقابلہ میں ایک تیسرے فرق بن کر ابھرے تو جوں جوں دن گذرتے گئے اور بحث و مناظرہ کا دامن وسیع ہوتا گیا ان کے پیرو بڑھتے گئے چونکہ اُنکے عقائد و افکار حکام کے عین مطابق مطلب تھے اسلئے انھوں نے بھی اس فرقہ کو پھیلانے میں پوری پوری مدد دی اور یہ وجہ تھی کہ فرقہ مرجیہ کے کچھ لوگ اسکے قائل ہو گئے کہ انسان چاہے جتنا بھی فسق و فجور کرے ہولناک سے ہولناک گناہ کرے مگر وہ جہنم میں نہ ڈالا جائیگا جب تک اور وہ خدا و رسولؐ کا قلب و زبان سے معتقد ہو بعض لوگوں نے مزید ترقی کر کے یہ کہا کہ خدا اور رسولؐ کا صرف زبانی اقرار کافی ہے دل سے اعتقاد ضروری نہیں۔ زبانی اقرار کرنے والا بھی چاہے جتنے بھی گناہ کرے جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا۔

احمد امین فجر الاسلام میں لکھتے ہیں :-

بنی امیہ کے درباری شعراء میں جن شعرا نے عقیدۂ ارجاء کے حامل ہونے میں شہرت پائی ان میں ایک ثابت بن قطنہ بھی ہے جو یزید بن مہلب کے اصحاب و انصار میں سے تھا اُس کا ایک قصیدہ ہے جس سے اُسکے عقیدۂ ارجاء کی پوری وضاحت ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان کو کافر کہنے کے حق میں نہیں تھا چاہے وہ کتنا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔ نیز یہ کہ جب مسلمانوں میں اختلاف واقع ہو ایک جماعت دوسری جماعت کو کافر کہے تو ہم دونوں جماعتوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں اللہ ہی قیامت کے دن اُن کے متعلق فیصلہ کرے گا کہ وہ کس چیز کے مستحق ہیں۔

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے اشعار میں کہتا ہے :-

ولا اری ان ذنبا بالغ احد　　م الناس شرکا اذا ما وحدو الصمدا

یجزی علیا و عثمان بسعیهما　　ولست ادری بحق ایة وردا

الله یعلم ماذا یحضران بہ　　وکل عبد سیلقی الله منفردا

جب تک کوئی خدائے بے نیاز کی توحید کا قائل ہو چاہے وہ فسق و فجور میں کتنی بھی زیادتی کر رہا ہو اسے مشرک نہیں کہہ سکتا۔

خداوند عالم علی و عثمان دونوں کو اُن کی کوششوں کے مطابق جزا دے گا۔ مجھے بے شک یہ نہیں معلوم کہ اُن کا انجام کیا ہوگا؟
اللہ ہی بہتر جانتا ہے (بروز قیامت) کیسے اعمال لے کر آئیں گے۔ ہر بندہ تن تنہا اللہ سے ملاقات کرے گا۔"

یہ ارجاء جس کا ثابت بن قطنہ قائل تھا، وہی ارجاء ہے جس کے جمہور فقہاء اہل سنت قائل ہیں۔
خلاصہ کلام یہ کہ وہ ارجاء جسے اموی و عباسی عہد میں فروغ حاصل ہوا اور اپنے متعلق [illegible] دیگر مذاہب کے مقابل فرقہ امامیہ اس ارجاء کا قائل نہیں اس لئے کہ مرجیہ والے اہل عیوں [illegible] متعلق کوئی فیصلہ کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ بعض تو اس بات کے قائل ہیں کہ زانی و گنہگار جنت کی نعمتوں سے نہال ہوگا۔ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ زانی و گنہگار فاسق ہیں اور اپنے گناہوں کی پاداش میں عذاب جھیلیں گے۔
امام علی رضا کا ارشاد ہے کہ:۔
پیغمبر خدا نے فرمایا میری اُمت کے دو قسم کے لوگ آخرت میں کوئی حصہ نہیں پائیں گے ایک مرجیہ دوسرے قدریہ۔ (کنز الفوائد کراجکی ص۱۵۸)
حضرت زید بن علیؑ فرماتے ہیں:۔
خداوند عالم مرجیہ پر لعنت کرے انھوں نے فاسقوں کو بھی عفو و درگذر الٰہی کے لالچ میں مبتلا کر دیا۔

معتزلہ

معتزلہ اور محدثین کے درمیان جنگ و جدال کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہوا اور یہ جنگ اُس وقت اپنے شباب پر پہونچی جب معتزلہ کو پرجوش حمایتی اور مددگار مل گئے اور بنی عباس کے حکام نے بھی انھیں کے عقائد و افکار اپنا لئے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ معتزلہ کی بحثوں پر عقلی رجحانات کا غلبہ تھا یہاں تک کہ وہ دینی معاملات میں بھی عقل ہی کے رجحانات سے کام لیتے جبکہ ارباب حدیث نصوص کے ظاہری لفظوں پر سختی سے جمے ہوئے تھے خواہ قرآنی نصوص ہوں یا نبوی نصوص۔ دونوں اپنے اپنے رجحانات کی پاسداری میں حد سے گذر گئے تھے اور اس پاسداری کی وجہ سے توحید و صفات خداوندی اور جبر و اختیار وغیرہ کے متعلق اُن کے خیالات و افکار میں بے شمار غلطیاں ہوئیں۔ دونوں ہی اپنے معتقدات اور اصول اسلامیہ کے متعلق بے شمار کتابیں چھوڑ گئے ہیں اور دوسرے فرقوں کے قلم کار و کتابیں لکھنے والوں نے بھی اُن کے متعلق بیسیوں کتابیں تالیف کیں۔
معتزلہ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں انکے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تین باتوں میں سے کسی ایک بات کی وجہ سے معتزلہ کو معتزلہ کہا گیا۔

پہلی بات تو یہ کہ واصل بن عطا اور اعتزال جو فرقۂ معتزلہ کا باوا آدم ہے انسانی افعال کے متعلق معبد جہنی اور غیلان دمشقی کا ہمخیال تھا۔ معبد اور غیلان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان جو کچھ کرتا ہے خود کرتا ہے اس کے افعال میں اللہ کو کوئی دخل نہیں، یہی دونوں یعنی معبد جہنی اور غیلان دمشقی قدر یعنی اختیار کے قائل ہوئے فرقہ جبریہ کے نظریہ کے برعکس جو قدر یعنی جبر کے قائل تھے۔

واصل اپنے اس عقیدہ کو اوپر ظاہر نہیں کرتا تھا حتیٰ کہ اس نے اپنے استاد حسن بصری سے بھی مخفی رکھا اس زمانہ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت اس بات کی قائل تھی کہ انسان کے سارے افعال کا خالق اللہ ہی ہے۔

لہٰذا واصل کو اعتزال سے اس لئے نسبت دی گئی کہ اس نے مسلمانوں کی غالب اکثریت سے کنارہ کشی کرکے معبد جہنی اور غیلان دمشقی کی رائے کو اپنایا۔

دوسری وجہ معتزلہ کو معتزلہ کہنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے مرتکبین کبائر کے متعلق خوارج، مرجیہ اور فقہا اور مسلمین سے الگ ہٹ کر ایک نیا قول اختیار کیا۔ خوارج مرتکب کبائر کو کافر کہتے مرجیہ مومن اور مستحق نعمات اخروی بتاتے تھے۔ فقہا منافق کہتے اور جب حسن بصری سے پوچھا گیا کہ اصحاب کبائر کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں تو یہ واصل بن عطا ان کا شاگرد اٹھ کھڑا ہوا اور کہا مرتکبین کبائر ایمان و کفر کے بین بین ہیں وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ حسن بصری نے واصل کو اپنی بزم سے نکال دیا واصل ہٹ کر مسجد کے دوسرے گوشہ میں جا بیٹھا کچھ دوسرے لوگ بھی اس کے پاس سمٹ آئے جن میں واصل کا داماد عمرو بن عبید بھی تھا۔ (تبصیر فی الدین ص۶۴ و فجر الاسلام ص۲۹۸)

تیسری وجہ معتزلہ کو معتزلہ کہنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے مرتکب کبیرہ کو مومنین اور کافرین دونوں سے الگ رکھا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ اعتزال کی صفت واصل بن عطا کے لقب سے پہلے سے موجود تھی چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو جو صلح امام حسنؑ اور معاویہ کے وقت اپنے گھر میں بیٹھ رہی تھی اور حسنؑ و معاویہ دونوں سے کنارہ کش رہے معتزلہ کے لفظ سے ذکر کیا ہے۔

مستشرقین کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار تھی اور جنھوں نے دنیا سے کنارہ کشی اور دنیا سے بے نیازی اختیار کر لی تھی اسی اعتبار سے لوگوں نے ان کا نام معتزلہ رکھ دیا۔

بہرحال جب سے فرقہ معتزلہ کا نام واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے بعد بلند ہوا بلکہ تمام نظریات و افکار علماء و محدثین کے نظریات و افکار کے مقابلہ میں منظر عام پر آ گئے علماء و محدثین نصوص کے ظاہری الفاظ کے پابند تھے وہ کبھی بھی دینی معاملہ میں عقل پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ان کے برعکس یہ معتزلہ صرف عقل پر بھروسہ

کرتے اور جو حدیثیں اُن کے مخالف پڑتیں اُس کی تاویل کرتے تو چونکہ ان لوگوں نے علماء و محدثین کے طریقہ سے کنارہ کشی اختیار کی اور اپنی بحثوں اور مناظروں میں تنہا عقل پر بھروسہ کیا اس لیئے اُن کا نام معتزلہ پڑگیا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ لفظ ان لوگوں کے لیئے بھی بولا جاچکا تھا جو علیؑ و معاویہ دونوں سے الگ تھلگ رہے تھے۔ چنانچہ قیس بن سعد بن عبادہ نے جو مصر پر حضرت علیؑ کی طرف سے گورنر تھے ایک خط میں حضرت علیؑ کو لکھا تھا۔

"میرے سامنے ایک کنارہ کشوں کی جماعت ہے اُنھوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اُن کو اُن کے حال پر چھوڑے رکھوں۔"

اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی مختلف مواقع و محل پر علی و معاویہ دونوں سے کنارہ کش رہنے والوں کو معتزلہ کی لفظ سے ذکر کیا ہے مگر اس سے یہ ہرگز نہیں ثابت ہوتا کہ ان لوگوں کا نام معتزلہ بھی پڑگیا تھا۔ ان کو "کنارہ کش" کہنے سے زیادہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ کی لڑائیوں میں فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ واصل بن عطا اور عمرو بن عبید وغیرہ نے جب فرقہ معتزلہ کی بنیاد رکھی تھی اس فرقہ کا وجود واصل بن عطا وغیرہ کے پہلے ہی سے تھا۔

مورخین اور اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں نے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ واصل بن عطاء نے اپنے استاذ حسن بصری کی بزم سے کنارہ کشی اختیار کی جبکہ یہ اُن کے مخصوص شاگردوں میں رہ چکا تھا اُس نے بحث و مناظرہ کا اپنا الگ مرکز بنایا اور اپنے مبلغین و انصار دوسرے شہروں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیئے روانہ کیئے۔ عبداللہ بن حارث کو مغرب یعنی مراکش کیطرف بھیجا۔ حفص بن سالم کو خراسان بھیجا کہ جاکر جہم بن صفوان سے مناظرہ کرے ایک کتاب لکھی جس میں ہزار مسئلے فرقۂ ثانویہ کی رد میں جمع کیئے اس کے خاص معتقدین جیسے عمرو بن عبید وغیرہ نے واصل اور اُسکے فرقے کے نظریات کی بڑی سرگرمی سے تبلیغ کی۔ (فجر الاسلام احمد امین ص ۳۰)

اکثر تاریخی مصادر اسی کے مؤید ہیں۔ شیخ مفیدؒ کی اوائل مقالات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

جب واصل بن عطا نے منزلت بین المنزلتین کا قول اختیار کیا (یعنی یہ کہا کہ مرتکب کبیرہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے بین بین ہے) تو یہ مذہب عالم وجود میں آیا۔ واصل کے رفقا عمرو بن عبید وغیرہ نے اس بات پر واصل کی تائید کی اور اس رائے پر مصر ہونے کے نتیجہ میں حسن بصری سے کنارہ کشی اور اپنی الگ بزم قائم کرنے کی نوبت آئی اسی بنیاد پر لوگوں نے انھیں معتزلہ کے نام سے موسوم کیا کیونکہ ان لوگوں نے اپنے استاذ حسن بصری

کی بزم سے علیحدگی اختیار کرلی تھی جبکہ اسکے خصوصی شاگرد رہ چکے تھے۔ اس سے پہلے اعتزال کا وجود نہ تھا نہ لوگوں کی کسی جماعت کا یہ نام تھا۔ (دیکھئے اوائل المقالات شیخ مفید رح ص ۶۹۵)

جناب شیخ مفید رح فرقہ معتزلہ کے بہت سے اکابر کے ہم عصر تھے جیسے ابوالقاسم بلخی، قاضی عبدالجبار رازی ابو سعید اصطخری اور ابوالحسین نصری وغیرہم۔

ابن خلکان نے بھی اپنی کتاب وفیات الاعیان میں نیز نشوان بن سعید نے اپنے رسالہ الحور العین میں اسی پر زور دیا ہے۔ ان دونوں کا کہنا ہے کہ معتزلہ کا نام معتزلہ اس وجہ سے پڑا کہ انھوں نے مرتکبین کبیرہ کے متعلق منزلت بین المنزلتین کا قول اختیار کیا ہے خوارج کے بھی خلاف جو مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں مرجیہ کے بھی خلاف جو اسے خدا اور رسول کے اقرار کی وجہ سے مومن قرار دیتے ہیں۔

علامہ محمد ابوزہرہ نے اپنی کتاب ابوحنیفہ میں اور شہرستانی نے ملل ونحل میں معتزلہ کے بارہ فرقوں کے نام ذکر کئے ہیں۔ یہ سارے فرقے پانچ باتوں پر متفق تھے ان پانچ باتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

توحید۔ عدل۔ وعدہ وعید۔ منزلت بین المنزلتین۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

جب تک کوئی شخص ان پانچ باتوں کا قائل نہ ہو اُسے معتزلہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان پانچ باتوں کے علاوہ اور بھی کئی ایک باتوں پر یہ فرقے متفق ہیں مگر دوسری باتوں کو بنیادی حیثیت نہیں حاصل ہے اسی طرح کئی ایک باتوں میں ان میں باہمی اختلاف بھی رہا مگر اس اختلاف کی وجہ سے معتزلہ کے نام سے محروم نہ ہوئے۔

دوسری صدی ہجری کے شروع میں اس فرقہ کی سرگرمیاں کا آغاز ہوا جبکہ واصل بن عطا نے اپنے اساتذہ کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کئے اور مدرسۂ اعتزال کی بنیاد رکھی جس میں عمرو بن عبید کے علاوہ اور بھی بہت سے مفکرین سمٹ آئے تھے پھر عباسی حکام کی پشت پناہی سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک اس کی سرگرمیوں کا شباب رہا ۳۰۳ھ ہجری میں معتزلہ کے آخری رہنما علی الجبائی نے انتقال کیا اور اسی کے بعد اس مذہب کا زوال شروع ہوگیا۔ تقریباً دوسو برس کے عرصہ میں معتزلہ کے ۲۰ بڑے بڑے رہنما منظر عام پر آئے۔ ہر رہنما کے کچھ خصوصی افکار و نظریات رہے اور خصوصی مقلدین بھی۔ جبائی کے مرنے اور اشعری کے منظر عام پر آنے کے بعد اس فرقہ کو گھن لگ گیا اب عباسی حکام اشعری کی پشت پناہی کر رہے تھے اور اُس نے حکومت کی شہ پاکر اپنے مسلک کی بڑے زور و شور سے تبلیغ شروع کر دی تھی جبکہ یہ اشعری ایک طویل عرصہ تک معتزلہ کے ساتھ رہ چکا تھا اور برسوں اُن سے استفادہ کرچکے تھے

معتزلہ اور محدثین میں جو سخت و شدید معرکے ہوئے اُن میں معتزلہ کا بہت نمایاں حصہ رہا نوبت یہاں تک پہونچی کہ اُن کی کتابیں جلائی گئیں ہر جگہ اُن کا پیچھا کیا گیا وہ گھر سے بے گھر ہوئے اور تمام مسلمان معتزلہ کے مذہب کو شک و شبہ اور احتیاط کی نظر سے دیکھنے لگے۔

بہرحال مورخین نے معتزلہ کے جتنے بھی فرقے گنائے ہیں وہ سب ہی اعتزال کی ان پانچ بنیادی باتوں

میں متفق ہیں جن کو تسلیم کرنے کے بعد ہی کوئی صفت اعتزال سے متصف ہو سکتا ہے ویسے دوسرے بہت سے مسائل و نظریات میں اُن میں باہمی اختلاف رہا مگر ان مسائل میں اختلاف کی وجہ سے چونکہ پانچوں بنیادی باتوں پر آنچ نہیں آتی تھی اس لیئے وہ مذہب اعتزال سے خارج نہیں ہوئے اسی طرح ان پانچ بنیادی باتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں میں وہ متفق رہے مگر ان مسائل میں متفق ہونے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

اسلامی فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والوں نے بارہ سے لے کر ۲۰ فرقے معتزلہ کے گنائے ہیں سب سے پہلا فرقہ واصلیہ تھا یہ لوگ واصل بن عطا کے پیرو تھے واصل حسن بصری کا شاگرد تھا اور سب سے پہلے یہی اس لقب سے ملقب ہوا۔ سلہ

مورخین کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بڑا عالم و فاضل بڑے مضبوط دلائل و براھین کا مالک تھا اپنے زمانہ کے تمام مذاہب کی اسے کما حقہٗ واقفیت حاصل تھی ان سب کے باوجود بس بقدر ضرورت ہی کلام کرتا یہاں تک کہ لوگ اسے گونگا کہنے لگے اس کے دشمنوں نے اُسے کافر زندیق کا خطاب بھی دیا ہے۔

اپنے استاذ حسن بصری سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے یہاں تک کہ مرتکب کبیرہ کے معاملہ اس نے حسن بصری کی مخالفت کی اور رشتۂ محبت ٹوٹ گیا اس میں اور اس کے رفیق عمرو بن عبید میں طویل گفتگو ہوئی اور عمرو بن عبید نے بھی اس کا مذہب اختیار کر لیا۔ واصل کے زمانہ میں جبر و اختیار کا مسئلہ نزاعی مسئلہ بنا ہوا تھا واصل نے یہ مسلک اختیار کیا کہ انسان فاعل مختار ہے اس کے افعال میں اللہ کو کوئی دخل نہیں اس پر لوگوں نے کہا کہ "یہ کافر بھی ہے اور قدری بھی"

اس کے زمانہ میں یہ فقرہ زبان زد عوام تھا کہ "ہر کافر قدری ہے"

اس واصل نے انسان کے فاعل مختار ہونے کا قول معبد جہنی اور غیلان دمشقی سے لیا تھا۔

(تاریخ الفرق الاسلامیہ علی الغرابی ص۵۵ الفرق بین الفرق عبد القاہر بغدادی ص۹۵)

واصل کے چند خصوصی اقوال ہیں جن میں متفرد اور باقی شیوخ معتزلہ کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ شروع زمانۂ اسلام کے برسرپیکار فریقین (علیؑ و معاویہ) کے متعلق ایک تیسرا قول اختیار کیا کہ دونوں میں کوئی ایک

سلہ یہ واصل ۸۰ھ ہجری میں پیدا ہوا بنی ہاشم کے زیر سایہ پرورش پائی جو اسکے آقایان نعمت تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بنی ضبہ کا آزاد کردہ غلام تھا بعض مورخین نے بنی مخزوم کا آزاد کردہ غلام بتایا ہے اس کی کنیت ابو حذیفہ تھی اسحاق بن سوید نے اسے خوارج کی طرف نسبت دی ہے اور اسی کے متعلق یہ شعر کہا ہے۔

برئت من الخوارج لست منھم ۔۔۔ من الغزال منھم و ابن باب

میں خوارج سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا مجھے واصل بن عطاء الغزال سے کوئی تعلق نہیں نہ ابن باب سے کوئی تعلق ہو ۱۲

ضرور فاسق ہے، بغیر تعیین کے اور کسی کی شہادت قابل قبول نہیں حتیٰ کہ علیؓ اور ان کے فرزندوں کی گواہی بھی ناقابل قبول ہے۔

واصل کے اس قول سے کچھ لوگوں کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ واصل حقیقۃً خارجی تھا اگرچہ وہ انکی تمام باتوں سے متفق نہیں تھا لیکن بہ نسبت دیگر اسلامی فرقوں کے ان سے قریب تر ضرور تھا۔

معتزلہ کا دوسرا فرقہ عمریہ تھا جو عمرو بن عبید[1] کے پیرو تھے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ عمرو بن عبید اور واصل دونوں حسن بصری کے شاگرد تھے اور عرصہ تک اُس کی خدمت میں رہے جب واصل حسن بصری سے الگ ہوگیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر مسجد کے کسی گوشہ میں علیحدہ نشست جمائی تو عمرو بن عبید بھی اس حلقہ میں شامل ہوگیا۔

یہ اور واصل معتزلہ کی پانچوں بنیادی باتوں پر متفق تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عمرو مذہب قدریہ کی پابندی میں بڑا سخت تھا اس نے دعویٰ کیا کہ انسان فاعل مختار ہے اور اُسکے افعال پر کسی دوسرے کا بس نہیں انسان جو چاہتا ہے کرتا ہے علیؑ وطلحہ وزبیر اور علیؑ ومعاویہ کے متعلق اُس نے واصل کی مخالفت کی۔ واصل کہتا تھا کہ فریقین میں سے ایک فریق حق پر دوسرا باطل پر تھا مگر کون حق پر تھا کون باطل پر اس کی تعیین نہیں کی جاسکتی۔

عمرو بن عبید نے کہا دونوں ہی باطل پر اور ایک دوسرے پر ظلم کرنے والے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ واصل وعمرو دونوں ہی متفقہ طور پر معاویہ اور اُن کے ساتھیوں کو فاسق قرار دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ جنگ جمل میں علیؑ وطلحہ وزبیر کے متعلق واصل کا نظریہ یہ تھا کہ دونوں میں سے ایک حق پر اور دوسرا باطل پر تھا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ عمرو بن عبید کا کہنا تھا کہ دونوں ہی باطل پر تھے۔

جنگ صفین کے بارے میں واصل اور عمرو بن عبید دونوں ہی معاویہ اور اُن کے ساتھیوں کو فاسق قرار دیتے تھے۔ (مواقف جلد ۴ ص ۳۷۹ التبصیر فی الدین وغیرہ)

عمرو بن عبید اس کا بھی قائل تھا کہ کلام مجید آیت تبت یدا ابی لھب لوح محفوظ میں اس طرح نہیں تھی انھیں سب باتوں کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ وہ معبد جہنی اور غیلان دمشقی کی پیروی میں پکا قدری تھا۔ علمائے حدیث کے نزدیک ناقابل اعتبار اور حدیثیں گڑھنے میں متہم ہے۔ تاریخی کتابیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس نے

---

[1] یہ اور واصل ایک ہی سن میں پیدا ہوئے۔ عمرو کا باپ عبید پہلے کپڑے بنا کرتا تھا پھر حجاج بن یوسف ثقفی کا افسر پولیس اور مخصوص رفقاء میں شامل ہوگیا چونکہ عمرو کا باپ عبید بصرہ میں بہت بدنام تھا اسی لیے عمرو کے فروغ کے بعد لوگ کہا کرتے "بہترین مردم بدترین مردم کا فرزند"۔

منصور عباسی کا انعام و اکرام قبول نہیں کیا نہ اس کی نوکری کبھی کی حالانکہ منصور نے بہت زیادہ اصرار کیا اور بہت کچھ روپے پیسے تحفے تحائف بھیجے منصور کے ساتھ اُس نشستیں ہوا کرتیں جن میں یہ منصور کو وعظ و نصیحت اور اُس کی قابل اعتراض حرکتوں پر تنقید کیا کرتا اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک چور کی طرف سے اس کا گذر ہوا جس کا ہاتھ کاٹا جا رہا تھا عمرو نے کہا لا الٰہ الّا اللہ جس نے چھپ کر چوری کی اس کے ہاتھ وہ کاٹ رہا ہے جو دن دہاڑے چوری کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ واصل بن عطا اور عمرو بن عبید اکثر باتوں میں متفق تھے بس صرف دو باتوں میں عمرو نے واصل کی مخالفت کی۔ علیؑ و طلحہ و زبیر کے متعلق واصل کا نظریہ یہ تھا کہ دونوں میں سے ایک باطل پر تھا مگر اس نے تعیین نہیں کی اور عمرو بن عبید دونوں ہی کو فاسق قرار دیتا تھا دوسرے یہ کہ یہ بہت سخت قدری تھا اس کے مقالات سے پتہ چلتا ہے کہ تفویض مطلق کا نظریہ رکھتا تھا یعنی اللہ نے انسان کو پیدا کر کے سارے اختیارات اُس کے سپرد کر دیئے انسان جو کچھ کرتا ہے اُس میں اللہ کا کوئی دخل نہیں۔

تیسرا فرقہ ھذیلیہ ۔ تھا جو محمد بن ہذیل معروف بہ علاف کے پیرو تھے۔ یہ ۱۳۵ھ ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوا اور ۲۳۵ھ میں انتقال کیا۔ (مروج الذہب مسعودی) ۲۰۳ھ میں مامون کے بلانے پر بغداد گیا۔ علاف اس لیے کہتے ہیں کہ علافین کے محلہ میں رہتا تھا بحث و مباحثہ میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا کیونکہ اُس کے زمانہ میں بحث و تکرار اور مناظرہ کی گرم بازاری تھی ہر شخص اپنے عقیدہ کو صحیح اور دوسرے کے عقیدہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے دلائل کا انبار رکھتا تھا۔ اسی فکری ہنگاموں کے زمانہ میں ابو ہذیل کی نشو و نما ہوئی اور وہ معتزلہ کے دوسرے طبقہ کا بہت بڑا رہنما بن کر اُبھرا اُس نے اپنے زمانہ کے تمام علماء سے استفادے کیئے اُن میں جو اختلافات تھے مختلف مسائل میں اُن کی جو رائیں تھیں اُن پر عبور حاصل کیا یہاں تک کہ مختلف علوم میں ایک ماہر استاد اور باکمال عالم کی حیثیت اُسے حاصل ہوئی۔ مامون اپنے یہاں مناظرے کی جو محفلیں منعقد کیا کرتا اس کی نگرانی اور صدارت کے لیے اُس کی نگاہ انتخاب اسی ابو الہذیل پر پڑی۔ ابن خلکان نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ صالح بن عبد القدوس[۱] کا ایک فرزند مر گیا جس پر وہ بحید محزون و دل گرفتہ ہوا۔ ابو الہذیل[۲] نے اُس سے کہا تمہارے حزن و اندوہ کی کوئی معقول وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی جبکہ انسان کی حیثیت تمہارے نزدیک کھیتی جیسی ہے۔ صالح نے کہا مجھے رنج اس بات کا ہے کہ میں نے ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام کتاب الشکوک ہے

---

[۱] صالح بن عبد القدوس ثنویہ مذہب رکھتا اور تعدد الٰہ کا قائل تھا ایک دن اُس نے مسلمانوں کی طرح نماز پڑھی لوگوں نے پوچھا یہ نماز تم نے کیسی پڑھی حالانکہ جو تمہارا مذہب ہے وہ سب کو معلوم ہے اُس نے کہا میں یہ نماز اس لیئے پڑھتا ہوں کہ یہ میرے شہر والوں کا طریقہ ہے امالی سید مرتضیٰ جلد ۱ صفحہ ۱۰۰ [۲] بظاہر واصل ابو الہذیل کے اساتذہ میں داخل نہیں اسلئے کہ ابو الہذیل ۱۳۵ھ ہجری میں پیدا ہوا جبکہ واصل ۱۳۱ھ میں مر چکا تھا۔

میرا فرزند اس کو پڑھنے نہیں پایا۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اگر کوئی اُسے پڑھ لے تو موجودہ چیزوں کے متعلق اُسے وہم ہو جائے کہ یہ کبھی موجود ہی نہیں رہیں اور جس کا کبھی وجود نہیں رہا۔ اس کے متعلق وہم ہو جائے کہ یہ پہلے سے موجود ہے۔ ابوالہذیل نے کہا تو تم بھی یہ شک کیوں نہیں کرتے کہ تمھارا لڑکا مرا ہی نہیں اگرچہ مر چکا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمھاری اس کتاب الشکوک کو پڑھ چکا ہو اگرچہ اُس نے نہیں پڑھا۔

اس ابوالہذیل کا نظریہ تھا کہ خداوند عالم کے مقدورات ایک وقت میں ختم ہو جائیں گے یعنی ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ اب اُس کے کرنے کو کچھ باقی نہ رہے اس وقت نہ تو وہ جنت والوں کی نعمتوں میں مزید اضافہ کر سکے گا نہ جہنم والوں پر مزید عذاب۔ جہنم والوں کا عذاب ختم ہو جائے گا اور جنت والوں کو انکی قدرت باقی نہ رہے گی کہ وہ نعمات جنت سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

یہ بھی اس کا نظریہ تھا کہ آخرت والوں کی ساری حرکتیں اضطراری ہوں گی۔ جہنم والے بغیر ارادہ و اختیار کے کلام کریں گے آخرت میں کسی شخص کو کچھ کہنے یا کرنے کی قدرت نہ ہوگی۔ زمین پر جتنے بھی دہریے زندیق ہیں وہ سب بہت سی باتوں میں اللہ کے مطیع ہیں چاہے کافر ہونے کی جہت سے وہ اُس کے نافرمان ہی کیوں نہ ہوں

یہ بھی اس کا نظریہ تھا کہ خداوند عالم اس پر قادر نہیں کہ اپنے بندوں کو زندہ کرنے یا مارنے کی قدرت بخشے اس لیے کہ اگر انسان بھی زندہ اور مردہ کرنے لگے تو وہ خدا ہو گا اور خدا کا شریک محال ہے۔ اور جس طرح خدا کی قدرت امر محال سے متعلق نہیں ہو سکتی اسی طرح اُن باتوں سے بھی متعلق ہونا ناممکن ہے جو مؤدی الی المحال ہوں

یہ بھی اس کا نظریہ تھا کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کو جن کاموں کی قدرت بخشی ہے خود اُن کاموں پر قدرت نہیں رکھتا چنانچہ اس کے متعلق یہ کہنا ناممکن ہے کہ وہ روزہ رکھ سکتا ہے نماز پڑھ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ سب جسمانی کام ہیں اور اللہ جسم و جسمانیات سے پاک و صاف ہے۔

(فرق الاسلامیہ علی الغرابی ص ۱۶۴ تا ۱۷۴، ملل ونحل شہرستانی جلد ا ص ۲۹، التبصیر فی الدین ص ۴۶)

راوندی نے اپنی کتاب فضائح المعتزلہ (معتزلہ کی شرمناک باتیں) میں اور بھی بہت سے خصوصی نظریات اُس کی طرف منسوب کیئے ہیں نیز دیگر مؤرخین نے بھی۔ شہرستانی نے دعوی کیا ہے کہ اس ابوالہذیل نے دس باتیں اپنے استاذ واصل بن عطا سے الگ ہٹ کر کہیں۔ خیاط معتزلی نے اپنی کتاب الانتصار میں ابوالہذیل کو ان تمام اقوال سے بے تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کی طرف منسوب کیئے جاتے ہیں۔

چوتھا فرقہ نظامیہ ہے جو ابراہیم بن سیار نظام کے پیرو تھے اس کا انتقال صرف ۳۶ برس کی عمر میں ۲۲۱ھ ہجری میں ہوا یہ علم کلام و فلسفہ کے مشاہیر علماء اور باکمال اساتذہ میں سے تھا۔ قرآن و انجیل و توریت سب ہی کا حافظ تھا ان کے علاوہ اشعار عرب تاریخ امم عالم فقہائے متقدمین و معاصرین کے

سب ہی فنا دے اس کو از بر تھے۔
مؤرخین نے اس کے متعلق متضاد باتیں لکھی ہیں کسی نے تو اُسے کافر و ملحد بتایا ہے اور کہا ہے کہ کو شراب کے نشہ میں اُس کی موت ہوئی۔ اور کسی نے اُس کے ایمان واستقامت دینی حمایت دین و مذہب اور ملحدین کو منھ توڑ جوابات دینے کی حد سے زیادہ مدح وستائش کی ہے۔
یہ نظام اس کا بھی قائل تھا کہ قرآن کے نظم و ترتیب میں کوئی اعجاز نہیں وہ ان تمام معجزات کا بھی منکر تھا جو علمائے حدیث نے پیغمبرؐ کی طرف منسوب کیئے ہیں۔ ان کے علاوہ گذشتہ اکابر معتزلہ کے خلاف اور بھی بہت سے نرالے نظریات اُس کے تھے جن کی وجہ سے بعد کے معتزلیوں نے اس پر بہت لے دے کی ہے بعض نے اس کی تکفیر کے متعلق کتابیں بھی لکھی ہیں۔ (ملل ونحل شہرستانی، تبصیر فی الدین، مقالات الاسلامیین وغیرہ)
صاحب تبصیر لکھتے ہیں کہ:۔ یہ بہت زیادہ ملحد تھا فلاسفہ کی صحبت میں رہا کرتا انھیں سے اس نے یہ اقوال لیئے کہ جزء کی تقسیم لامتناہی ہے۔ نیز یہ کہ خداوند عالم نے انسان وحیوان اور جملہ کائنات کو ایک ہی وقت میں خلق کیا آدمؑ کی خلقت اولاد آدمؑ پر مقدم نہیں، نہ ماؤں کی خلقت اولاد پر مقدم ہے۔ تقدم وتاخر اس اعتبار سے ہے کہ کون چیز اپنی جگہ سے کب ظاہر ہوتی ہے۔
اس نظام کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اصل قرآن اس قرآن کے جو عام طور پڑھا جاتا ہو علاوہ ہے اور وہ دوسری جگہ نہیں ہوسکتا وہ اب تک وہیں ہے جہاں خلق ہوا تھا۔ (انتصار ابو الحسین الخیاط معتزلی ص۱۴۱)
فرقۂ اسواریہ۔ یعنی وہ لوگ جو علی الاسواری کے پیرو ہیں یہ ابو الہذیل اور نظام کے شاگردوں میں سے تھا اور اسی شاگردی کی وجہ سے اس نے اُن کے نظریات اپنائے اور کچھ نئی باتوں کا بھی اضافہ کیا۔ تبصیر ص۴۷، مواقف ط۳۸۵)
فرقۂ معمریہ۔ یعنی معمر بن عبادہ کے پیرو۔ اس معمّر نے بھی اپنے بزرگان معتزلہ سے ہٹ کر کچھ نئے اقوال پیش کیئے منجملہ اُن کے یہ ہے کہ انسان اس صورت کا نام نہیں جو ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ تو ایک چیز ہے اس صورت میں۔ یہی چیز عالم بھی ہے قادر بھی مختار بھی وہ بغیر حرکت وسکون کے مدبّر ہے حواس اسکا ادراک نہیں کرسکتے۔ خداوند عالم کو قدم سے موصوف نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قدم سے موصوف کرنیکا مطلب ہوگا تقدم زمانی اور اللہ جسطرح مکان سے بے نیاز ہے اُسی طرح زمان سے بھی۔
اسی طرح اللہ خود اپنے کو نہیں جانتا ورنہ لازم آئے گا کہ ایک ہی چیز عالم بھی ہو اور معلوم بھی۔
(مواقف ص۳۸۳ تبصیر ص۴۷ الفرق بین الفرق شہرستانی ف۹)
جعفریہ۔ اس نام سے معتزلہ کے دو گروہ منسوب ہوئے ایک گروہ جعفر بن بشیر المتوفی ۲۳۴ھ کا پیرو تھا دوسرا جعفر بن حرب المتوفی ۲۳۶ہجری کا یہ دونوں جعفر اس بات کے قائل تھے کہ اللہ بچوں اور دیوانوں پر ظلم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ اس کو متکلم کہا جاسکتا ہے نیز یہ کہ فاسق مسلمان، یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر

ہیں اور شراب پینے والے کے متعلق مسلمانوں کا یہ اجماع کہ اُس پر حد جاری کی جائے۔ شرعی حجت نہیں کیونکہ اس کے متعلق نہ کلام مجید کی کوئی آیت ہے نہ پیغمبرؐ کی کوئی حدیث۔
(تبصیر فی الدین ص۴۳، مواقف جلد۸ ص۳۸۱)

اسکافیہ۔ یہ فرقہ محمد بن عبد اللہ الاسکافی کا پیرو تھا اس نے اس فرقہ جعفریہ کی تمام باتوں میں تائید کی۔
(تبصیر ص۴۳، مواقف ص۳۸۱)

بشریہ۔ یہ لوگ بشر بن معمر کے پیرو تھے اس بشر کا مسلک یہ تھا کہ انسان ہی رنگ۔ مزا۔ خوشبو سمع و بصر کا خالق ہے۔ اللہ بچوں کو عذاب کر سکتا ہے اور اگر کرے تو ظالم ہوگا۔ اور چونکہ بچوں پر عذاب کرنا مستحسن نہیں اس لیئے یہ ماننا پڑے گا کہ اگر خداوند عالم نے بچوں پر عذاب کیا تو وہ بچے ضرور بالغ و عاقل اور مستحق عذاب و عقاب ہوں گے۔ اور اگر خداوند عالم اپنے کسی بندے کا کوئی گناہ معاف کردے اس کے بعد وہ بندہ پھر گناہ کرے تو یہ بندہ دوسرے گناہ پر بھی معذب ہوگا اور پہلے گناہ پر بھی جو اللہ معاف کر چکا تھا۔ (تبصیر ص۹)

مزداریہ۔ یہ لوگ عیسیٰ بن صبیح مزدار کے پیرو تھے جو بغداد کے اکابر معتزلہ اور اُن کے زاہدوں میں سے تھا اس کا نام ہی پڑ گیا تھا زاہب المعتزلہ اس کا مسلک یہ تھا کہ اللہ ظلم و کذب پر قادر ہے اور اگر ظلم و کذب عمل میں لائے تو وہ ظالم و کاذب ہوگا۔ قرآن کا مثل بلکہ بلحاظ ترتیب و نظم اس سے بہتر قرآن پیش کرنا لوگوں کے لیئے ممکن ہے۔ بادشاہ کی معاشرت میں رہنے والا کافر ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہشامیہ۔ ہشام بن عمرو فوطی کے پیرو۔ یہ ہشام دوسری صدی ہجری کے معتزلہ سے تھا جو مامون عباسی کے ہمعصر تھے یہ ہشام حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ (ہمارے لیئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین وکیل ہے) کہنا حرام قرار دیتا تھا حالانکہ خود قرآن مجید میں کئی جگہ یہ لفظیں آئی ہیں اس کا دعویٰ تھا کہ اللہ پر لفظ وکیل کا اطلاق حرام ہے۔ اسکا یہ بھی نظریہ تھا کہ خداوند عالم نے نہ تو مومنین کے قلوب کی تالیف کی نہ گمراہوں کو کافر قرار دیا۔ جنت و جہنم ابھی تک پیدا نہیں ہوئے جو شخص کہے گا کہ پیدا ہو چکے ہیں وہ کافر ہے کیونکہ حشر سے پہلے اُن کو پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اسی قسم کے اور بھی بہت سے نرالے اقوال اُس کے ہیں جنھیں شہرستانی۔ لاہجی اور ابو حامد اسفرائنی نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ (التبصیر فی الدین ص۴۵، مواقف اور دیگر کتابیں)

حابطیہ۔ احمد بن حابط کے پیرو یہ نظام معتزلی کے شاگردوں میں سے تھا شہرستانی نے لکھا ہے کہ احمد بن حابط تناسخ کا قائل تھا صاحب مواقف نے دعویٰ کیا ہے کہ معتزلہ میں تناسخ کے قائل فرقہ حدثیہ والے ہیں جو فضل بن حدثی کے پیرو تھے۔ یہ فضل بن حدثی نظام معتزلی کا ایک شاگرد تھا اور حابطیہ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ عالم کے لیئے دو خدا ہیں ایک قدیم اور وہی اللہ ہے اور دوسرا جدید اور وہ سید مسیح ہیں۔ ان حابطیہ والوں نے ثبوت میں کلام مجید کی یہ آیت پیش کی ہے وجاء ربک والملک صفاً صفاً۔

صاحب مواقف نے مزید کہا ہے کہ فرقہ حابطیہ کا مسلک یہ ہے کہ خداوند عالم نے حیوانات کو کسی اور گھر میں بالغ اور عاقل پیدا کیا انھیں اپنی معرفت سے سرفراز اور نعمتوں سے نہال کیا پھر اُن کی آزمائش کی اور شکر نعمت کی تکلیف دی جس نے سب باتوں میں نافرمانی کی اُسے دار العذاب میں بھیجدیا یعنی جہنم میں اور جس نے بعض باتوں میں اطاعت اور بعض میں نافرمانی کی انھیں اس دنیا میں بھیجدیا اور اُن کو یہ دنیا وی مختلف لباس پہنائے سارے حیوان اسی دنیا میں ایک صورت کے بعد دوسری صورت میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

(الفرق بین الفرق ص۵۰۳، مواقف ص۳۸۲)

ثمامیہ۔ ثمامہ بن اشرس نمیری کے پیرو۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ اور مجوس و زنادقہ بروز آخرت مٹی بن جائیں گے نہ جنت میں جائیں گے نہ جہنم میں یہی حال بہائم اور اطفال کا بھی ہوگا۔ مزید یہ کہ کفار میں جو لوگ اپنے خالق کی معرفت سے محروم ہیں وہ معذور ہیں۔

مؤرخین اور علمائے مذاہب نے اس ثمامہ کی طرف جن اقوال کی نسبت دی ہے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ملحد فلاسفہ کی تعلیمات سے بڑی حد تک متاثر اور دین کا مذاق اُڑایا کرتا تھا چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب مختلف الحدیث میں لکھا ہے کہ اس ثمامہ نے ایک دن کچھ لوگوں کو نماز جمعہ کے لیے دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا اس نے اپنے غلام کی طرف مڑ کر کہا ان گدھوں کو دیکھو اس عربی شخص (محمد مصطفیٰ) نے انھیں کتنا دیوانہ بنا دیا تھا۔

جاحظ نے روایت کی ہے کہ:

مامون نے ایک مرتبہ اس کو نشہ میں بدمست اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا دیکھا کہا تم ہی ثمامہ ہو اس نے کہا ہاں خدا کی قسم! مامون نے کہا تمھیں شرم نہیں آتی؟ اُس نے نہیں خدا کی قسم! مامون نے کہا تم پر خدا کی لعنت ہو۔ اُس نے جواب دیا بیش باد۔ (مواقف جلد ۸ ص۳۸۲ تبصیر ص۵۰، الفرق بین الفرق جلد اول)

خیاطیہ۔ یعنی عبد الرحیم بن محمد معروف بہ ابوالحسین الخیاط کے پیرو۔ اس کا انتقال ۳۰۰ھ ہجری میں ہوا۔ یہ جعفر بن بشر کے شاگردوں میں سے نیز اُن لوگوں میں سے تھا جو قدر کے قائل تھے بایں معنی کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ سارے اجسام قدیم ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تعدد و تقدما کا قائل تھا۔ اسی طرح اُس کے اور بھی نظریات ہیں جو اس سے پہلے کے معتزلہ کے مخالف ہیں۔ (مواقف ص۳۸۲ تبصیر وغیرہ)

جاحظیہ۔ یعنی عمر بن بحر الجاحظ کے پیرو۔ جاحظ کا انتقال ۲۵۵ھ ہجری میں ہوا۔ یہ معتصم اور متوکل عباسی کا ہم عصر اور بیشمار کتابوں کا مؤلف ہے۔

جاحظ کا نظریہ تھا کہ خداوند عالم عاصیوں کو جہنم میں نہیں ڈالے گا بلکہ خود جہنم اپنی طرف عاصیوں کو کھینچ لے گی۔ قرآن جسم ہے اور یہ جسم کبھی مرد بن جاتا ہے کبھی عورت۔

یہ جاحظ علم و ادب اور فلسفہ کا مشہور علامہ تھا بیشمار کتابیں اس نے لکھی ہیں جو مختلف علوم میں اُس کی مہارت اور تبحر کا ثبوت ہیں۔

جبائیہ۔ محمد بن عبد وہاب جبائی کے پیرو اس کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا یہ معتزلہ کے طبقۂ ثامن کا
سب سے بڑا لیڈر تھا۔ جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے۔ یہ بچپنے ہی سے بلا کا ذہین اور غیر معمولی حافظہ کا مالک
تھا مکمل جوان ہونے پر اس کے ذہن وذکاوت اور حریف مخالف کو لاجواب کر دینے میں بڑی شہرت ہوئی علم کلام
میں اس کی مہارت و مشاقی کا عالم یہ تھا کہ اُس نے اپنے شاگردوں کو تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار
اوراق لکھائے ہوں گے۔

سب سے زیادہ اس کی خدمت میں حاضر باش رہنے والا۔ علی بن اسماعیل اشعری تھا۔ ۴۰ برس تک
اس سے چپکا رہا معتزلہ کے نظریات وعقائد پوری طرح سمجھے اور اُن کے علماء متبحرین میں شمار کیا جانے لگا جب خوب
چمک اُٹھا اور اُسکے علم وکمالات کی شہرت ہوئی تو معتزلہ سے الگ ہوگیا اور مسلک اعتزال کو خیر باد کہہ
اُن کی رد میں کتابیں لکھیں اب اُس کا دائرۂ اثر بڑھ چکا تھا اور علی الجبائی میں طاقت باقی نہیں رہی تھی
کہ اُسکے اعتراضات کا جواب دے سکے۔

علماء مورخین نے بہت سے مناظرے نقل کئے ہیں جو اُس میں اور علی الجبائی میں ہوئے منجملہ اُن کے
یہ کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے علی جبائی سے پوچھا کہ خداوند عالم کو عاقل کہہ سکتے ہیں یا نہیں جبائی نے کہا نہیں
اس لئے کہ عقل عقال سے مشتق ہے اور عقال کے معنی مانع کے ہیں اور منع کی لفظ اللہ کے لئے ناممکن ہے
ابو الحسن اشعری نے کہا کہ پھر تو خدا کو حکیم بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ حکیم حکمۃ اللجام سے مشتق ہے جو اُس
لوہے کو کہا جاتا ہے جو جانور کو قابو سے باہر نہیں ہونے دیتا لہٰذا اگر کوئی لفظ منع سے مشتق ہو اور منع اللہ
کے لئے محال ہو تو اس بنا پر حکیم کی لفظ بھی محال ہونا چاہیئے۔

جبائی نے پوچھا تم بھی تو اللہ کو عاقل کہنا جائز نہیں سمجھتے اور حکیم کہنا جائز قرار دیتے ہو یہ کیسے؟ اشعری
نے کہا میرا مسلک اسمائے الٰہی کے بارے میں اذن شرعی ہے شریعت نے جن ناموں کی اجازت دی ہے اُن
ناموں سے اللہ کو یاد کیا جاسکتا ہے اور جن ناموں کی اجازت نہیں دی اُن سے نہیں یاد کیا جاسکتا میں شریعت
کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کو حکیم کہتا ہوں اور عاقل اس لئے نہیں کہتا کہ شریعت نے منع کیا ہے۔

(الغرق علی الغرابی)

مؤرخین کی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مباحثوں میں استاد شاگرد کے درمیان اختلاف ہوتا اور
یہی اختلاف استاد سے شاگرد کی علیحدگی کا باعث ہوا جبکہ مدت دراز تک یہ اشعری معتزلہ کے اقوال و
نظریات کا بڑی سختی سے معتقد اور انتہائی خلوص اور بے لوثی سے اُنکی حمایت کرچکا تھا۔

اگر آپ اکابر معتزلہ کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیجیئے معتزلہ کے باوا آدم واصل سے لے کر تیسری صدی
ہجری کے پیشوائے اعظم علی جبائی تک تو آپ کو معلوم ہوگا کہ خود ان معتزلہ کے درمیان اکثر و بیشتر کلامی اور
فلسفیانہ مسائل میں سخت وشدید اختلافات رہے ہیں علی الجبائی کا قول ہے کہ مجھ میں اور ابو الہذیل العلاف

ہیں۔ ۱۹ مسئلوں میں اختلاف ہے تو محض بعض مسائل میں استاد شاگرد کے درمیان اختلاف ہونے کی وجہ سے مسلک اعتزال سے ایسی جنگ کی نوبت کبھی نہیں آئی جیسی اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان سخت و شدید جنگ ہوئی۔ مزید برآں خود معتزلہ کا کہنا تھا اختلافات چاہے جتنے ہی سخت و شدید ہوں جب تک اس مسلک اعتزال کے پانچ بنیادی ارکان پر آنچ نہ آئے فریقین معتزلہ ہی میں داخل رہیں گے اس لئے بہت ممکن کہ اشعری پہلے ہی دن سے جبکہ درسگاہ اعتزال سے وابستہ ہو کر اکابر معتزلہ کا تقرب حاصل کیا آخر وقت تک نہ تو اُن کے نظریات کا سچے دل سے معتقد تھا نہ اُن کے مسلک سے متفق بلکہ اُن سے صرف اس لئے قریب ہوا اور اُن کے نظریات و مسلک سے گہری دلچسپی لی تاکہ پورا عبور حاصل کر کے اُن کی رد کرے اور محدثین کی حمایت و پاسداری کرے جو عرصہ سے معتزلہ اور اُن کے ہواخواہوں کے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے۔

ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی مدت تک اُن کی درگاہ میں بیٹھنے اُن کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اُن کے بحث و استدلال کے طریقوں سے وہ بھی متاثر ہو گیا ہو اسی لئے اس نے اپنے لئے بحث و استدلال کی ایسی راہ نکالی جس میں عقل و حدیث دونوں ہی کی آمیزش تھی اُس نے بحث و استدلال میں نہ تو تنہا عقل پہ بھروسہ کیا نہ تنہا حدیث پہ اُس نے دونوں ہی سے کام لیا اگرچہ اس طریقہ کو اختیار کرنے کے بعد بھی اشعری کی جان بچ نہ سکی اور جس طرح معتزلہ اُس کے دشمن ہوئے اُسی طرح محدثین اور محدثین کے ہمدرد بھی اُس کے دشمن بن گئے جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

بہر حال ابو علی الجبائی نے بہت سے نظریات میں اکابر معتزلہ کی مخالفت کی صفات خداوندی اور دیگر بہت سے مسائل میں اُس کے اقوال شیوخ معتزلہ سے الگ ہٹ کر ہیں اس کے بعد اس کا لڑکا ابو ہاشم عبد السلام بن محمد جبائی باپ کا جانشین ہوا اُس نے بھی بہت سے خصوصی نظریات و افکار پیش کئے اور ۱۹ مسئلوں میں اپنے باپ علی الجبائی کی مخالفت کی دیکھئے شیخ محمد زاہد کوثری کا حاشیہ بر کتاب التبصیر۔

اس ابو الہاشم کے خصوصی نظریات میں سے یہ نظریات بھی تھے۔

اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرے مگر دوسرے گناہ پر اس کا اصرار باقی رہے تو اُس کی توبہ قبول نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر کوئی یہودی یہودیت سے توبہ کرے مگر کسی مستحق کو اس کا حق نہ دے تو یہودیت سے اُس نے جو توبہ کی تھی وہ توبہ صحیح نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ سے اُس وقت توبہ کرے جبکہ اُس گناہ کے کرنے کی طاقت اُسے باقی نہ رہی ہو تب بھی اُس کی توبہ قبول نہ ہوگی جیسے کوئی شخص جھوٹ بولے پھر اس کی زبان کٹ جائے اُس کے بعد توبہ کرے کہ اب کبھی جھوٹ نہیں بولے گا تو اُس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

صاحب تبصیر نے اس کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا ہے کہ عرفہ میں وقوف سعی اور طواف واجب نہیں۔

یہ ابو الہاشم معتزلہ کو کافر بتاتا اور معتزلہ اسے کافر بتاتے یہ اپنے باپ پر تبرا کیا کرتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم معتزلہ کے ہر فرقہ کے لوگوں کے نظریات بیان کریں ہم نے جس مقصد سے یہ کتاب لکھنا شروع کی ہے اُس کی تمہید کے طور پر اکابر معتزلہ اور اُن کے بعض نظریات کا بیان کرنا ناگزیر تھا۔

معتزلہ کے نظریات کے یہ چند نمونے جو ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کیئے اُن سے اُن عقلی رجحانات کی تصویر سامنے آجاتی ہے جو معتزلہ کی فکر پر چھائے ہوئے تھے، انھوں نے اپنی تمام بحثوں میں محض عقل پر بھروسہ کیا خواہ وہ بحثیں شرعی مسائل سے متعلق ہوں یا غیر شرعی مسائل سے۔ اُنھوں نے تمام گتھیوں کو منطقی حیثیت سے حل کرنے کی کوشش کی، اصل حاکم و سلطان عقل کو تسلیم کیا اور شرع کو شریعت عقل کا ترجمان اور متمم سمجھا لہٰذا اگر کسی موقع پر کلام مجید کے حکم اور عقل کے حکم میں تناقض ہو تو لازمی ہے کہ کلام مجید کی سطح تاویل کی جائے کہ حکم عقل سے موافقت پیدا ہو جائے۔ غرضکہ معتزلہ کے نزدیک شریعت عقل انتہائی محترم اور واجب التعظیم ہے کسی حال میں اُس پر آنچ نہیں آنے دی جائے گی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقل کسی بات کو معلوم کرنے سے قاصر رہتی اُس وقت کلام مجید کا سہارا لیتی ہے جیسے یہ معلوم کرنے کے لیئے کہ آخرت میں ثواب کی مقدار کیا ہو گی یا عذاب کس مقدار میں ہو گا؟ لیکن اصل ثواب و عقاب اُس کا فیصلہ کرنے والی عقل ہے اگر وحی ربّانی ثواب بھی بتاتی تب بھی عقل تنہا یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ نیک کام کی جزا میں ثواب اور بدی کی سزا میں عذاب ہو گا مگر ثواب کی مقدار کیا؟ اس کا پتہ شریعت ہی سے چل سکتا ہے۔

علی الجبائی اور اُس کے فرزند ابوہاشم کا قول تھا کہ مقتضائے حکمت و عقل کی بنا پر حکیم پر واجب ہے کہ مطیع کو ثواب اور نافرمان کو عذاب کرے

لیکن یہ عذاب و ثواب وقتی ہو گا یا دائمی یہ سن کر معلوم کیا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معتزلہ عقل کو حاکم مطلق مان کر اتنا حد سے گذر گئے کہ اُن کے نزدیک وحی ربانی کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ شریعت عقل کی ترجمانی اور وضاحت کرے۔ ہر شخص اپنی عقل سے کسی کام کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے اور اگر کبھی عقل کسی بات کو معلوم کرنے سے قاصر رہے گی تو وہ وحی کا سہارا لے گی لہٰذا وحی یا تو شریعت عقل کی مؤید ہو گی یا شارح و کاشف اُن باتوں کی جن کو عقل صحیح طور پر نہ معلوم کر سکے اور شریعت اور عقل کے فیصلہ میں اختلاف ہو گا تو ضروری ہے کہ نصوص شرعیہ کی اس طرح تاویل کی جائے کہ وہ حکم عقل کے موافق ہو جائے۔

عقل ہی کو سب کچھ ماننے میں اتنی افراط اسلام کی تاریخ میں بالکل نئی بات تھی ان علمائے حدیث کی نظر میں جو شروع زمانہ سے اس کے عادی چلے آرہے تھے کہ ہر پیچیدہ مسئلہ پر قرآن و حدیث ہی کی روشنی میں بحث کرتے تھے۔ محدثین یہ دیکھ کر اور بھی بھڑک اٹھے کہ معتزلہ کے بہت سے نظریات ایسے ہیں جن میں اسلام کی بنیادی باتوں کی صریحی مخالفت ہے۔ جیسا کہ ہم فرقۂ واصلیہ، نظامیہ، بشریہ وغیرہ کے بہت سے ایسے نظریات اوپر بیان کر چکے ہیں یہی وجہ تھی کہ معتزلہ اور محدثین کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی دونوں نے ایک دوسرے کو کافر اور دین سے خارج بتایا اور ایسی جنگ چھڑ گئی جس میں صلح کی کوئی صورت ہو نہ سکی تھی ہر فریق اسکا مدعی تھا کہ ہم اسلام کے حامی اور

تخریب کاروں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرنے والے ہیں جب دن سے بنی عبّاس نے معتزلہ کی پشت پناہی شروع کی اور بزورِ شمشیر اُن کے نظریات و عقائد لوگوں سے منوانے چاہے اُس دن سے محدّثین کی برہمی اور معتزلہ پر اُن کا غیظ و غضب اور بڑھ گیا۔

مسئلہ خلق قرآن میں تو عبّاسیوں نے محدّثین پر کھُلم کھُلا مظالم ڈھائے۔ واثق اور معتصم کے زمانہ میں ان کی مصیبتیں انتہا کو پہونچ گئیں ان دونوں بادشاہوں نے مامون کی وصیّت پوری کرتے ہوئے خلق قرآن کے مسئلہ میں معتزلہ کی انتہائی پاسداری کی اور محدّثین کو جو خلق قرآن کے منکر تھے پوری طرح کچلنے کی کوشش کی معتزلہ کا اقتدار بڑھتا جارہا تھا یہاں تک کہ متوکل خلیفہ ہوا اُس نے معتزلہ کی پشت پناہی چھوڑ کر محدّثین کی حمایت شروع کردی انھیں موقع دیا کہ وہ اپنے اجتہاد کے مطابق اپنے نظریات پیش کریں۔ محدّثین جو عرصہ سے قعرِ مذلّت میں ڈوبے چلے آرہے تھے انھیں سربلندی بخشی اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں تو اُس نے محدّثین کو بالکل آسمان ہی پر پہونچا دیا۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب سے اعتزال کی بنیاد پڑی تھی اُس وقت سے معتزلہ کو اپنے زمانہ کے بادشاہوں کی طرف سے رکاوٹ پیش نہیں آئی اُمویوں نے اگرچہ اُن کی پشت پناہی اس طرح نہیں کی جس طرح بعض عباسی سلاطین نے کی لیکن اُنھوں نے اُن کے معاملات میں دخل نہیں دیا معتزلہ اور غیر معتزلہ سب کو بحث مباحثہ، مذہبی جھگڑوں اور مختلف معتقدات میں مناظروں کی آزادی دے رکھی تھی اُن کا خیال تھا کہ علماء جب اس قسم کے جھگڑوں میں پھنسے رہیں گے تو سیاسی معاملات کی طرف اُن کا دھیان ہی نہیں ہوگا۔ ہماری من مانی کارروائیوں اور حکومت کی بد انتظامیوں کی طرف اُن کو توجہ نہ ہوگی۔

ہارون رشید کے خلافت کے خاتمہ تک عباسی حکّام کا بھی معتزلہ کے ساتھ یہی رویہ رہا جو اُنکے پیشرو اموی سلاطین کا تھا وہ تمام جماعتوں اور مذہبی فرقوں سے آنکھ بند کیے صرف علویوں کو لوٹنے مارنے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کرنے میں مصروف رہے اور اگر کبھی کسی عالم کو انھوں نے تقرب بخشایا دکھاوے کے طور پر اُس کی تعظیم و تکریم بھی کی جیسا کہ منصور اور ہارون نے کبھی کبھی کیا تو اُس سے اُن کی غرض صرف اپنی سیہ کاریوں کی پردہ پوشی ہوا کی۔

لیکن جب مامون کا زمانہ آیا تو اُس نے معتزلہ کے نظریات و افکار کو دل و جان سے قبول کیا انھیں اپنے یہاں تقرب بخشا جتنے حاجب و دربان وزیر و سکریٹری مقرر کیے معتزلہ ہی سے کیے انکے اور محدّثین کے درمیان بحث و مباحثہ اور مناظروں کے لیے مجالس کا اہتمام کیا اور آخر میں یہ دیکھ کر فقہاء و محدّثین اپنے نظریات پر سختی سے جمے ہوئے ہیں ٹس سے مس نہیں ہوتے اُس نے بزورِ شمشیر معتزلہ کے نظریات منوانے پر کمر باندھی عوام سے بھی اور فقہاء سے بھی۔ فقہاء و محدّثین کے ساتھ مامون کی اس سختی اور تشدد نے عوام میں اُن کی ہمدردی پیدا کردی اور سب ہی عزت و احترام کی نظروں سے انھیں دیکھنے لگے۔

یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی حکومت کا دباؤ کم ہوا فقہاء و محدثین پر سختیوں کا سلسلہ رکا سب کی نگاہیں انھیں کی طرف اٹھیں اور جمہور کی نظر وہیں امام احمد عظیم ترین ہستی بنکر ابھرے محدثین نے جنکے سید و سردار امام احمد تھے موقع سے فائدہ اٹھایا اور حکام کو معتزلہ سے برگشتہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی آزادی سے اپنے نظریات کی تبلیغ کی اور وہی سب کچھ کیا جو اُن سے پہلے معتزلہ اور اُن کے اعوان و انصار کر چکے تھے۔

تاریخی مصادر یہ بھی بتاتے ہیں کہ معتزلہ کی ہنگامہ آرائیوں کے مقابلہ میں محدثین نے بڑی پامردی دکھلائی، معتزلہ کے متعلق اپنے خیالات پوری صراحت سے ظاہر کیئے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ ابو حنیفہ کے صحابی و شاگرد رشید ابو یوسف نے اُنھیں زندیق قرار دیا مالکی و شافعی نے بھی فتوئی دیا کہ معتزلیوں کی شہادت ناقابل قبول ہے۔ محمد بن حسن شیبانی نے کہا کہ ان معتزلہ کے ساتھ نماز پڑھنا جائز نہیں۔ (مذاہب اسلامیہ ابو زہرہ ص۲۲)

ابو مظفر اسفرائنی کی کتاب التبصیر سے پتہ چلتا ہے کہ فقہا و محدثین عہد تابعین سے لیکر چوتھی صدی کے خاتمہ تک معتزلہ کو حکام کی پشت پناہی حاصل ہونے کے باوجود معتزلہ کے مخالف رہے۔

اسفرائنی نے اہل سنت کے ان اعتقادات کا ذکر کیا ہے جو معتزلہ کے صریحی مخالف ہیں اور وہ اُن کو ذکر کرکے لکھتے ہیں:۔

"یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے اہل سنت کے جتنے اعتقادات ذکر کیئے ہیں اُن میں کوئی اختلاف نہیں نہ شافعی اور ابو حنیفہ کے درمیان نہ دیگر صاحبان قیاس و حدیث کے درمیان جیسے مالک و اوزاعی۔ داؤد ظاہری سفیان بن عئینیہ یحییٰ بن معین۔ اسحاق بن راہویہ۔ محمد ابن اسحاق حنظلی وغیرہ۔

اسی سلسلہ میں اسفرائنی نے حجاز و عراق و شام و خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے فقہاء کے نام گنائے ہیں جو تیسری صدی ہجری میں معتزلہ کے ہم عصر رہے ہے، نیز صحابہ و تابعین بھی جو معتزلہ سے پہلے گزرے اُنھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ابو حنیفہ اور شافعی کی تالیفات کا حوالہ دیا ہے حتیٰ کہ جس زمانہ میں معتزلہ کا طوطی بول رہا تھا اور محدثین پر قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں اس زمانہ میں بھی بقول مؤرخین کئی ایک کتابیں تالیف ہوئیں جن محدثین و فقہا کے خیالات معتزلہ اور اہل اہواء و بدع کے متعلق صراحت سے درج تھے۔

ان مذہبی جھگڑوں نے جن کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچایا عقائد اسلامی میں بہت کچھ شکوک و شبہات پیدا کر دیے، قدیمی مذاہب یہودیہ و نصرانیہ وغیرہ کی بہت سی باتیں اُس میں داخل ہوگئیں اور انھیں وجوہ سے عقائد اسلام میں بہت کچھ ابہام و پیچیدگی پیدا ہوگئی لیکن ان سب کے باوجود ہم اُن فائدوں کا انکار نہیں کر سکتے جو عقائدی جنگ اور عقل و منطق

کو حاکم قرار دینے سے مسلمانوں نے اُٹھائے اس نئے اسلوب نے اسلامی انداز فکر کو قوت اور بحث و تکرار کی مشق بہم پہونچائی اور اُن لوگوں سے ٹکر لینا ممکن ہوا جو اسلامی تعلیمات میں آمیزش اور اسلامی عقائد کو مشکوک بنا کر اسلام کو زک پہونچانے کے درپے تھے۔ہمیں کوئی شک نہیں کہ معتزلہ کے طرفداروں نے معتزلہ کی جن فیض رسانیوں کے لمبے چوڑے دعوے کیے ہیں اُس میں انھوں نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے اسی طرح فقہاء و محدثین کی مذمت و منقصت میں بھی جو دین کے سمجھنے میں اپنے اسلاف کے طریقہ کے پابند تھے بڑی زیادتی سے کام لیا۔ اسی طرح محدثین و فقہاء نے بھی اُنھیں بدنام کرنے میں بہت زیادتی کی ہے۔ اور اُن کی طرف ایسے افکار و خیالات کی نسبت دی ہے جو کبھی بھی اُن کے نہیں رہے اور مختلف طریقوں سے یہ جتانے کی کوشش کی کہ بس ہم ہی دین و عقائد کے محافظ ہیں اگر ہم نہ ہوتے تو اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔

واقعہ یہ ہے کہ دونوں ہی میں بہت سی اچھائیاں بھی تھیں اور بہت سی خرابیاں بھی۔ دونوں ہی نے دین میں بہت سی بدعتیں اور خرافات بھی داخل کیے جن کی وجہ سے اسلام کی تعلیمات بدنام ہوئیں اور دوسری طرف فکر و فہم کو فائدے پہونچائے اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں بحث و مباحثہ کی قوت اور مناظرہ میں مشاقی بہم پہونچائی اس نظریاتی اور فکری جنگ کے ذریعہ فریقین نے اسلامی تہذیب و ثقافت کی اشاعت کی اور گرانقدر و مایۂ ناز علمی و دینی کتابیں تالیف ہوئیں۔

انتہائی صدمہ و ملال کی بات یہ ہے کہ ان اسلامی فرقوں کے متعلق بحث کرنے والوں نے ائمہ اہل بیتؑ اور اُن کے تلامذہ سے یکسر تجاہل برتا جو دوسری تیسری صدی ہجری میں ان فکری انقلات میں ہر مرحلہ پر ساتھ رہے باوجودیکہ یہ لوگ بھی اسی علمی فضا میں جو متضاد افکار و نظریات سے بھری ہوئی تھی جی رہے تھے اور اس زمانہ کے علماء میں سب پر فائق اور امتیازی حیثیت کے مالک تھے جیسا کہ خود اُن کے مخالفین کو بھی اقرار تھا۔ اُن کی بزم، اُن کے گھر ہر عالم و متعلم کا منزل مقصود بنے ہوئے تھے پھر بھی ان کا نام نہیں لیا گیا نہ اُن کی اُن خدمات کا ذکر کیا گیا جو انھوں نے عقائد اسلامی کی حمایت میں انجام دیے جو تاریخ اسلام کے اس دور میں گوناگوں خطرات سے گھرے ہوئے تھے۔

اور باوجودیکہ ائمہ اہلبیتؑ اور اُن کے شیعہ ہر چیز سے منھ موڑے خدمت دین میں منہمک اور عقائد اسلامی کی حمایت میں جان لڑائے ہوئے تھے جو اصل اور حقیقی عقائد تھے انھوں نے اُن کے شیعوں اور شاگردوں نے جیسے ہشام بن حکم۔ مومن طاق۔ محمد بن مسلم۔ یونس بن عبدالرحمان۔ زرارہ بن اعین۔ ابان بن تغلب۔ محمد بن عمر۔ فضل بن شاذ وغیرہ بیسیوں لوگوں نے عقائد اسلامیہ کی حمایت میں انتہائی

غیر معمولی کارنامے بھی انجام دیے اُنھوں نے معتزلہ اور محدّثین و اشاعرہ کا درمیانی راستہ اختیار کیا اُنھوں نے نہ تو معتزلہ کی پوری طرح ہمنوائی کی نہ ہر بات میں محدّثین کی تائید کی حدیث کی کتابوں اور علم کلام میں شیعوں نے جو کتابیں تالیف کی ہیں اُن سب میں شیعۂ امامیہ کے نظریات و افکار صراحت سے موجود ہیں۔ توحید و صفات خداوندی۔ قدر و اختیار، نبوت و امامت، جنت و نار اور ان تمام مباحث کے متعلق جو نزاع و اختلاف اور بحث و تکرار کا موضوع بنے ہوئے تھے مسلمانوں کے درمیان بھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی۔

ہم جس وقت شیعوں کے نظریات و افکار کا دیگر اسلامی فرقوں کے نظریات و افکار سے موازنہ کریں گے اس وقت ہم شیعوں کے نظریات و افکار کا ایک حصہ پیش کریں گے جن سے واضح ہوگا کہ وہ تنہا شیعہ ہی تھے جنھوں نے عقائد اسلامی کے اصول وضع کیے دسیسہ کاروں افترا پردازوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا ایسے منطقی اسلوب سے جس کی عقل بھی مؤید تھی اور فطرت بھی متفق۔

مختصر یہ کہ عقائد میں نزاع و اختلافات صرف اشاعرہ اور معتزلہ ہی میں نہیں محدود تھے۔ یہی دونوں فریق نہ تھے بلکہ ایک تیسرا فریق بھی تھا یعنی شیعہ امامیہ جو بہت سے مسائل میں معتزلہ اور اشاعرہ دونوں ہی سے الگ تھے اس کے اختلافات معتزلہ سے بھی تھے۔ اور اشاعرہ سے بھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خصومت اور عداوت شیعہ امامیہ اور دوسروں میں اتنی انتہا کو نہیں پہونچی جتنی معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان حد سے گذر گئی۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ خصومت و نزاع معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان پانچویں صدی ہجری کے اوائل تک باقی رہی۔ کبھی یہ نزاع شدّت اختیار کر لیتی کبھی سست پڑ جاتی یہاں تک کہ قادر عباسی کا زمانہ آیا اُس نے ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے ایک فیصلہ کن قدم اُٹھایا اُس نے تمام محدّثین اور اُن کے طرفدار اشاعرہ کو اکٹھا کیا سب نے مل کر ایک کتاب مرتب کی جس کا نام اعتقاد قادری رکھا اُس میں وہ تمام باتیں اصولدین کی اکٹھا کر دی گئیں جن کا اعتقاد رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے جیسے توحید و صفات خداوندی اور مسئلہ خلق قرآن اور دیگر مسائل جو معتزلہ و اشاعرہ کے درمیان اختلافات کا موضوع بنے ہوئے تھے فقہا نے اپنے ہاتھوں سے اس کتاب کی نقلیں تیار کیں اور حکومت نے مسلمانوں کے درمیان اس کی نشر و اشاعت کی ذمہ داری لی اور مخالفین کو تنبیہ کی گئی کہ کسی نے بھی اگر اس کی مخالفت کی تو اُسے سخت ترین سزائیں دی جائیں گی۔

خلیفہ قادر نے فرامین جاری کیے کہ کوئی شخص کلامی مسائل میں غور و خوض نہ کرے درس و تدریس سے واسطہ نہ رکھے نہ مذہب اعتزال کی بنا پر بحث و مناظرہ کرے اس طرح مسلک اعتزال کا خاتمہ ہو گیا اور اب صرف محدثین اور اشاعرہ کا مذہب باقی رہ گیا اس جبر و تشدد اور کھلی ہوئی جانبداری کی وجہ سے مذہب

اشاعرہ کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا اور اعتزال کو گھن لگ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر حکومت کھل محدثین واشاعرہ کی جانبداری نہ کرتی اور اس جانب داری میں حکومت نے سطوت و دبدبہ سے بھی کام نہ لیا جاتا تو اشاعرہ کبھی بھی معتزلہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے تھے۔

اصولِ اسلامیہ میں تقلید و پیروی تمام مسلمانوں کے لیے واجب قرار دی گئی اور اجتہاد و عقل سے کام لینے کا زمانہ ختم ہو گیا جس طرح فروعی مسائل میں منتصر عباسی نے صرف چار مذہبوں کو باقی رکھ کر جو آج تک اہل سنت کا مرجع بنے ہوئے ہیں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور امام احمد بن حنبل کے بعد اب کسی کو اجتہاد کی اجازت نہیں بارہ برس سے اب جو عالم بھی فتویٰ دیتا ہے انھیں چاروں میں سے کسی ایک مذہب کے مطابق خود اس کے لیے اجتہاد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ بالکل ظاہر و واضح حقیقت ہے کہ حکام و سلاطین نے اشاعرہ و محدثین کی اس شدومد سے جو حمایت کی وہ کسی دینداری کے جذبہ کے تحت نہیں بلکہ صرف عام پبلک کو خوش کرنے کے لیے جو اس وقت حنابلہ اور اشاعرہ کی جی جان سے ہمدرد تھی۔ امام احمد بن حنبل اور اشاعرہ و محدثین کو مامون رشید کے زمانہ میں معتزلہ کی بدولت بہت سے مصائب و آلام برداشت کرنا پڑے تھے مظلوم کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی بالکل فطری چیز ہے اسی مظلومی کی وجہ سے رائے عامہ اُن کے موافق ہو رہی تھی اور مامون کے بعد کے خلفاء مجبور ہوئے کہ عوام کو راضی کرنے کے لیے احمد بن حنبل اور اُن کے پیروؤں کی دلجوئی کی جائے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل پر پہرے بٹھا دینا اور اس کی صلاحیتوں کو محدود کر دینا علم پر بھی ظلم تھا دین پر بھی اور مسلمانوں پر بھی اگر عقل نہ ہوتی لوگ اسکی صلاحیتوں سے کام لینے کے خوگر نہ ہوتے تو نبی بھی انبیاء کی تبلیغ کامیاب نہ ہوتی نہ وہ علمی ترقیاں ہوتیں جو تمامتر عقل کی مرہون منت ہیں۔

اشاعرہ

اشاعرہ علی ابن اسماعیل معروف بہ ابوالحسن اشعری کی طرف نسبت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ۳۰۰ہجری میں مذہب اشاعرہ کے اصول وضع کیے جبکہ اس نے اپنے استاذ محمد بن عبدالوہاب جبائی سے علیحدگی اختیار کر لی اور محدثین کی اُن کے اکثر نظریات و افکار میں حمایت کی۔ اس اشعری نے صاحبان حدیث اور معتزلہ کی درمیانی راہ اختیار کی۔ محدثین صرف نصوص (یعنی قرآن و حدیث) پر بھروسہ کرتے اور عقل کو نصوص اور ظاہر آیات و حدیث کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہ دیتے اور معتزلہ صرف عقل پر بھروسہ کرتے اور دحی کو احکام عقل کا مؤید قرار دیتے تھے۔ اشعری نے کہا کہ نہ تو صرف عقل ہی پر بھروسہ کرنا کافی سمجھا اور نہ صرف نصوص ہی کی پابندی ضروری سمجھی۔ اس نے دونوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی۔

اس کے حالات میں مورخین نے بیان کیا ہے کہ سنہ ۲۶۰ ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ سنہ ۳۲۴ میں فوت ہوا۔ سلسلۂ نسب اس کا ابو موسیٰ اشعری تک منتہی ہوتا ہے بغداد میں پلا بڑھا اور وہیں انتقال کیا۔ اس کے اصحاب نے حنبلیوں کے خوف سے اس کی قبر مخفی رکھی اس لیے کہ حنبلیوں نے اسے کافر قرار دے دیا تھا اور اس کا خون مباح لیا تھا۔ جب تحصیل علوم کی طرف توجہ ہوئی تو اس نے جبائی کی صحبت اختیار کی اور تقریباً ۴۰ سال اس سے وابستہ رہا۔ یہ ہر وقت جبائی کی صحبت میں رہتا اور جی جان سے اسکے نظریات و افکار پر ایمان رکھتا تھا۔ سارے اقوال جبائی کے اسے ازبر یاد تھے۔ مختلف مسائل میں کئی ایک مناظرے اسکے اور جبائی کے درمیان ہوئے جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے جبائی سے علیحدگی اختیار کر لی اور معتزلیوں کے سخت ترین دشمنوں کی صف میں جا شامل ہوا۔ اشعری نے ایک دن جبائی سے سوال کیا کہ طاعت کی حقیقت کیا ہے؟ جبائی نے کہا ارادۂ باری کی موافقت کا نام ہے۔ اشعری نے کہا اس بنا پر تو لازم آتا ہے کہ بندہ اگر اللہ کی مراد بر لائے تو اللہ بندہ کا مطیع ہوگا۔ جبائی سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

شہرستانی ملل ونحل میں لکھتے ہیں کہ عجیب اتفاق یہ کہ قضا وقدر کے متعلق ابو موسیٰ اشعری ڈھائی سو برس پہلے وہی رائے ظاہر کر چکے تھے جو ان کے پرپوتے ابو الحسن اشعری نے اپنے زمانہ میں ظاہر کی۔ ابو موسیٰ اور عمرو عاص میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی۔ عمرو عاص نے کہا کاش مجھے کوئی ایسا آدمی ملتا جس سے میں اپنے پروردگار کے متعلق جھگڑا کر سکتا۔ ابو موسیٰ نے کہا میں موجود ہوں عمرو عاص نے کہا کیا خدا کے لیے یہ ممکن ہے کہ کوئی کام میرے لیے مقدر کرے پھر اس پر مجھے عذاب بھی کرے۔ ابو موسیٰ نے کہا ہاں۔ عمرو عاص نے پوچھا یہ کیسے؟ ابو موسیٰ نے کہا اس لیے کہ خداوند عالم تم پر ظلم نہیں کرے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابو الحسن اشعری پوری طرح پختہ ہونے اور معتزلہ کے نظریات و افکار پوری طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اکثر اوقات اپنے استاد کے مقابلہ میں سخت ترین مخالف کا موقف اختیار کرتا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ "خداوند عالم پر اصلح (زیادہ بہتر و مناسب) واجب ہے یا نہیں" کے مسئلہ میں اشعری اور جبائی میں خصومت انتہا کو پہونچ گئی۔ جبائی کا نظریہ تھا کہ خدا پر اصلح واجب ہے اور اشعری کا نظریہ یہ تھا کہ نہیں واجب ہے۔

اشعری نے جبائی سے پوچھا تین شخصوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ ایک مومن ہے، دوسرا کافر تیسرا نابالغ۔ جبائی نے کہا مومن صاحبان درجات ہے۔ کافر جہنمی ہے اور نابالغ صاحبان نجات سے۔ اشعری نے پوچھا اگر نابالغ اپنے مرنے کے بعد اپنی نابالغی کے عالم میں اہل درجات کی منزل پر فائز ہونا چاہے تو ممکن ہے یا نہیں؟ جبائی نے کہا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ مومن نے طاعت کی؛ جس سے درجات حاصل کیے اور نابالغ نے ویسی طاعت نہیں کی۔

اشعری نے کہا اچھا یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ قصور میرا نہیں اگر تو مجھے زندہ رکھتا تو میں بھی مومن کی طرح اطاعت بجالاتا۔

جبائی نے کہا خدا اس کو جواب دے گا کہ میں جانتا تھا کہ اگر تو زندہ رہے گا تو میری نافرمانی کرے گا میں نے تیری بھلائی چاہی اور سن تکلیف تک پہونچنے کے پہلے ہی اب تجھے اٹھا لیا۔

اشعری نے کہا اس صورت میں کافر بھی کہہ سکتا ہے کہ جس طرح اس بچہ کا حال تجھ پر روشن تھا اسی طرح میرا حال بھی تجھ پر روشن رہا ہوگا اور تو جانتا ہوگا کہ میں بڑا ہو کر معصیت کروں گا تو کیوں نہیں تو نے مجھے بچپن ہی میں اٹھا لیا تاکہ میں نہ نافرمانی کرتا اور نہ عقاب کا سزاوار ہوتا۔ اس مرحلہ پر پہونچ جبائی نے اپنے کو جواب سے عاجز پایا اور اشعری سے ناراض ہو گیا۔ (فرق اسلامیہ علی الغرابی۔ مذاہب اسلامیہ محمد ابو زہرہ تمہید لتاریخ الفلسفہ مصطفیٰ عبد الرزاق ۲۹۷)

ایسی ہی ایک اور گفتگو اسفرائینی نے بھی اپنی تبصیر میں نقل کی ہے۔

بہت سے مؤرخین نے اس پر زور دیا ہے کہ ان مناظروں کے بعد جو اشعری اور اس کے استاذ جبائی میں ہوئے۔ اشعری گھر میں ایک مدت دراز کے گوشہ نشین ہو گیا سب لوگوں سے قطع تعلق کر لیا اور پوری تن دہی سے معتزلہ کے افکار اور محدثین کے افکار و نظریات کا موازنہ کرتا رہا جب فریقین کے خیالات کا پوری طرح مطالعہ کر چکا اور دونوں کی خامیاں اچھی طرح معلوم کر لیں تو اس نے خود اپنے نظریات قائم کیے باہر نکل کر لوگوں کو مسجد میں اکٹھا ہونے کی دعوت دی نماز کے بعد تقریر کرنے کھڑا ہوا اور کہا۔

"لوگو! تم میں جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے جو نہیں پہچانتا اسے میں پہچنواتا ہوں۔ میں علی بن اسمٰعیل بن اسحاق ہوں میں پہلے خلق قرآن کا قائل تھا۔ نیز یہ کہ اللہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ برے کام کرنے والا خود میں ہوں۔ اب میں ان ساری باتوں سے جواب تک کہتا رہا ہوں توبہ کرتا ہوں۔ میں معتزلہ کا جواب دینے کو تیار ہوں اور انکے عیوب ظاہر کر کے رہوں گا میں طولانی مدت تک تم لوگوں سے غائب رہا میں نے معتزلہ و محدثین دونوں کے ادلہ کو جانچا پرکھا دونوں کی دلیلیں میرے نزدیک ایک جیسی ہیں کسی کی دلیل دوسرے کی دلیل سے قابل ترجیح نظر نہ آتی میں نے خداوند عالم سے ہدایت چاہی خداوند عالم نے میری رہبری ان باتوں کے اعتقاد کی طرف کی جنکو میں نے اپنی ان کتابوں میں لکھ دیا ہے اور اب تک میں جن باتوں کا معتقد چلا آرہا تھا ان سب کو الگ کیے لیتا ہوں جس طرح یہ کپڑے الگ کر رہا ہوں ......"

پھر اس نے اپنا لباس اتار پھینکا اور لوگوں کو وہ کتابیں دکھلائیں جو اس مدت میں وہ لکھتا رہا تھا اس نے ابانہ نام کی ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے اپنے مذہب کی وضاحت کی تھی اسی موضوع پر دو کتابیں موجز اور مقالات نام کی بھی اس نے لکھی تھی۔

اس نے اس موقع پر اپنی جن کتابوں کی نمائش کی تھی اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارا دین و مذہب جس کے

ہم پابند ہیں کتاب و سنت اور وہ تمام باتیں ہیں جو صحابہ و تابعین اور ائمہ حدیث سے مروی ہیں۔ اسی سلسلہ میں لکھا تھا ہم ان سب چیزوں سے تمسک کرتے ہیں اور پیرو ہیں اُن باتوں کے جن پر امام احمد بن حنبل کاربند تھا خدا اُن کے چہرے کو شاداب ان کے درجہ کو بلند اور اُن کے اجر کو عظیم و وافر کرے اور ہم ہر اس شخص سے کنارہ کش ہیں جو امام احمد کے قول کی مخالفت کرے اس لئے کہ امام احمد وہ امام فاضل رئیس کامل تھے جن کے ذریعہ خدا اور عالم نے حق کو واضح کیا جبکہ باطل کا ظہور تھا اور سیدھے راستہ کی وضاحت کی صاحبان بدعت کی بدعتوں کجرووں کی کجروی اور شک کرنے والوں کے شکوک زائل کئے۔

(مذاہب اسلامیہ ابی زہرہ ص۲۲۶، مقدمۂ کتاب مقالات الاسلامیین ص۲۴)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اشعری ایک مُدت تک گھر میں گوشہ نشین رہ کر باہر جو نکلا تو محدثین کا پرجوش حامی و مددگار بن کر نکلا خصوصیت کے ساتھ امام احمد کا جو معتزلہ کے سخت ترین دشمن تھے۔

لیکن انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ اسکے باوجود اس نے اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی امام احمد بن حنبل کے پیروں کی طرف سے بڑے آلام و مصائب جھیلے حنبلیوں نے اشعری، اس کے پیروں اور اس کے افکار و نظریات کے مؤیدین کے ساتھ انتہائی دشمنی کا برتاؤ کیا یہاں تک انھیں نفرت و عداوت ہو گئی تھی کہ انھوں نے خطیب بغدادی کو جس کا انتقال ۴۶۳ھ میں ہوا تھا بغداد کی مسجد جامع میں گھسنے نہیں دیا کیونکہ وہ بھی اشعری خیالات کا حامل تھا ایسا ہی سلوک انھوں نے اس دور کے تمام اکابر اشاعرہ سے کیا اور انھیں اپنے شہروں سے نکال باہر کیا۔

حنبلیوں اور اشاعرہ کے درمیان بغداد کی گلی کوچوں اور شاہ راہوں پر گھمسان کی لڑائی ہوئی سارا غصہ اشاعرہ کے ایک بزرگ قشیری پر تھا جس کی وجہ سے مجبوراً اُسے بغداد کو خیرباد کہہ کر ہجرت کرنا پڑی لوگ ابوالحسن اشعری پر لعنتیں برسا رہے تھے اور اُس کی طرف شرمناک اقوال منسوب کر رہے تھے تاکہ رائے عامہ اشعریوں کے خلاف ہو جائے، اسی سلسلہ میں یہ قول بھی اس اشعری کی طرف منسوب کیا گیا کہ رسول اللہ صرف اپنی زندگی تک نبی رہے آپکے انتقال کے بعد آپ کی نبوت بھی ختم ہو گئی تھی۔ (مذاہب اسلامیہ ابی زہرہ ص۲۶۶ و ص۲۶۷۔ مقدمۂ کتاب مقالات الاسلامیین بقلم محمد محی الدین، عبد الحمید ص۲۲، الحضارۃ الاسلامیہ فی القرن الرابع جلد اول ص۲۶۰)

بعض مؤلفین اور ارباب قلم نے اشاعرہ اور محدثین حنابلہ کی اس سخت و شدید جنگ کی توجیہ یہ کی ہے کہ اشعری نے اگرچہ شروع شروع مذہب حنابلہ کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرمیاں دکھلائیں اور امام احمد کے افکار و نظریات کی بڑے شدومد سے تائید کی جو حنبلیوں کے امام اول تھے اُس نے بغداد کے منبروں پر اُن کی حمایت میں لمبی چوڑی تقریریں بھی کیں لیکن چونکہ وہ طولانی مدت تک معتزلہ کی درسگاہ سے وابستہ رہا اُن کے نظریات و افکار اُس کے دل و دماغ میں رچ بس گئے تھے، ۴۰ برس سے زیادہ کی مدت تک وہ اُن کا پیرو رہ چکا تھا تو

ان سب باتوں نے اسکے خیالات پر بڑا گہرا اثر کیا وہ معتزلہ کے افکار سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی بحثوں میں نہ صرف حدیث کی اطاعت کی، نہ تنہا عقل کی بلکہ دونوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس کا اندازہ اختلافی مسائل میں اُس کے نظریات وخیالات سے ہوجاتا ہے مثلاً افعال انسان کے متعلق معتزلہ کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے افعال کا خود موجد ہے۔ محدثین کا دعوی یہ تھا کہ افعال اللہ کی مخلوق ہیں بندہ کا اسمیں کوئی اختیار نہیں۔ اشعری نے کہا کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہے یعنی ایمان ہو یا کفر طاعت ہو یا معصیت یہ سب خدائے تعالیٰ کا پیدا اور ایجاد کیا ہوا ہے۔ بندے کو انکے پیدا کرنے کی قدرت نہیں، البتہ کسب وعمل اسکا بندے سے ہوتا ہے کہ اسی اپنے کسب وعمل کی بدولت جزا وسزا پاتا ہے۔

اسی طرح دیدار خداوندی کا مسئلہ ہے۔ محدثین۔ حشویہ مشبہہ وغیرہ نصوص کے ظاہری الفاظ کے پابند ہیں جیر سہی تاویل یا اُن میں کسی قسم کا تصرف کیئے وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ دیدار کے قابل ہے۔ اور معتزلہ نے نصوص کے ظاہری الفاظ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی بلکہ اُن کی تاویل کی۔ اشعری اگرچہ دیدار الٰہی کا قائل تھا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا تھا کہ خداوند عالم قابل دید تو ہے مگر چیزوں کی طرح نہیں جو سمت ومکان کی محتاج ہوتی ہیں۔

اسی طرح اکثر مسائل میں اشعری نے عقل ونقل میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ نتائج کے لحاظ سے وہ محدثین ہی سے جا کر مل جاتا تھا مگر چونکہ نتائج تک پہونچنے میں اُس نے عقل پر اعتماد کیا اس لیئے محدثین اس سے راضی نہیں ہوئے اور انہی محدثین اور خصوصیت کے ساتھ حنابلہ نے مخالفت اور اُس پر سخت وشدید حملے کیئے انھوں نے اپنی جگہ طے کر لیا کہ اشعری معتزلہ کے مذہب سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا اور نظریہ اعتزال اُس کے انداز فکر پر اب بھی چھایا ہوا ہے اسی وجہ مذہب اشعری کو محدثین سے اتنی سخت مقاومت کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ معتزلہ کی مخالفت میں وہ انھیں کے دوش بدوش تھا اور اس بیچوں بیچ کے رویہ کیوجہ سے معتزلیوں کے عتاب کا بھی نشانہ بنا اور محدثین کے عتاب کا بھی لیکن ان سب کے باوجود اس کا مذہب پھیل کر رہا حکام کی پشت پناہی حاصل ہوجانے کے بعد تو اسکے مذہب کی اور بھی ہمہ گیر اشاعت ہوئی۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ حکومت نے بیچ میں دخل اندازی کی اور شاہی دبدبہ اور اقتدار سے کام لے کر رعایا کو اشعری مسلک کا پابند بنایا۔ خلیفہ قادر عباسی نے ایک فرمان جاری کیا جسمیں معتزلہ کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم نے اپنے مذہب کی باتیں لوگوں کو سکھائیں پڑھائیں یا کسی سے مذہبی مناظرہ کیا تو تمھیں سخت ترین سزائیں دی جائینگی علماء نے اس قادر کو امام اہل سنت والجماعت کا لقب دیا کیونکہ

اصول اسلامیہ کی حفاظت کی ذمہ داری اُس نے خود لے لی اور اکثر باتوں میں محدثین و فقہاء کے خیالات سے تجاوز نہیں کیا۔

اشعری نے لوگوں میں ایک بیان جاری کیا جس میں اُس نے اپنے عقائد کی پوری طرح وضاحت کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ کن چیزوں کا ایمان واعتقاد واجب ولازم ہے، اس بیان میں اُس نے کہا تھا

"میں خدا اور رسولؐ اور ثقہ لوگوں نے جن چیزوں کی روایت کی ہے سب کا اقرار کرتا ہوں۔ نیز یہ کہ خداوند عالم واحد و یکتا ہے اُس نے اپنے لئے نہ کوئی بیوی اختیار کی نہ اولاد۔ پیغمبر خدا جن باتوں کو لے کر آئے تھے کتاب خدا نے جن باتوں کو بتایا جیسے قیامت کا قائم ہونا، جنّت و جہنم کا وجود حشر و نشر، اور یہ کہ اللہ اپنے عرش پر متمکن ہے اُسکے چہرہ بھی ہے ہاتھ بھی آنکھیں بھی کان بھی نگاہ بھی۔ نیز یہ کہ اس کا کلام غیر مخلوق ہے اور کوئی شخص کوئی کام اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک خدا نہ کرے بندوں کے سارے اعمال اللہ کے پیدا کردہ اور اُس کے بس کے ہیں خداوند عالم اگر بندوں کو نیکوکار بنائے تو وہ نیکوکار ہوں گے اور اگر وہی ہدایت کرے تو لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے۔ ہر شے قضا و قدر الٰہی کے لحاظ سے ایک حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ شر ہو یا خیر اور جو شخص کہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے۔ خداوند عالم بروز قیامت اسی طرح دیکھا جائے گا جس طرح چودھویں شب میں چاند دیکھا جاتا ہے صرف مومنین ہی دیکھ پائیں گے کافر نہیں دیکھ سکیں گے۔ ایمان قول وعمل کا نام ہے اسمیں کمی بھی ممکن ہے زیادتی بھی۔ امامت بعد رسولؐ اس ترتیب کے مطابق ہے جس ترتیب سے ظہور میں آئی۔ (مواقف جلد ص۲۰۰، ملل ونحل، التبصیر فی الدین ص۱۳۵، مذاہب اسلامیہ ص۱۷۱ و ۱۷۲)

غرضکہ ابوالحسن اشعری نے نیا اسلوب اختیار کیا جس میں عقل و حدیث دونوں کو ایک جگہ لانے کی کوشش کی۔ بعد کے آنے والوں نے اُس کے اس اسلوب کو دل سے پسند کیا۔ فقہاء کی ایک جماعت نے بھی اُسکے مذہب اور طریقہ کو اپنایا کیونکہ اس نے اسلاف محدثین کے نظریات کی مخالفت نہیں کی اور نہ اپنے لیئے کوئی ایسا مذہب اختیار کیا تھا جو پہلے زمانہ کے لوگوں کے مذہب کے مخالف ہوتا۔ اب جس نے بھی اس کا مسلک اختیار کیا اور اُسکے طریقہ کی پیروی کی وہ اشعری قرار پایا یہاں تک کہا گیا ہے کہ اسی اشعری کے عقیدہ پر شافعی، مالکی، حنبلی اور احناف متفق ہیں۔

(تمہید لتاریخ الفلسفہ، مصطفےٰ عبدالرزاق ص۲۹۲)

وہ مشاہیر فقہاء و متکلمین جنھوں نے اشعری کی پیروی اور اُس کے نظریات کی جی جان سے حمایت کی ان میں ایک ابوبکر محمد بن طیب باقلانی ہیں ابن عماد حنبلی شذرات الذہب میں لکھتے ہیں۔

"یہ ابوبکر اصول میں اشعری مسلک کا تھا اور چوتھی صدی میں دین کا مجدد۔ اُس نے گمراہ فرقوں کی رد میں کتاب لکھی بڑا متقی و پرہیزگار تھا اس میں کوئی عیب نہیں پایا گیا نہ اُس کی کسی لغزش کا کسی کو علم ہو سکا وہ کلام مجید کی اُن آیات کے ذریعہ جس میں خدا کے ہاتھ اور چہرے

کا ذکر ہے ثابت کیا کرتا کہ اللہ کے ہاتھ بھی ہے اور چہرہ بھی، وہ ایک طرف اُن آیات پر زور دیتا جن میں اللہ کے لیے اعضاء و جوارح کا ذکر ہے دوسری طرف اس بات پر زور دیتا کہ اللہ کے چہرے اور ہاتھ کا مخلوقات کے اعضاء و جوارح جیسا ہونا ضروری نہیں۔ اس کا نظریہ تھا کہ خداوند عالم اپنے عرش پر متمکن ہے، وہ ان لوگوں کی تردید کرتا جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا ہر جگہ ہے اسکی دلیل تھی کہ اگر خدا ہر مکان میں ہو تو لازم آئے گا کہ انسان کے پیٹ میں بھی ہو منھ میں بھی ہو اور انسان کے ہر عضو میں ہو۔ اور بڑی جگہ میں ہونے کی صورت میں بڑا ہو اور چھوٹی جگہ ہونے کی صورت میں چھوٹا ہو" (شذرات الذہب ص۱۶۹ و ۱۷۰)

دوسرے بڑے عالم و فقیہ جو اشعری مسلک کے زبردست حامی ہوئے امام الحرمین عبد الملک بن عبد اللہ جوینی شافعی فقیہ ہیں جن کا لقب ضیاء الدین تھا اصول عقائد میں یہ اشعری نظریہ رکھتے تھے اور عقل و نقل پر اعتماد کرنے میں اشعری مسلک کے پابند تھے اُن کے رسالہ نظامیہ میں یہ فقرہ درج ہے کہ:۔

"بعض لوگ کلام مجید کی آیات میں تاویل کے قائل ہیں اور ائمہ سلف تاویل سے باز رہتے۔ الفاظ کو انکے ظاہری معنوں پر محمول کرتے اور ان کا مفہوم و معنی اللہ کے حوالے کرنے کے قائل تھے۔ بزرگان سلف کی اطاعت و پیروی ہی ہمارا دین و ایمان ہے اس لیے کہ ان کا اجماع حجت ہے اور اسی پر شریعت کا انحصار ہے۔......

اسی سلسلہ میں مزید لکھتے ہیں:۔

"ہر دیندار کا فریضہ ہے کہ خداوند عالم کے صفات مخلوقین سے پاک و صاف ہونے کا اعتقاد رکھے اور پیچیدہ باتوں کی تاویل میں غور و خوض نہ کرے اس کا مفہوم و معنی اللہ پر چھوڑ دے"

ابن عماد حنبلی ان کی مدح و ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ مختلف علوم کے عالم اور مشاہیر علماء سے تھے جملہ مذاہب کی واقفیت اور مناظرہ میں درجۂ کمال پر پہنچے ہوئے تھے اپنے باپ کے مرنے کے بعد درس و تدریس کے سربراہ ہوئے اور اشاعرہ و معتزلہ کی جنگ چھڑنے کے فوراً بعد ہجرت کر کے بغداد چلے گئے اور وہاں درس و تدریس کے سربراہ ہوئے اور ۴۷۸ھ ہجری میں انتقال کیا۔

علامہ محمد ابو زہرہ نے انھیں علماء میں جنھوں نے اشاعرہ کی دل و جان سے پیروی کی بیضاوی کا نام بھی لیا ہے جن کا انتقال ۶۸۵ھ ہجری میں ہوا

مصطفیٰ عبد الرزاق نے ابو بکر محمد بن حسن بن فورک، شیخ ابراہیم بن محمد بن مہران اسفرائنی۔ ابو الفتح شہرستانی۔ فخر الدین بن الحسین رازی وغیرہ کے نام گنائے ہیں نیز یہ کہ ایوبی سلاطین ہی نے تمام مذہب اشاعرہ کی مصر اور دیگر بلاد اسلامی میں اشاعت کی۔ (تمہید لتاریخ الفلسفہ ص۱۹۲)

طبقات الاشاعرہ کے مؤلف نے اپنی کتاب طبقات میں ایک بڑی تعداد اُن علماء کی درج کی ہے جنھوں نے معتزلہ کے مقابلہ میں محدثین کی مدد کی۔ ہمیں سب کے حالات ذکر کرنا مقصود نہیں، نہ یہی بیان کرنا مقصود ہے کہ شیعوں نے اشعری کی کس حد تک موافقت کی اور کس حد تک مخالفت۔ ہم نے تو یہ کتاب صرف شیعی نظریات اور غیر شیعہ نظریات میں خواہ وہ معتزلہ ہوں یا اشاعرہ موازنہ کرنے کے لئے لکھی ہے۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں اپنے زمانہ کے مصنفین اور ارباب قلم بھی اور بعد کے آنے والے بھی نیز مستشرقین یورپ بھی اکثر اوقات شیعوں کو معتزلہ سے گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شیعوں کا انداز فکر معتزلہ کی خوشہ چینی ہے انھیں معتزلہ سے اُنھوں نے یہ فلسفیانہ نظریات لئے اور اُنھیں ترقی دی اور اس کی دلیل عدل و توحید کے وہ مباحث ہیں جو شیعوں کی کلامی کتابوں میں مذکور ہیں۔ نیز اس کا ثبوت شیعوں کا یہ قول ہے کہ اصل حجت قول معصوم ہے اور یہی تمام باتیں معتزلہ پہلے کہہ چکے ہیں خصوصاً نظام معتزلی۔

(الحضارۃ الاسلامیہ جلد ۱ ص ۱۲۸)

اُستاد عبد الرحمان شرقاوی نے تو مبالغہ کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا ہے کہ:۔

"شیعوں نے معتزلہ کے بہت سے افکار کی خوشہ چینی کی، بلکہ شیعوں کے بہت سے ارباب فکر معتزلہ میں شامل ہوئے چنانچہ جناب زید۔ شیعوں کے فرقہ زیدیہ کے امام۔ واصل بن عطا معتزلہ کے امام کے درس میں شریک ہوئے اور اُس سے بہت کچھ استفادہ کیا۔"

یہ ساری باتیں شیعی فکر کو معتزلہ کی فکر سے مرتبط قرار دینے اور اُسی سے متولد قرار دینے کے لئے کہی گئی ہیں مگر یہ تمام باتیں انتہائی غلط ہیں اس کی تردید اسی سے ہو جاتی ہے کہ واصل بن عطا جو فرقہ معتزلہ کا باوا آدم ہے جس نے بنیاد رکھی تھی فرقۂ اعتزال کی اُس سے بہت پہلے متعدد شیعہ علماء و ماہرین و استادان علم کلام گذر چکے ہیں۔ جیسے ماصر جو متکلمین شیعہ میں بہت ہی نامور شخصیت کے بزرگ ہیں۔ امام زین العابدینؑ کے شاگرد تھے۔

یہ امر بھی مسلم الثبوت ہے کہ واصل بن عطا فرقۂ معتزلہ کا بانی حضرت محمد ابن حنفیہ کے فرزند ابو ہاشم کا شاگرد رہ چکا تھا۔ بلکہ زیدی شیعہ بھی مسلک اعتزال میں محمد حنفیہ کے واسطہ سے اپنا مرجع حضرت علیؑ کو قرار دیتے ہیں وہ یوں کہ واصل شاگرد تھا ابو ہاشم کا اور ابو ہاشم شاگرد تھے اپنے باپ محمد بن حنفیہ کے اور محمد بن حنفیہ نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے پدر بزرگوار علی ابن ابی طالبؑ سے

شیعہ اہلبیت کی تعلیمات سے مالا مال تھے جن کی قوت وہ چند ہو چکی تھی۔ ائمہ اہل بیتؑ خصوصاً امام جعفر صادقؑ اپنے اصحاب میں کلامی مسائل کی تحریک کیا کرتے فکر و نظر کی دعوت دیتے آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا تھا کہ ہشام سے بحث و مباحثہ کرو اور ان کی باتیں غور سے سنو۔

اس کا بھی پتہ لگتا ہے کہ خود متکلمین شیعہ کے آپس میں مناظرے کی نشستیں منعقد ہوا کرتیں اسکی واضح

شامل وہ مناظرہ ہے جو ہشام بن حکم اور زرارہ بن اعین میں ہوئیز وہ مناظرہ جو ہشام بن حکم اور ہشام بن سالم جوالیقی میں ہوا یہ سب امام جعفر صادق ع کے تلامذہ اور منطق و فلسفہ کے مشہور ماہرین اور استادان فن تھے۔

لطف یہ ہے کہ جن شیعہ علماء کا نام لے کر کہا جاتا ہے کہ یہ معتزلہ کے خوشہ چیں تھے اور انھوں نے فلسفیانہ نظریات و خیالات معتزلہ سے سیکھے اُن میں کئی ایک ایسے ہیں جو تیسری صدی ہجری میں گذرے جو ائمہ اہل بیتؑ سے قریب ترین زمانہ تھا اور امیں اور اُن لوگوں میں جنھوں نے ائمہ اہل بیتؑ سے بلا واسطہ روایتیں لیں زیادہ سے زیادہ دو راویوں کا توسط رہا انھوں نے اپنے گرانقدر مصنفات اپنی تقریروں اپنے مناظروں سے دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ مذہب امامیہ خود ایک مستقل مذہب ہے اور اس کا سرچشمہ ائمہ اہل بیتؑ کی تعلیمات و ارشادات ہیں اور یہ مذہب کسی حال میں بھی کسی دوسرے مذہب کا تابع نہیں رہا۔ بلکہ بیشمار شواہد اس کے موجود ہیں کہ خود دوسروں نے ائمہ اہل بیت سے استفادے کیے اور اُن کے تعلیمات و ارشادات پر تکیہ کیا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ فرقہ شیعہ ہی وہ سب سے پہلا فرقہ ہے جسکی تاریخ اسلام تاریخ سے وابستہ ہو اور اس فرقہ کا وجود ان اسلامی مذاہب کی پیدائش سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ہے۔ شیعوں نے اسلامی عقائد مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ توحید و صفات خداوندی قضا و قدر اور اُن تمام مسائل پہ - - - جن کا تعلق اسلامی اصول سے ہے وہ بہت پہلے ہی بحث کر چکے تھے جبکہ ابھی مذہب اعتزال نے دنیا میں جنم بھی نہیں لیا تھا اور نہ کسی دوسرے ہی کو ان مسائل پر لب کشائی کی ہمت ہوئی تھی۔ ہم عنقریب شیعوں کے نظریات و افکار اُن مسائل کے متعلق ذکر کریں گے جو معتزلہ اور محدثین و اشاعرہ کے درمیان موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔ شیعوں کے انھیں نظریات و افکار سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ کسی موقع اور کسی مرحلہ پر بھی کسی فرقہ کے خوشہ چیں نہیں رہے۔ نہ انھوں نے ائمہ طاہرین ع کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی کبھی پیروی کی نہ اصول میں نہ فروع میں۔ سب سے بڑا ثبوت اسکا یہ ہے کہ بعض نظریات میں وہ فرقہ مرجئہ والوں سے بالکل اسی طرح متفق ہیں جس طرح دوسرے بعض نظریات میں اشاعرہ و معتزلہ سے ہیں اور بعض مسائل میں وہ سب سے الگ ہیں نہ ان کے ہمنوا نہ اُن کے ہمنوا بلکہ خود اپنی مستقل رائے رکھتے ہیں۔

اسی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خود اُن کا اپنا مستقل انداز فکر تھا کسی دوسرے کی تقلید انھوں نے نہیں کی۔ جیسا کہ دیگر مذاہب کا حال ہے کہ ہر مذہب والے بعض مسائل میں دوسرے مذہب والوں سے متفق ہیں اور بعض میں خود اپنے مستقل نظریہ کے حامل۔

مختصر یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان عقائد کی جنگ دوسری صدی ہجری میں سخت و شدید ہوئی۔ یہ جنگ تین فرقوں کی مجموعی جنگ تھی، مرجئہ۔ معتزلہ اور اشاعرہ۔ رہ گئے شیعہ امامیہ تو اُن کی تاریخ اسلام کی تاریخ سے وابستہ ہے اور جس دن سے پیغمبر اسلام نے اعلان رسالت کیا اسی دن آپ نے شیعیت کی تخم ریزی

کی تھی اور یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ عقائدی جنگ اور جولانی فکر میں بہ نسبت دیگر اسلامی فرقوں کے شیعہ سب سے نمایاں اور ممتاز رہے اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ انھیں فکری زندگی کے تجربات کا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ موقع ملا تھا وہ ہمیشہ سخت و شدید حملوں کا نشانہ بنے رہے اُنھیں ہمیشہ نیست و نابود کر دینے کی کوششیں ہوتی رہیں ہر ممکن تدبیریں اُنھیں فنا کر دینے کے لیئے اختیار کی گئیں اور انھیں باتوں نے انھیں ہمت دلائی کہ وہ ان چو طرفی حملوں کے مقابلہ میں پوری طرح ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں۔

مزید برآں ائمہ اہل بیتؑ نے تاریخ کے ہر دور میں ان فکری انقلابات کا ساتھ دیا اور بلاشبہ مسلمانوں کی ہر جماعت کے مقابلہ میں اُنھیں کو اس بات کی فکر رہی کہ اسلام کی قداست اور سربلندی پر آنچ نہ آئے اُن کے حلقہ ہائے درس میں ہر وقت بحث و مباحثہ کرنے والوں اور طالبانِ علم کا اژدحام رہا کرتا اور وہی اس بات کے سب سے زیادہ کوشاں ہے کہ دشمنانِ اسلام کی دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک اور معاندین اسلام کی معاندانہ حرکتیں ناکام ہیں نیز یہ کہ معتزلہ کے انحرافات اور فقہا و محدثین کے جمود سے مسلمانوں کے دل و دماغ متاثر نہ ہوں۔

بہر حال انھیں معتزلہ مرجئہ اور اشاعرہ وغیرہ کے نظریات و عقائد آگے چل کر مذاہب اہل سنت قرار پائے اگرچہ اہل سنت کی اکثریت اشعری رہی جب سے کہ عباسی حکومت نے شاہی دبدبہ و اقتدار سے کام لے کر تمام مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہی عقائد رکھیں جو اشعری کے ہیں اور مسلک اعتزال پر پابندی لگا دی گئی ان کی درسگاہیں اُن کے مناظرے اُن کی نشستیں بند کر دی گئیں اور مسلمانوں کی اکثریت اشعری بن گئی کوئی نہ بچا سوا حشویہ کے جو قائل تھے کہ خدا گوشت پوست والا ہے اُس کے اعضا و جوارح ہیں اس سے مصافحہ و معانقہ تک کیا جا سکتا ہے۔ غرضکہ اُنھوں نے خدا کے لیئے ہر وہ بات ثابت کی جو عام مسلمانوں کے لیئے جائز ہے بعض لوگ تو اتنا حد سے گذر گئے کہ اُن کا کہنا تھا کی شرمگاہ اور ڈاڑھی کے متعلق مجھے معاف کر دو باقی جس عضو کے متعلق پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ (مواقف جلد ۸ صفحہ ۲۹۹)

چوتھی صدی ہجری میں فقہا و محدثین کی ایک جماعت ظہور میں آئی جو سلفیین کہے جاتے تھے یہ نام اُنھوں نے خود رکھا تھا اُن کا دعویٰ تھا کہ ہم اگلے زمانہ کے فقہا و محدثین کے خیالات و نظریات کو زندہ کرنے کے لیئے آئے۔ اُنھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ہم امام احمد بن حنبل شیخ الحنابلہ کے مذہب کو عملی جامہ پہنائینگے ان فقہا و محدثین نے اشعری اور اشعری کے پیروؤں کو جی کھول کر بُرا بھلا کہا اُن کی تنقیص کی حالانکہ اشعری احمد بن حنبل کے نظریات و افکار کے سب سے بڑے مؤید تھے۔

ان فقہا و محدثین کا مسلک یہ تھا کہ عقائد کتاب و سنت ہی سے معلوم کیئے جا سکتے ہیں عقل کو آیات کی تاویل اور تفسیر میں کوئی گنجائش نہیں چاہئے آیتیں احکام عقل کے منافی ہی کیوں نہ ہوں ان فقہا و محدثین کی جماعتوں نے اشعری کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر سخت و شدید جنگ چھیڑ دی جس میں کسی نرمی کی گنجائش

نہیں تھی مگر لطف یہ ہے کہ نتائج کے اعتبار سے دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

دونوں ہی قرآن کے ظاہری الفاظ کے پابند ہیں اور ظاہری الفاظ کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے بلکہ ظاہری لفظوں سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے اس کو اختیار کرتے ہیں لیکن اشعری نے قرآن کے ظاہری لفظوں اور احکام عقل میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جیسا کہ مسئلہ جبر و اختیار دیدار الٰہی۔ اور صفات خداوندی وغیرہ جیسے مسائل میں اُن کا رویہ رہا جن میں معتزلہ اور فقہا و محدثین کے درمیان شدید اختلافات تھے۔

رہ گئے سلفیین اور فرقہ حشویہ والے ان کا دعویٰ تھا کہ عقل کو ان میدانوں میں تگ و تاز کی کوئی گنجائش نہیں اسے کتاب و سنت کی ہر بات پر ایمان لانا اور تصدیق کرنا ہی پڑے گی۔

مگر شیعہ امامیہ جب سے کہ ان کی نشو و نما ہوئی اپنے انداز فکر۔ استنباط نتائج۔ اور اصول و فروع سے متعلق اپنے نظریات و افکار میں مستقل اور دوسروں سے قطعی بے نیاز رہے۔

پانچویں فصل

مذاہب و معتقدات

معتزلہ کے پانچ اصول

اعتزال پانچ ارکان کا مجموعہ ہے :-

توحید - عدل - وعد و وعید - منزلۃ بین المنزلتین - امر بالمعروف ونہی عن المنکر -

ہر وہ شخص جو ان پانچوں اصول کا ایمان رکھے وہ معتزلی ہے چاہے اور دوسری باتوں میں کتنا ہی مخالف ہو اور جو شخص ان پانچ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ مانے گا وہ معتزلی نہ ہوگا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ علاّمہ لاہجی نے مواقف میں نیز سیّد شریف اور اسفرائنی وغیرہم نے معتزلہ کے ۲۰ فرقے گنائے ہیں یہ بیسوں فرقے بہت سے افکار و نظریات میں ایک دوسرے سے کافی اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ اختلافات ان پر معتزلہ کی لفظ صادق آنے سے مانع نہیں کیونکہ پانچوں بنیادی باتوں میں متفق ہیں۔

توحید۔ سب سے پہلا رکن ہے معتزلہ کے نزدیک بھی اور دیگر مسلمانوں کے نزدیک بھی بغیر توحید کا اقرار کیے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا چاہے وہ بقیہ سارے اصول و فروع اسلامیہ کا قائل ہی کیوں نہ ہو اشعری کی مقالات الاسلامیین میں ہے کہ توحید کے معنی معتزلہ کے نزدیک یہ ہے کہ :-

خداوند عالم واحد و یکتا ہے اُسکے جیسی کوئی چیز نہیں وہ سننے والا دیکھنے والا ہے نہ جسم ہے نہ پیکر ہے نہ جثہ ہے نہ صورت ہے اُسکے لئے رنگ مزا، بو نہیں نہ اُس میں حرارت و برودت رطوبت اور یبوست ہے نہ اُسکے لئے گہرائی ہے نہ اکٹھا ہونا نہ جدا ہونا نہ وہ متحرک ہے نہ ساکن نہ حصّوں کا مجموعہ ہے نہ اجزا رکھتا ہے نہ اُسکے لئے اعضاء و جوارح ہیں۔ اس پر زمانہ کا اجرا نہیں کیا جا سکتا

نہ اُسے یکسوئی ہے نہ وہ کسی جگہ حلول کئے ہوئے ہے نہ وہ خلائق کی کسی صفت سے متصف کیا جا سکتا ہے۔ اندازے اُس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ پردے اسکو چھپا نہیں سکتے وہ کسی طرح بھی مخلوقات سے مشابہ نہیں وہ شئے ہے مگر دوسری اشیاء کی طرح نہیں۔ عالم ہے قادر ہے حی ہے لیکن اس کا علم و قدرت و حیات ہم لوگوں جیسی نہیں۔
اسی طرح کے اور کئی صفات ثبوتیہ و سلبیہ خداوعالم کے معتزلہ نے گنائے ہیں۔
(مقالات الاسلامیین ص۲۱۶)

ٹھیک انھیں معنوں میں شیعہ امامیہ بھی توحید کے قائل ہیں اور اس منزل پر وہ معتزلہ سے بالکل متحد ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ معتزلہ کے خوشہ چیں اور اُن کے عیال ہیں اس لیئے کہ فرقہ معتزلہ کی بنیاد اگرچہ بنی امیہ ہی کے زمانہ میں پڑ چکی تھی مگر اس کا ظہور عباسی عہد حکومت میں ہوا جبکہ شیعوں کے امام اوّل علیؑ ابن ابی طالبؑ مسئلہ توحید کو معتزلہ سے پچاس ساٹھ برس پہلے ٹھیک انھیں معنوں میں بیان کر چکے تھے۔ اُن کے بعد اُن کے فرزندوں نے جو انھیں کی آغوش میں پلے بڑھے اور اسی مودتی سرچشمۂ فیضان الٰہی سے سیراب ہوئے تھے اپنے شیعوں اور اپنے پیروں کو اسی توحید کی تعلیم دی۔

اور اگر عقیدہ و نظریات میں اتحاد و یکرنگی تقلید و پیروی کا ثبوت ہے جیسا کہ اسلامی مؤرخین اور مستشرقین اس پر زور دیا کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ جو بعد میں آئے گا وہ مقلد اور پیرو ہوگا نہ کہ وہ جس کا وجود پہلے سے ہوگا

اگر آپ حضرت امیرالمومنینؑ اور اُن کی اولاد میں جو ائمہ معصومینؑ ہوئے کے اقوال وارشادات کا جائزہ لیجیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان حضرات نے توحید کی حقیقت ٹھیک وہی بیان کی ہے جو بقول مؤرخین معتزلہ نے بیان کی ہے کوئی فرق نہیں صرف بعض نقاط کا فرق ہے جس کو ہم آگے چلکر بیان کریں گے۔

علامہ صدوق رح نے اپنی کتاب التوحید میں عبداللہ الریّان سے اس نے امام رضاؑ سے اور آپ نے اپنے آبائے طاہرینؑ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے مسجد کوفہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"تمام ستائشیں بس اسی خدا کے لئے ہیں جو کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا اور نہ کسی چیز سے پیدا کیا ان چیزوں کو جو موجود ہیں (کیونکہ مادہ جس کو تمام چیزوں کی جڑ سمجھا جاتا ہو یہ خود بلا مادہ پیدا کیا گیا ہے اس کا خود کوئی مادہ نہیں ورنہ مادّہ کے لئے مادہ کا ہونا لازم آئے گا اور تسلسل قائم ہو جائے گا جو محال ہے) اشیاء کے حدوث کو اپنی ازلیت کا گواہ قرار دیا اور اُن کی عاجزی کو اپنی قدرت کا گواہ اور اُن کے ضروری فنا ہونے کو اپنے دوام کا گواہ۔ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں تاکہ مکانیت سے اس کا ادراک ہو سکے اور نہ اسکی صورت و شبیہ ہے جس کی وجہ سے کسی کیفیت سے اسکا وصف کیا جا سکے اور نہ کسی چیز سے غائب ہے کہ حیثیت (کہاں ہے) سے اس کا علم حاصل کیا جائے۔ مثلاً یہ کہیں کہ اس میں خدا نہیں ہے تو کہاں ہے؟ فلاں جگہ

ہے۔ یہ بات خدائے تعالیٰ کی نسبت نہیں کہی جا سکتی کیونکہ وہ جگہ اور مکان سے مستغنی ہے (جتنی چیزوں کو اُس نے پیدا کیا ہے ان سب سے صفات میں مبائن و مغائر ہے (کسی مخلوق میں اسکی صفت نہیں) ذوات اشیاء کے تغیرات کو از سرنو پیدا کرنے کی وجہ سے اس کا ادراک محال ہے (کیونکہ ہم دنیا کی جتنی چیزیں دیکھتے ہیں سب کو متغیر پاتے ہیں اور وہی تغیر ان اشیاء کی معرفت کا ذریعہ ہے پس پروردگار کی کنہہ حقیقت کا ادراک کیونکر ہو سکتا ہے جس میں نہ تغیر ہے اور نہ تبدل) اسکی عظمت کو مکانات احاطہ نہیں کر سکتے یکتا ہے مگر عددی یکتا نہیں۔ ہمیشہ رہنے والا ہے مگر کسی حد تک نہیں ہے۔ قائم ہے مگر کسی سہارے سے نہیں وہ کوئی جنس نہیں جسکی ہمسر درجنسیں ہو سکیں وہ صورت و تصویر نہیں کہ اور صورتیں اس کے برابر ہو سکیں وہ مثل اور اشیا کے نہیں کہ اس پر صفات واقع ہو سکیں (یعنی اسکی صفتیں بیان ہو سکیں......"

توحید صدوق صـ۲۵ پر حضرت کا یہ پورا خطبہ شرح و بسط سے مذکور ہے۔)

علامہ صدوق اپنی کتاب التوحید میں لکھتے ہیں کہ:۔

ایک بدو عرب نے بصرہ میں امیرالمومنین سے حقیقت توحید کے متعلق سوال کیا آپ نے فرمایا۔

" دیکھو یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے اسکی چار صورتیں ہو سکتی ہیں دو صورتیں تو ناجائز اور دو صورتیں ثابت ہیں اگر کوئی اعداد و شمار کے لحاظ سے کہے اللہ ایک ہے تو یہ جائز نہیں اس لئے کہ جسکے دوسرے کا وجود ہی نہ ہو اس کو اعداد و شمار کے باب میں داخل کرنا کیونکر ممکن ہوگا اسی لیئے وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے اور اگر کوئی اللہ ایک ہے کہہ کر نوعیت مراد لے یعنی اللہ ایک قسم کی چیز ہے تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ یہ تشبیہ ہے بزرگ و برتر ہے خداوند عالم اس سے دو صورتیں جو جائز ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا ایک یعنی یکتا ہے کوئی چیز اُس کے مشابہ نہیں دوسرا یہ کہ خدا احد المعنی ہے اسکے مفہوم و معنی میں یکتائی داخل ہے اسکی تقسیم نہ وجود میں ممکن نہ عقل میں نہ وہم میں۔ ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے۔"

حقیقت توحید کی اس مختصر تعریف میں امیرالمومنین نے وہ تمام باتیں جمع کر دی ہیں جو معتزلہ نے توحید ذات کے مفہوم و معنی میں ذکر کی ہیں اسلیئے کہ وہ ہستی جسکی تمام اشیا میں کوئی شبیہ نہیں یقیناً جسم نہ ہوگی نہ صفات اجسام سے اُسے متصف کرنا صحیح ہوگا نہ کسی بھی چیز سے اسکی حد بندی کی جا سکے گی نہ اس کے حصے ہوں گے نہ اجزا ہوں گے نہ اُس پر زمانہ جاری ہوگا نہ اُسے حواس احاطہ کر سکیں گے۔ نیز اور دوسرے اوصاف جو معتزلہ نے حقیقت توحید کے بیان میں ذکر کئے ہیں۔ اسی طرح وہ ہستی جب ہر طرح ناقابل تقسیم ہے نہ وجود میں اسکی تقسیم ممکن ہے نہ عقل میں نہ وہم میں وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز سے بھی مشابہ نہیں ہو سکتی نہ یہی ممکن ہے کہ وہ اعراض و حوادث کا محل ہو اس لیئے کہ کسی چیز کا منقسم ہونا چاہے ذہنی طور پر کیوں نہ ہو اجزا اور عوارض کے اعتبار ہی سے ممکن ہے اور جب اس کا منقسم ہونا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو تو لازمی ہے کہ وہ تمام حالات و کیفیات سے مجرد ہو۔

توحید کے متعلق امیر المومنینؑ کے یہ فقرے بھی مروی ہیں کہ:۔

"خداوند عالم کوئی پیکر نہیں کہ دیکھا جا سکے نہ جسم ہے کہ اُس کا تجزیہ ممکن ہو نہ اُس کی انتہا ہے کہ وہ اختتام پذیر ہو نہ پیدا شدہ ہے کہ دیکھا جا سکے نہ ڈھکا چھپا ہے کہ منظر عام پر لایا جا سکے اُس نے جناب موسیٰ سے بغیر اعضاء و جوارح اور سامان تکلم کے کلام کیا۔ اب جس شخص نے بھی یہ گمان کیا کہ معبود خلائق محدود ہے وہ خالق معبود سے جاہل رہا۔

فتح بن یزید جرجانی نے امام رضاؑ سے سوال کیا کہ خداوند عالم اس چیز کے متعلق جو عالم وجود میں آئی ہی نہیں یہ جانتا ہے کہ اگر وہ ہوتی تو کیسی ہوتی؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے کلام مجید میں یہ آیات نہیں پڑھیں لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اگر خدا کے علاوہ اس زمین و آسمان میں کوئی دوسرا خدا ہوتا تو زمین و آسمان دونوں غارت ہو جاتے۔ ولعلا بعضھم علی بعض۔ بعض بعض پر غالب ہوتا۔ نیز خداوند عالم نے اہل جہنم کا قول نقل کیا ہے ارجعنا نعمل صالحا غیر الذی کنا نعمل۔ ہمیں پھر دنیا میں پلٹا دے تاکہ ہم اب تک جو کچھ رہے ہیں اُس کے برعکس عمل صالح کریں۔ نیز ارشاد ہوا۔ لو ردو لعادوا لما نھوا عنہ۔ اگر انھیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جاتا تو پھر وہی کرتے جس سے انھیں روکا گیا۔

خداوند عالم نے ان آیات میں اپنے لئے ثابت کیا ہے کہ وہ اس چیز کو بھی جو وجود میں آئی ہی نہیں جانتا ہے کہ اگر وجود میں آ گئی تو کیسی ہوگی۔ (توحید صدوق ص۳۳)

امام رضاؑ نے ان آیات کا حوالہ دیکر جو ثابت کرتی ہیں کہ خداوند عالم ان چیزوں کا بھی عالم ہے جو وجود میں آئی ہی نہیں ان لوگوں کی زباں بندی کی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ خداوند عالم کا علم شئے معدوم سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ اس زمانہ کے کسی بہت بڑے[۱] معتزلی کا قول ہے

علامہ صدوق رح نے اپنی کتاب توحید الائمہ میں اور بھی کئی ایک حدیثیں مفہوم توحید کی تشریح میں ائمہ طاہرینؑ سے روایت کی ہیں یہ سب حدیثیں خداوند عالم کی تنزیہ و تقدیس اور مشبہہ اور محدثین اہل سنت نے جو باتیں خداوند عالم کی طرف منسوب کر ڈالی ہیں اُن سے ذات باری کے پاک و پاکیزہ ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

اسی طرح جناب سید رضی رح نے بھی نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کے بہت سے خطبے اور کلمات معانی توحید کے متعلق درج فرمائے ہیں اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سب سے پہلے امیر المومنینؑ ہی نے مسلمانوں کو موضوعات توحید کی طرف راہ دکھائی معتزلہ کے وجود میں آنے سے مدتوں پہلے۔

---

[۱] یہ قول جہم بن صفوان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس نے قدر کے متعلق سب سے پہلے کلام کیا تھا نیز ہشام بن محمد فوطی کی طرف بھی اسکی نسبت دی جاتی ہے جو امام رضاؑ کے زمانہ کا ایک مشہور معتزلی تھا۔

اشاعرہ جو محدثین و فقہا اور عامۂ اہل سنت کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں اُن کے نزدیک توحید کیا ہو؛ اسے آپ اشاعرہ کے امام اول ابو الحسن اشعری کی کتاب مقالات الاسلامیین میں ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں:-

" خداوند عالم واحد یکتا ہے اُس نے اپنے لئے کوئی زوجہ قرار دی نہ فرزند وہ اپنے عرش پر ہے جیسا کہ آیت الرحمان علی العرش استوی بتاتی ہے۔ اس کے لیئے دو ہاتھ ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کیسے۔ ہاتھوں کے ہونے کا ثبوت کلام مجید کی ان آیتوں سے ملتا ہے۔ خلقت بیدی میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ بل یداہ مبسوطتان۔ اللہ کے دونوں ہاتھ کھُلے ہوئے ہیں اسیطرح خداوند عالم کے لئے دو آنکھیں بھی ہیں کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے تجری باعیننا اس کے لئے چہرہ بھی ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ نیز یہ کہ اسماء خدا کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ غیر خدا ہیں جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کہتے ہیں۔ خدا کو علم بھی حاصل ہے ارشاد ہوتا ہے انزلہ بعلمہ نیز ارشاد ہوتا ہے وما تحمل من انثی ولا تضع الا بعلمہ اسی طرح خدا قوت والا بھی ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے اولم یروا ان اللہ خلقھم ھو اشد منھم قوۃ۔ کیا انھیں یہ پتہ نہیں کہ خداوند عالم نے انھیں خلق کیا اور اُن سے زیادہ قوت و طاقت کا مالک ہے۔

اسی سلسلہ میں اشاعرہ ایسکے بھی قائل ہیں کہ بندوں کے سارے گناہوں کا خالق بھی اللہ ہی ہے سارے اعمال اسی کے مخلوق ہیں بندہ کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں۔ خداوند عالم کافروں کے ساتھ بھلائی کرنے اور ان کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آنے پر قادر ہے تاکہ وہ مومن ہو جائیں مگر خداوند عالم نے یہی چاہا کہ اُن کے ساتھ بھلائی نہ کرے نہ لطف و مہربانی کرے اور یہی چاہا کہ وہ کافر ہوں۔ خداوند عالم بروز قیامت نگاہوں سے دیکھا جائے گا جس طرح چودھویں کے شب میں چاند دیکھا جاتا ہے۔ مومنین ہی اُسے دیکھ پائینگے کافر نہیں دیکھ سکیں گے وہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے گا۔ خداوند عالم آسمان دنیا پر اُترتا ہے اور فرماتا ہے۔ "ہے کوئی استغفار کرنے والا۔"

(مقالات الاسلامیین ابو الحسن الاشعری ص۳۲۰ تا ۳۲۳)

اسفرائنی نے اپنی کتاب تبصیر میں اہل سنت والجماعت کے جو معتقدات درج کیئے ہیں وہ بھی قریب قریب یہی ہیں۔ اشاعرہ دیگر اسلامی مذاہب کی طرح خداوند عالم کے لئے بعض صفات ثابت کرتے ہیں اور بعض کی نفی لیکن خداوند عالم ان صفات سے کس طرح متصف ہے اس میں اشاعرہ نے دیگر اسلامی مذاہب سے اختلاف کیا ہے اور اگرچہ وہ جسمیت مکان اور حلول کی خداوند عالم سے نفی کرتے ہیں پھر بھی خداوند عالم کے لئے ایسی باتیں ثابت کرتے ہیں جو ان تینوں چیزوں سے کسی صورت جدا نہیں ہو سکتیں۔

اشاعرہ اور محدثین کے عقائد جو ہم نے اوپر بیان کیئے ان کی بنا پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ حقیقت توحید کے متعلق اُن کے خیالات امامیہ اور معتزلہ کے خیالات سے جداگانہ ہیں۔

معتزلہ اشاعرہ اور امامیہ یہ تینوں فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خداوند عالم کے بعض صفات ذاتی ہیں جیسے علم و قدرت، حیات و ارادہ اس کا سمیع و بصیر ہونا اور بعض اضافی ہیں جیسے رازق۔ خالق مالک اور ممیت ہونا ان صفات کی نسبت خداوند عالم کی طرف مخلوق و مملوک کے اعتبار سے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ صفات حادث ہیں اور ان کی نسبت خداوند عالم کی طرف ان چیزوں کے وجود کے بعد ہی ممکن ہو سکی جب کسی چیز کو خلق کر لیا تب خالق ہوا جب کسی چیز کو موت دیدی تب ممیت ہوا جب کسی کو رزق عنایت کیا تب رازق ہوا۔

صفات ذاتیہ کے متعلق اشاعرہ اور اُن کے ساتھ بعض معتزلہ بھی قائل ہیں کہ یہ قدیم اور زائد بر ذات ہیں خداوند عالم عالم ہے علم کی وجہ سے قادر ہے قدرت کی وجہ سے اسی طرح اور دیگر صفات۔

فرقۂ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ صفات خداوند عالم کی ذات سے الگ نہیں ورنہ تعدد قدما یا صفات ذاتیہ کا حادث ہونا لازم آئے گا۔

متکلمین نے صفات خداوندی کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے ایک صفات ثبوتیہ دوسرے صفات سلبیہ سلبیہ کا مطلب ہے، خداوند عالم سے اُن صفات کی نفی کرنا جو اس کی ذات کے لائق نہیں۔ جیسے اس کا جسم ہونا یا جوہر و عرض ہونا۔

ثبوتیہ وہ ہیں جو اسکی ذات کے لائق ہیں جیسے علم و قدرت، سمیع و بصیر نیز اور دوسرے صفات جو متکلمین اور اسلامی فلاسفہ نے ذات باری کے لیئے ثابت کیئے ہیں۔

امامیہ اور معتزلہ دونوں متفقہ طور پر اسکے قائل ہیں کہ خداوند عالم جسم نہیں اسلیئے کہ اگر وہ جسم ہوگا تو محتاج مکان ہوگا اور اگر محتاج مکان ہوگا تو جوہر ہوگا اور اگر جوہر ہوگا تو یا تو بالکل ہی ناقابل تقسیم ہوگا یا قابل تقسیم اور دونوں چیزیں اسکے لیئے جائز نہیں خداوند عالم کا ایسا جوہر ہونا جو ناقابل تقسیم ہو اسلیئے محال ہے کہ وہ جوہر جو قابل تقسیم نہیں وہ جزء لایتجزی (یعنی ذرہ ناقابل تقسیم) ہی ہو سکتا ہے اور ذرہ ناقابل تقسیم تمام چیزوں سے حقیر اور کمترین چیز ہے اور خداوند عالم کی شان اس سے کہیں بلند و برتر ہے۔

رہ گیا اس کا ایسا جوہر ہونا جو قابل تقسیم ہو وہ اس لیئے اللہ تعالیٰ کے لیئے محال ہے کہ اگر وہ قابل تقسیم ہوگا تو یقیناً جسم مرکب ہوگا اور مرکب ہونا اسکے وجوب ذاتی کے منافی ہے اس میں اور کسی نے مخالفت نہیں کی سوا فرقہ مشبہہ کے یعنی حنابلہ اور کرامیہ کے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم مکان اور جگہ رکھتا ہے اور یہ جگہ بلندی کی سمت ہے۔

اشعری کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے (مقالات

الاسلامیین ص ۲۲۲)
بہر حال فرقہ مشبہہ (جسمیں حنابلہ بھی داخل ہیں اور بہت سے محدثین بھی) اس بات کے مدعی ہیں کہ خداوند عالم بھی دیگر اجسام کی طرح جگہ رکھتا ہے اور اسکی طرف اشارہ کرنا صحیح ہے اُسکی جگہ عرش اعلیٰ ہے اور اسکے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا جائز ہے۔ عرش خدا اُسکے بوجھ سے اُسی طرح چرچراتا ہے جسطرح پالان شتر سواریوں کے بوجھ سے۔ خداوند عالم کا جسم عرش کے چاروں طرف چار چار انگل باہر نکلا ہوا ہے اس فرقے والے اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ مومنین مخلصین بروز آخرت خداوند عالم سے معانقہ کرینگے۔
محدثین میں سے بعض حشویہ اس بات کے معتقد ہیں کہ خداوند عالم گوشت پوست سے بنا ہوا جسم ہے دوسرے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک درخشندہ و تابندہ نور ہے اُس کی لمبائی اسکی بالشت سے سات بالشت ہے۔
کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم ایک بوڑھا گھنے بالوں اور گھنی ڈاڑھی والا ہے وغیرہ وغیرہ۔
اسی طرح کی اور بہت سی باتیں کہی گئی ہیں جو نہ عقل کی میزان پر صحیح ہیں نہ منطق کی میزان پر نہ کتاب وسنت ہی سے اُنکا ثبوت ملتا ہے قرآن مجید میں کچھ آیتیں ضرور ایسی ہیں جنکے ظاہری الفاظ سے دھوکا ہوتا ہے کہ خداوند عالم بھی بقیہ اجسام کی طرح ایک جسم ہے لیکن بیشمار دوسری آیتیں بکثرت حدیثیں اور خود ان ہی آیتوں میں جن سے خدا کے جسمانی ہونے کا وہم ہوتا ہے ایسے بہت سے قرائن موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ ظاہری لفظوں سے جو معنی سمجھ میں آتے ہیں وہ معنی ہرگز مراد نہیں۔
بعض لوگوں نے قرآن کی آیت فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر کی تفسیر میں کہا ہے کہ میں خدا کیساتھ اسکے تخت پر بیٹھوں گا۔
معاذ عنبری جو اہل سنت کے فرقہ حشویہ کا ایک عالم تھا اس بات کا مدعی تھا کہ خداوند عالم انسان کی صورت پر ہے اُس کے لیے ہر وہ چیز ہے جو انسان کے لیے ہے یہاں تک کہ اُسکے شرمگاہ بھی ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خداوند عالم ہنستا بھی ہے یہاں تک کہ اُس کے دانت نکل آتے ہیں اُسکے پیروں میں سونے کی جوتیاں ہیں ایک سرسبز و شاداب باغ میں ہے جس کو ملائکہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ملائکہ خداوند عالم کے ہاتھ کے روئیں سے پیدا ہوئے۔
داؤد ظاہری اس بات کے قائل تھے کہ خداوند عالم کی آنکھیں ایک مرتبہ دکھنے آئیں اور ملائکہ نے اللہ کی مزاج پرسی کی۔ خداوند عالم ہر سال شعبان کی ۱۵ تاریخ کو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ بروز قیامت لوگ اُس کو اس وقت تک نہ پہچانینگے جبتک خداوند عالم اپنی پنڈلی کھولکر اپنی خاص پہچان اُن پر نہ ظاہر کرے جیسے ہی وہ پنڈلی کھولے گا لوگ اُسکے سجدے میں گر پڑیں گے۔
یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ بروز قیامت فاطمہؑ دختر رسولؐ اپنے فرزند حسینؑ کی قمیص لے کر یزید کے

خلاف خداوند عالم سے فریاد کرنے کے لئے آئیں گی کیونکہ یزید حسینؑ کو قتل کیا اور اُنکی عورتوں اور بچوں کو اسیر بنایا ان کو دیکھتے ہی خدا یزید کو بلا کر کہے گا کہ میرے تخت کے پاؤں کی آڑ میں چھپ جاؤ تاکہ فاطمہؑ تمھیں دیکھنے نہ پائیں یزید چھپ جائے گا پھر فاطمہؑ آکر فریاد اور گریہ وزاری کریں گی خداوند عالم اپنا پیر فاطمہؑ کو دکھائے گا جس میں نمرود کے تیر کا زخم ہوگا خداوند عالم فرمائے کہ میرا یہ پیر دیکھو جس پر نمرود نے تیر مارا تھا مگر میں نے اُسے معاف کر دیا ہے

شرح نہج البلاغہ میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ علمائے اہلسنت نے روایت کی ہے اور یہ روایت صحاح میں موجود ہے کہ حضرت آدم اللہ کی صورت پر پیدا ہوئے اور آتش جہنم جب بھڑکے گی تو اس کا جوش اور ہیجان اس وقت ختم ہوگا جب خداوند عالم اپنا پیر اس میں ڈال دے گا۔

امام ابو حنیفہ کے اولیں استاد بن ابی سلمہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتے خداوند عالم عرفہ کی شب آسمان سے زمین پر اُترتا ہے سُرخ رنگ کے اونٹ پر سونے کے ہودج میں۔

(مواقف جلد ۸ ص۲۶ شرح نہج البلاغہ جلد ا ص۲۹۴ و ص۲۹۵)

اہل سنت میں جتنے بھی فرقے آیات قرآنی کے ظاہری الفاظ کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں جیسے حنابلہ وغیرہ وہ تجسیم کے قائل ہونے پر مجبور ہیں ۔اشاعرہ بھی اگرچہ آیت کے ظاہری لفظوں کی بغیر کسی تصرف کے پابندی ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے وہ قائل ہیں کہ خدا کے لئے چہرہ آنکھیں اور ہاتھ ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم کے یہ اوصاف قائم بذاتہ ہیں۔

حضرت امیرالمومنین مشبہہ اور مجسمہ لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"وہ جھوٹے ہیں وہ لوگ جو تیرا ہمسر دوسرے کو قرار دیتے ہیں تجھے اپنے بتوں کے مشابہ بتلاتے اور اپنے اوہام کے مطابق تجھے مخلوقین کا جامہ پہناتے ہیں اور اپنی طبیعت کے مطابق تیرا تجزیہ کرتے ہیں جس طرح جسموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ جس شخص نے تجھے تیری مخلوقات میں سے

---

۵۷ فرقہ اہل حدیث کے پیشوائے اعظم مولوی وحید الزماں خاں صاحب حیدرآبادی لکھتے ہیں فیکشف عن ساقہ پروردگار اپنی پنڈلی کھول دے گا اپنے بندوں کو قدم بوسی کا شرف عنایت فرمائے گا اس کو دیکھ کر تمام مومنین سجدے میں گر پڑینگے۔ یہ حدیث احادیث صفات میں سے اور اہل حدیث ایسی حدیثوں کے ظاہری معنی پر ایمان رکھ کر اس حقیقت اور کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں یعنی اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منھ ہے ہاتھ ہے آنکھیں ہیں پنڈلی ہے مگر یہ چیز مخلوقات کے منھ اور ہاتھ اور آنکھ اور پنڈلی سے مشابہت نہیں رکھتے جیسے اُس کی ذات مقدس مخلوق کی ذات سے مشابہت نہیں رکھتی۔

(انوار اللغۃ پارہ ۱۲۹ ص۱۲)

کسی چیز کے برابر قرار دیا اُس نے تیرا ہمسر ٹھہرایا اور جس نے تیرا ہمسر ٹھہرایا اُس نے تیری محکم آیات اور تیری واضح و روشن دلائل و براہین کا انکار کیا"۔

فرق و مذاہب کے متعلق کتابیں لکھنے والوں نے مشہور شیعہ متکلم ہشام بن حکم کی طرف عقیدہ تجسیم کی بڑی شدت سے نسبت دی ہے اور بہت سی باتیں اُن کی طرف ایسی منسوب کی ہیں جو اصول اسلام کے بھی منافی ہیں اور عقل سلیم کے بھی پھر ہشام کی سیرت اُن کی غیر معمولی صلاحیت و استعداد اور اہل بیت طاہرین سے وابستگی سے کبھی میل نہیں کھاتیں۔

اسفرائنی نے اپنی کتاب تبصیر میں اُن پر یہ تہمت دھری ہے کہ وہ اپنے معبود کا قیاس لوگوں پر کرتے اور کہتے کہ خدا اپنی بالشت سے سات بالشت کا ہے۔ وہ ایک چمکتا ہوا نور ہے۔ ابوالہذیل جو فرقہ معتزلہ کا بہت بڑا علامہ گذرا ہے اُس نے ایک مرتبہ ہشام سے پوچھا تمہارا خدا بڑا ہے یا کوہ ابو قبیس ہشام نے کہا ہمارا اللہ کیونکہ وہ پہاڑ پر چڑھ سکتا ہے۔ ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب مقالات الاسلامیین میں لکھا ہے کہ:۔

ہشام کہا کرتے خدا و ند عالم ایک جسم ہے اور اسکا جسم محدود بھی ہے طویل و عریض و عمیق بھی اتنا ہی لمبا ہے جتنا چوڑا اور اتنا ہی گہرا ہے جتنا لمبا وہ رنگ و بو اور مزا بھی رکھتا ہے اسکو چھوا بھی جاسکتا ہے۔

اسی طرح کی اور بہت سی مہملات اور مضحکہ انگیز باتیں اسلامی مصنفین نے ہشام کی طرف منسوب کی ہیں۔ معتزلہ نے تو انھیں اسلام سے خارج ہی قرار دیدیا ہے۔ جبائی نے اُن پر سخت و شدید حملے کیے ہیں کسی شاعر نے اُن کے متعلق یہ شعر بھی کہا ہے

ما بال من ينتحل الاسلاما ۔ متخذ اماما هشاما

جس نے اپنا امام ہشام بنا رکھا ہے وہ کیوں کر اسلام کا دعوے کر سکتا ہے۔

(التبصیر فی الدین صفحہ ۔ مقالات الاسلامیین جلد ا ص ۲۵۷)

ان سخت و شدید حملوں سے جو ہشام کے دشمنوں نے اُن پر کیے ہیں جس میں معتزلہ اور محدثین اور فقہاء اہل سنت برابر کے حصہ دار ہیں یہ بات پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ صرف ہشام کو بدنام اور اُنکی عظمت و جلالت اُن شہرت و نیکنامی کو داغدار بنانے کی کوششیں تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہشام معتزلہ اور محدثین دونوں ہی کو زچ کیا کرتے تھے دونوں ہی سے اُن کے بحث و مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے اور ہر معرکہ میں انھیں کو شاذ و نادر فتح نصیب ہوتی اور اُن کے دشمن شرمناک حد تک ہزیمت یاب ہوتے ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا کہ معتزلہ یا محدثین بحث و مباحثہ میں اُن سے جیت سکے ہوں جیسا کہ اُن کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ہشام کا ایک فقرہ بھی ایسا ڈھونڈھے سے نہیں مل سکتا جس سے یہ پتہ چل سکے کہ وہ تقوادہ

تجسیم کے قائل تھے لے دے کے اُن کا ایک فقرہ ملتا ہے اور اسی فقرہ پر اُن دشمن بڑا زور دیتے ہیں کہ

ان الله جسم لا کالاجسام — خداوند عالم جسم ہے مگر دوسرے جسموں کی طرح نہیں

مگر ہشام نے یہ فقرہ معتزلہ کے قول کے جواب میں کہا تھا کہ :-

ان الله شیء لا کالاشیاء — خداوند عالم ایک چیز ہو مگر دوسری چیزوں کی طرح نہیں

ہشام کی بحث یہ تھی کہ جب تم خدا کے متعلق یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ ایک چیز ہے مگر دوسری چیزوں جیسا نہیں، تو پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ ایک جسم ہے مگر دوسرے جسموں جیسا نہیں' اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ واقعاً خداوند عالم کے جسم ہونے کے قائل تھے اور یہی اُن کا دین و مذہب تھا جیسا کہ علماء اہل سنت اُن پر تہمت دھرتے ہیں۔ ان کے اس فقرہ میں جو انھوں نے مخالف کو زچ کرنے کے لئے کہا تھا کوئی بات بھی ایسی نہیں جس سے اُن کا کفر یا الحاد ثابت ہو سکے جیسا کہ نظام اور جبائی نے کوشش کی ہے نہ انھوں نے کوئی فقرہ ہی ایسا کہا جس میں خدا کو سات بالشت کا قرار دیا ہو جیسا کہ جاحظ اور نظام نے اُن پر الزام لگایا ہے۔

یہ ہشام ائمہ اہل بیتؑ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے جو مجسمہ اور مشبہہ کے سخت ترین مخالف تھے انھیں ائمہ طاہرینؑ سے گہری وابستگی تھی بڑے بڑے شیوخ اصحاب ائمہ اہل بیتؑ انھیں مقدم سمجھا کرتے۔

امام جعفر صادقؑ نے ہشام کو ایک مرتبہ خطاب کر کے فرمایا:-

"ہشام! روح القدس کے ذریعہ تمھاری ہمیشہ تائید ہوتی رہے گی جب تک تم اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتے رہو گے"

امام جعفر صادقؑ کے نزدیک اُن کی بلندی منزلت اور عزت و احترام کا یہ عالم تھا کہ جب امام جعفر صادقؑ مقام منا میں تشریف فرما تھے یہ ہشام حاضر خدمت ہوئے اس وقت یہ کم سن تھے ڈاڑھی بھی نہ نکلی تھی امامؑ کی خدمت میں اکابر شیعہ جیسے حمران بن اعین۔ قیس ماصر۔ یونس بن یعقوب ابو جعفر احول وغیر کا مجمع تھا آپ نے ان سب پر ہشام کو فوقیت دی حالانکہ یہ سب کے سب سن میں ہشام سے بڑے تھے جب امام جعفر صادقؑ نے محسوس کیا کہ ہشام کی خاطر مدارات میرے ان اصحاب پر شاق گذری ہے تو آپ نے فرمایا:-

"یہ شخص اپنی زبان اپنے دل اور اپنے ہاتھوں سے ہمارا مددگار ہے"

(تنقیح المقال جلد ۳ ص ۲۹۴)

ایک مرتبہ آپ نے اُن کے متعلق فرمایا:-

"ہشام بن حکم ہمارے حق کے طلب گار، ہمارے قول کے ترجمان، ہماری سچائی کے مؤید اور

اور ہمارے دشمنوں کی ہرزہ کاریوں کو کچلنے والے ہیں جس شخص نے ہشام کی اطاعت اور اُن کی پیروی کی اُس نے ہماری پیروی کی اور جس نے اُن کی مخالفت کی اور اُن کے بارے میں انکار کیا اُس نے ہم سے دشمنی اور ہمارا انکار کیا۔ (شافی ص۱۲)

اسی قسم کی اور بہت سی حدیثیں اور ارشادات معصومین ع ہیں ان کی فضیلت اور سلامتی عقیدہ کے متعلق ان روایات سے صریحی طور پر ثابت ہوتا ہو کہ ائمہ اہل بیت کے بنیادی عقائد کے حامل اور اُن کے افکار و نظریات اُن کا قول و عمل سبھی اہل بیت کی تعلیمات کے مطابق تھا۔

کسکی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کہاں تو ائمہ اہلبیت ع ہشام کو اتنی عزت بخشتے تھے اُنھیں ایسا لائق تعظیم و قابل احترام سمجھتے تھے کہاں ہشام کے ایسے نظریات و افکار ایسے عقائد جو سرسر فاسد اصول اسلام کے بھی منافی اور نصوص قرآن کے بھی مخالف دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ کہ ہشام کے جو نظریات بیان کیے جاتے ہیں جن عقائد کی نسبت اُنکی طرف دی جاتی ہے وہی نظریات و عقائد معاذ اللہ ائمہ اہلبیت ع کے بھی تھے یا یہ کہ یہ محض دشمنوں کی تہمت تراشیاں ہیں دشمنام نے محض ہشام کو بدنام کرنے کے لیئے یہ عقائد و افکار اُن کے سر منڈھ دیے ہیں۔

ہشام کے متعلق جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں اُنکی رکاکت اور مہمل و غلط ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ یہ سارے الزام ان لوگوں نے لگائے ہیں جو شیعوں کے دشمن تھے اور ہشام سے تو انھیں خصوصی دشمنی تھی محض اس وجہ سے کہ ہشام ان دشمنان اہلبیت ع نیز دوسرے ملحدین اور اہل بدعت کی ایک نہیں چلنے دیتے تھے اُنھوں نے مسئلہ امامت اور دیگر اسلامی اصول کے متعلق عمرو بن عبید معتزلی۔ نظام معتزلی وغیرہ سے بارہا ٹکرلی اور ہر معرکہ میں انھیں شاندار فتح اور اُنکے مخالفین کو شرمناک شکستیں نصیب ہوائیں۔

چنانچہ کشی رح نے اپنے رجال میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ :-

نظام معتزلی اس بات کا قائل تھا اہل جنت ہمیشہ جنت میں نہیں رہیں گے اس کا کہنا تھا کہ بقاء ابدی صرف اللہ ہی کے لیئے ہے اس مسئلہ پر نظام اور ہشام بن حکم میں زبردست بحث ہوئی۔

ہشام نے کہا بے شک، اہل جنت کو بقا اور ابدی زندگی حاصل ہوگی اور وہ خدا کے مثل بھی نہیں ہوں گے نہ ابدیت اور ہمیشگی میں خدا کے شریک ہوں گے کیونکہ اہل جنت کو جو بقا حاصل ہوگی وہ ایک ایسی ذات کی عنایت و کرم سے جو اس پر قادر ہے کہ جس کو چاہے بقا عطا کرے اور ہمیشہ زندہ رکھے برخلاف خدا کے کہ اسکی بقا کسی دوسرے کی محتاج نہیں بلکہ وہ خود باقی ہے لہذا خدا کی بقا اور اہل جنت کی بقا میں فرق ہوا اور جب فرق ہوا تو اہل جنت کا باقی رہنا محال بھی نہیں ہوگا۔ کیا خدا کی قدرت سے باہر کہ وہ اہل جنت کو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رکھے ؟

اس جواب سے عاجز ہو کر نظام نے دوسرا پہلو اختیار کیا اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے کہا:
یقیناً محال ہے کہ اہل جنت جنت میں ہمیشہ رہیں اور اُن کو بقا حاصل ہو۔ ہشام نے پوچھا اچھا ہمیشہ نہیں رہینگے تو پھر کیا ہو جائیں گے۔؟ نظام نے کہا کچھ زمانہ کے بعد بے ہوش اور بے حس ہو جائیں گے اُن کو جمود عارض ہو جائے گا۔ ہشام نے کہا تم نے قرآن مجید میں تو اس مضمون کی آیتیں پڑھی ہوں گی جن میں مذکور ہے کہ انسان کو وہاں جس امر کی خواہش ہوگی خدا عطا فرمائے گا چنانچہ ایک آیت میں ہے ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون یعنی جس چیز کو تمہارا دل چاہے گا بہشت میں تمہارے لیئے موجود رہے گی اور تم جو چیز وہاں طلب کروگے وہاں حاضر رہے گی۔ نظام نے کہا بے شک میں نے یہ آیتیں پڑھی ہیں۔ ہشام نے کہا پس اب بتاؤ کہ اگر اہل جنت وہاں بقائے ابدی اور حیات سرمدی کی خواہش کریں اور خدا سے اپنے جنت میں ہمیشہ رہنے کا سوال کریں تو خداوند عالم پر اس کے وعدے کے مطابق واجب ہے یا نہیں کہ اُنکی خواہش پوری کرے اور اُن کو بقائے ابدی عطا کرے؟ اور اگر کہتے ہو کہ واجب نہیں ہے تو خدا کاذب قرار پائے گا جو محال ہے۔

نظام نے کہا خداوند عالم اُن لوگوں کے دلوں میں بہشت میں رہنے کی خواہش پیدا ہی نہیں ہونے دیگا۔ ہشام نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ اگر اہل جنت پر بے ہوشی اور بے حسی کا طاری ہونا جائز فرض کر لیا جائے تو کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص جنت میں کسی درخت کے میوے کو دیکھے اور جب اس میوے کو توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھائے اور وہ درخت اور میوے جھک آئیں تاکہ اسکے ہاتھ تک پہونچ جائیں اور وہ اُن کو توڑ سکے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے پس وہ شخص ایک ہاتھ کو کسی میوہ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ کو درخت کے دوسرے میوے پر توڑنے کے لیئے رکھے اور ابھی توڑنے نہ پائے بلکہ دونوں ہاتھ سے دونوں پھلوں کو پکڑے ہو کہ اسی حالت میں اسکو بے ہوشی اور بے حسی طاری ہو جائے (کیونکہ بقول تمہارے ہمیشہ تو وہ جنت میں رہینگے نہیں اور بے ہوشی کے قبل خدا اُن کو کوئی اطلاع کبھی نہیں دے گا۔) اور دونوں شاخیں بلند ہو جائیں اور یہ شخص اسی حالت میں لٹک جائے پس کیا اہل جنت کا اس طرح سولی پانا تمہارے خیال میں جائز ہے؟ حالانکہ واضح ہے کہ جنت میں کسی کو سولی نہیں دی جائے گی اور تمہارے اعتقاد کی بنا پر سولی دیا جانا جائز ثابت ہوتا ہے کیونکہ جس وقت وہ لوگ بے ہونگے اُس وقت بھی جنت کے کسی نہ کسی عیش و راحت میں ضرور رہیں گے جس میں یہ صورت بھی داخل ہے جسے میں نے ذکر کیا پس ضروری کہ اُس سے سولی دیے جانے کا جائز ہونا بھی ثابت ہو۔

نظام نے لاجواب ہو کر کہا میں اس صورت ہی کو فرض نہیں کرتا بلکہ اس کا واقع ہونا محال ہے۔
ہشام نے کہا اگر بے ہوشی اور انجماد محال مذکور (یعنی لٹک جانے اور سولی پانے کو مستلزم ہے) تو پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ جو امر اس محال کو مستلزم ہے (یعنی بے ہوشی جو سولی پانے کو مستلزم ہے) وہ خود

ہی محال ہو اور اہل جنّت کو بے ہوشی نہ طاری ہو بلکہ اُن کو جنت میں ابدی زندگی عطا ہو جیسا کہ کلام مجید کی آیات کثیرہ سے ثابت ہے جیسے :۔ ھم فیھا خالدون ۔ وہ لوگ اس جنّت میں ہمیشہ رہینگے۔ کل فیھا خالدون ۔ لا یسمعون حسیسھا وھم فی ما اشتھت انفسھم خالدون ۔

کہیں ارشاد ہوتا ہے :۔ لھم فیھا ما یشاؤن خالدین

ان سب کا مطلب یہی ہے کہ جو بہشت میں داخل ہو جائے گا اس میں ہمیشہ رہے گا (کبھی اس میں سے نہ نکلے گا)

اس جواب سے عاجز ہو کر نظام خاموش ہو گیا۔

غرضکہ وہ سخت ترین خصومت و عداوت جو ہشام اور اُن کے مخالفین میں تھی خصوصیت کیساتھ وہ خصومت و نزاع جو ہشام اور معتزلہ کے بڑے بڑے پیشواؤں میں رہی جیسے عمرو بن عبید۔ نظام۔ جاحظ وغیرہ اسی خصومت و نزاع نے ہشام کے دشمنوں کو مجبور کیا کہ جہانتک ہو سکے ہشام پر تہمتیں دھریں انھیں بدنام کریں۔

اگر بفرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہشام تجسیم کے قائل تھے یا شروع شروع وہ دیصانی (شاگرد دیصانی کے پیرو) تھے پھر جہمی ہو گئے اور آخر میں امامی اور عقائد و نظریات امامیہ میں بڑے سخت اور پختہ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آخری مرحلہ پر پہنچکر جب وہ امامی ہو گئے تو عقیدہ تجسیم کو خیرباد کہہ دیا ہو جیسا کہ اُن کی سیرۃ اور آئمہ طاہرین کے اس برتاؤ سے ظاہر ہوتا ہے جو وہ ہشام کے ساتھ کرتے تھے

بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق نے انھیں اپنے یہاں آنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ تجسیم کے قائل تھے اور ہشام نے معذرت کی تھی کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم امام کے نظریہ سے تجاوز کر رہے ہیں لیکن اب یہ معلوم ہونے پر کہ امام اسکے مخالف ہیں خدا سے توبہ کرتے ہیں۔

یہ ساری باتیں فرضی ہیں اور روایت مذکورہ کی تائید ہشام بن حکم کی تاریخ اور ان کے حالات کی تحقیق سے نہیں ہوتی بے شمار شواہد تو یہ بتاتے ہیں کہ ہشام اپنی نشو و نما کے زمانہ ہی سے شیعہ تھے اور ساری زندگی وہ پختہ شیعہ اور ہر اس شخص کے سخت ترین دشمن رہے جس نے انھیں بدنام کرنے کی کوشش کی خواہ وہ کسی فرقہ کا بھی رہا ہو۔

عمرو بن عبید[1] سے بصرہ میں ان کا جو مناظرہ امامت کے مسئلہ پر ہوا تھا وہ اُن کے بالکل ہی آغاز شباب

---

[1] ہشام کے معاصرین میں عمرو بن عبید فرقہ معتزلہ کا ایک نامور علامہ گذرا ہے جس پر مولوی شبلی صاحب کی یہ عبارت شاہد ہے "اسی زمانہ میں دو شخصوں نے جو اتفاق سے ایک ہی سنہ یعنی ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس مذہب (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

میں ہو انھا جبکہ سبزہ بھی ابھی آغاز نہ ہوا تھا۔ سید مرتضیٰؒ شافی میں تحریر فرماتے ہیں امام جعفر صادق باوجود اُن کی کمسنی کے بڑھے بوڑھے اصحاب پر انھیں ترجیح دیتے۔ یہ ہشام باوجود اس کے کہ عنفوان شباب میں تھے تشیع اور اصول تشیع کی حمایت میں بڑے بڑے لوگوں سے ٹکر لیتے اور بڑے بڑے معرکے سر کیا کرتے۔ (شافی ص۱۲ و ص۱۳)

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہشام سوا شیعہ مذہب کے کسی اور مذہب پر رہے ہی نہیں نہ کسی اور مذہب کے اصول و فروع اختیار کئے ان کے متعلق یہ کہنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ دیصانی رہے پھر جہمی ہو گئے حالانکہ یہ عہد شباب ہی سے دشمنان تشیع کے سخت ترین دشمن رہے جبکہ انکے رخساروں پر سبزہ ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سن ہی ایسا نہیں تھا کہ ایک مذہب سے دوسرا مذہب اختیار کرتے پھریں یہ ساری تہمتیں معتزلہ نے ان پر لگائی ہیں جو انھیں اپنا سخت ترین اور ناقابل شکست دشمن جانتے تھے بعد کے آنے والوں نے بھی معتزلہ کی پیروی کی اور آج بھی ارباب قلم اور مصنفین ہشام پر نیز ہشام کے علاوہ دوسرے اکابر شیعہ پر اسی قسم کی تہمتیں دھرتے ہیں جس کسی کی شہرت بھی انھیں ناگوار گذرتی ہے اور جس کسی کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور پاتے ہیں۔

اسلامی فرقوں کی تاریخ میں مذکور ہے کہ اصل تشبیہ دو جماعتوں کی طرف راجع ہے ایک رافضی شیعہ دوسرے فرقہ حشویہ والے جو محدثین سے تعلق رکھتے ہیں رافضی شیعوں کے نمائندہ ہشام بن حکم تھے (تاریخ الفرق الاسلامیہ لعلی الغرابی)

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۸) اعتزال کو زیادہ رونق دی یعنی عمرو بن عبید اور واصل بن عطا۔۔۔ یہ دونوں اعتزال کے دست و بازو اور فضل و کمال کے چشم و چراغ تھے۔ عمرو بن عبید کمالات علمی کے علاوہ نہایت زاہد و عابد اور دنیا سے بے نیاز تھا۔۔۔ خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں اس کا آنا اور نہایت بے نیازی اور آزادی سے گفتگو کرنا نہایت دلچسپ واقعہ ہے جس کا تذکرہ تمام مورخین نے کیا ہے اس کے مرنے پر منصور نے خود مرثیہ لکھا اہل تاریخ کا بیان ہے کہ یہ شرف یعنی خلیفہ وقت کا مرثیہ لکھنا عمرو بن عبید کے سوا دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہوا (مقالات شبلی ص۴۶)

اس فاضل جلیل کے مقابلہ میں جناب ہشام کو کیا کمال حاصل تھا اسے خود ہشام کی زبانی سنئے۔ ہشام بیان کرتے ہیں کہ میں سنا کرتا تھا کہ عمرو بن عبید اس زمانہ کا نہایت مشہور عالم اور زبردست متکلم و مناظر ہے اور یہ کہ وہ بصرہ کی مسجد میں مسند دعوۃ و ارشاد پر بیٹھا ہوا مسئلہ امامت اور دوسرے مسائل اصول کلام میں گفتگو کرتا اور لوگوں کو حقیقت مذہب اہل سنت کی تعلیم دیتا رہتا ہے اس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ لہذا میں بصرہ روانہ ہوا اور جمعہ کا روز تھا کہ داخل بصرہ ہوا مسجد میں چلا گیا تو دیکھا کہ واقعی ایک انبوہ کثیر کا مجمع ہے جس کے درمیان عمرو بن عبید سیاہ صوف کا ایک شملہ پہنے ہوئے اور دوسرے شملہ کو ردا کی جگہ اوڑھے ہوئے بیٹھا ہے اور یہ سب لوگ حلقہ کئے ہوئے اس سے علمی مسائل دریافت (باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں کہ یہ فقرہ جو ہشام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہ جسم لا کالاجسام
خداوند عالم ایک جسم ہے مگر دوسرے اجسام جیسا نہیں اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ یہ ہشام ہی کا فقرہ
ہے تو اُنھوں نے معتزلہ کو عاجز اور زچ کرنے کے لئے بر سبیل مناظرہ اور بطور الزام کہا ہوگا اذا
قلتم ان القدیم تعالیٰ شی لا کالاشیاء فقولوا انہ جسم لا کالاجسام جب تم لوگ کہتے
ہو خداوند عالم ایک شے ہے مگر دوسری اشیا کے مثل نہیں تو پھر اس کا بھی اعتقاد کیوں نہیں رکھتے
کہ خدا ایک جسم ہے لیکن دوسرے جسموں کے جیسا نہیں یعنی جب تم لوگ خداوند عالم کی شیئیت
(چیز ہونے) کا اعتقاد رکھنے میں کوئی خرابی نہیں سمجھتے۔ تو جسمیت خدا کا اعتقاد رکھنے میں کیا
خرابی ہے لہذا اس کا بھی اعتقاد کیوں نہیں رکھتے؟

اور اس امر سے معمولی عقل والا شخص بھی واقف ہے کہ جو شخص اپنے مخالف سے بطور الزام و معارضہ
کوئی بات کہے یا اس پر کوئی اعتراض وارد کرے یا اس سے کسی امر کو دریافت کرے تو اس سے یہ لازم
نہیں آتا کہ وہ شخص اس قول یا اس سوال کا خود معتقد بھی ہے یا وہ اس کا دین و مسلک ہے۔

مگر ان سب کے باوجود دشمنان ہشام نے اُن پر یہ تہمت دھرنا اور ان مہمل و واہیات باتوں کی
نسبت اُن کی طرف دینا جائز سمجھا اور اشعری اور محدثین کے متعلق لب کشائی کی ضرورت نہیں سمجھی جو یہ
بانگ دہل خدا کی جسمانیت کے قائل ہیں۔

ابوالحسن اشعری معتقدات اہل سنت کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲) کہہ رہے ہیں یہ دیکھ کر میں بھی آخری صف میں دو زانو بیٹھ گیا پھر عمرو بن عبید کو خطاب کر کے کہا
"ایہا العالم! میں ایک مسافر شخص ہوں کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کروں۔؟
عمرو بن عبید: ہاں جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔
ہشام: پہلے مجھے اس سوال کا جواب عنایت ہو کہ آپ کی آنکھیں ہیں؟
عمرو بن عبید: صاحبزادے یہ بھی کوئی سوال ہے جو تم پوچھتے ہو؟
ہشام: جو کچھ بھی ہو میرا سوال تو یہی ہے اور اسی کا جواب آپ سے چاہتا ہوں
عمرو بن عبید: خیر تم کو اختیار ہے جو چاہے پوچھو اگرچہ تمھارا سوال احمقانہ ہی ہو۔
ہشام: میں تو دریافت کر چکا کہ کیا آپ کی آنکھیں ہیں اسی کا جواب عنایت کیجیے
عمرو بن عبید: ہاں آنکھیں ہیں
ہشام: وہ کس کام آتی ہیں؟
عمرو بن عبید: اس سے لوگوں کی صورت اور چیزوں کے رنگوں کو دیکھتا ہوں۔

(باقی صفحہ ۱۳۴ پر)

"خداوند عالم بروز قیامت آنکھوں سے دیکھا جائے گا جس طرح چودھویں کا چاند دیکھا جاتا ہے مومنین اُسے دیکھیں گے کافرین نہیں دیکھیں گے خداوند عالم آسمان دنیا پر اترتا ہو اور فرماتا ہے' ہے کوئی استغفار کرنے والا۔ خدا کے دو ہاتھ ہیں دو آنکھیں ہیں چہرہ ہے نیز دیگر اعضا ہیں۔"

یہ سب کچھ لکھ کر اشعری کہتے ہیں:

"ہم نے اہل سنت کے جو عقائد ذکر کئے وہی میرے بھی ہیں اور وہی میرا مذہب ہیں

(مقالات الاسلامیین جلد اول ص۳۲۰ تا ص۳۱۵ تبصیر فی الدین ص۱۳۸)

علامہ اسفرائنی نے بھی تبصیر میں یہی سب باتیں لکھی ہیں اور خداوند عالم کے دیدار پر دلیل پیش کی ہے کہ جس چیز کا دیکھنا ناممکن ہو اس چیز کا وجود ہی ثابت نہیں ہو گا۔

حنبلی حضرات نے تو اللہ تعالیٰ کو بالکل انسانوں جیسا قرار دے ڈالا ہے لیکن ان سب کے باوجود علی الغرابی وغیرہ کے نزدیک شیعہ ہی بس مشبہہ ہیں وہی مجسمہ ہیں اور جو لوگ قائل ہیں کہ خدا کے ہاتھ میں آنکھیں ہیں چہرہ ہے وہ آنکھوں سے دیکھا جائے گا وہ آسمان دنیا پر اُترتا ہے یہی لوگ غرابی اور مصنفین اہل سنت کے نزدیک حقیقی موحد ہیں سچ ہے

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۰)

ہشام: اور آپ کے ناک بھی ہے؟

عمرو بن عبید: ہاں ناک بھی ہے

ہشام: وہ کس کام آتی ہے؟

عمرو بن عبید: اس سے خوشبو دار چیزوں کی خوشبو اور بدبو دار چیزوں کی بدبو سونگھتا ہوں

ہشام: اور آپ کے زبان بھی ہے؟

عمرو بن عبید: ہاں زبان بھی ہے۔

ہشام: وہ کس کام آتی ہے؟

عمرو بن عبید: اس سے لوگوں سے باتیں کرتا ہوں۔ کھانے کا مزہ چکھتا ہوں

ہشام: اور آپ کے کان بھی ہیں؟

عمرو بن عبید: ہاں کان بھی ہیں

ہشام: وہ کس کام آتے ہیں؟

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

اور منجملہ صفات سلبیہ کے یہ ہے کہ خداوند عالم نہ جوہر ہے نہ عرض اس لئے کہ اگر جوہر ہوگا تو ضروری ہے کہ وہ جگہ گھیرے ہوئے ہو اور جو چیز جگہ گھیرے ہوئے ہوگی اس کا جسم ہونا اور محتاج غیر ہونا ضروری ہے اور اگر عرض ہوگا تو کسی ایسے محل کا محتاج ہوگا جہاں عارض ہو۔

نیز یہ کہ خداوند عالم زمانی نہیں بایں معنی کہ اس کا وجود زمانہ کا محتاج نہیں۔ اگر وہ زمانی ہوگا تو زمانہ کا قدیم ہونا نیز خدا کا اپنے غیر کا محتاج ہونا لازم آئے گا۔ جیسا کہ ہر زمانی اپنے غیر کا محتاج ہوتا ہے مزید برآں زمانہ متجدد ہے یعنی بدلتا رہتا ہے اور جو چیز متجدد میں حلول کئے ہو وہ خود بھی متجدد ہوگی اور یہ خداوند عالم کے لئے محال ہے۔

اسی طرح خداوند عالم اپنے غیر کے ساتھ متحد نہیں اسلئے کہ دو چیزوں کا ایک چیز ہو جانا ناممکن ہے۔ صوفیہ حضرات البتہ اس کے قائل ہیں اُن کا نظریہ ہے من تو شدم تو من شدی

نیز یہ کہ خداوند عالم کسی چیز میں حلول نہیں کئے ہوئے ہے اس لئے کہ حلول کرنے والا محل کا محتاج ہوتا ہے اور وہ ہر چیز جو دوسرے کی محتاج ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے۔

یہ قول بھی صوفیہ حضرات کی طرف منسوب ہے ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم ابدان عارفین میں حلول کئے ہوتا ہے اور جب انسان معرفت کے بلند ترین درجہ پر پہونچ جاتا ہے وہ خدا سے جاکر مل جاتا ہے وہ اور خدا ایک ہو جاتے ہیں اور اس سے ساری تکالیف ساقط ہو جاتی ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱)

عمرو بن عبید: اس سے آوازوں کو سنتا ہوں

ہشام: اور آپ کے دل بھی ہے

عمرو بن عبید: ہاں خداوند عالم نے مجھ کو دل بھی دیا ہے

ہشام: وہ کون سا کام انجام دیتا ہے؟

عمرو بن عبید: اس کا کام یہ ہے کہ ان اعضائے مذکورہ (آنکھ ناک کان زبان ہاتھ وغیرہ) پر جو چیزیں وارد ہوتی ہیں ان میں تمیز کردے اور اختلاف ہو تو اختلافات کو رفع کر دے اور شک کو زائل کر کے یقین عطا کرے

ہشام: تو کیا یہ کل اعضا باوجود صحیح وسالم ہونے کے دل کے محتاج ہیں کہ بغیر اس کے اپنے کاموں کو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے اور ان میں جو اختلاف ہے اسکو خود رفع نہیں کر سکتے؟

عمرو بن عبید: نہیں نہیں ان میں سے کوئی عضو دل سے بے نیاز اور مستغنی نہیں ہے

ہشام: آخر اس کی وجہ؟ کیونکہ ہر عضو صحیح وسالم ہے اور ادراک اور تمیز کی پوری قوت رکھتا ہے۔

عمرو بن عبید: صاحبزادے جب میں کسی چیز کو آنکھ سے دیکھتا ہوں یا زبان سے چکھتا ہوں یا ناک سے سونگھتا ہوں یا کان سے سنتا ہوں اور اس میں مجھے کوئی شک ہو جاتا ہے کہ میں نے یہ چیز دیکھی یا وہ یا میں نے یہ بات سنی یا وہ تو اس وقت

(باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

نیز یہ کہ خداوندِ عالم کسی ایسی چیز سے متصف نہیں ہو سکتا جو عرض ہو جس کا ادراک حسِ ظاہری سے ہوتا ہے یا حسِ باطنی سے یعنی خداوند عالم کو مزا رنگ خوشبو رنج و کینہ حزن و اندوہ خوف وغیرہ سے متصف نہیں کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ یہ ساری چیزیں مزاج اور اجسام کی توابع ہیں اور ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ خداوند عالم جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔

صفات وجودیہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ متکلمین نے صفات کی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک صفات ثبوتیہ دوسرے صفات سلبیہ۔ صفات سلبیہ کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ رہ گئیں صفاتِ وجودیہ تو ان کی بھی دو قسمیں ہیں بعض تو وہ ہیں جو بلاواسطہ ذات باری سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو ذات باری سے صادر ہونے والے افعال کے واسطہ سے اس سے تعلق رکھتی ہیں۔

جناب شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں

"خداوند عالم کی صفات دو قسموں کی ہیں ایک تو وہ جو ذات کی طرف منسوب ہیں جسکی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ صفات ذات ہیں دوسرے وہ جو افعال کی طرف منسوب ہیں اور افعالِ خداوندی کی صفت ہیں صفات ذات سے مراد وہ صفتیں ہیں جو خداوند عالم کے لئے ہر حال میں واجب و لازم ہیں ذات خداوندی بغیر کسی چیز کے واسطہ کے ان صفات کی مستحق ہے جیسے خداوند عالم کا حی و عالم و قادر ہونا خداوند عالم ہمیشہ ہی سے ان صفات کا مستحق رہا اور صفات فعل سے مراد وہ صفتیں ہیں جو ان افعال کے وجود میں آنے کے بعد خداوند عالم کے لئے لازم ہوئیں جیسے خالق و ممیت اور رازق ہونا خداوند عالم خالق کی صفت سے جبھی متصف ہو سکا جب اس نے خلق کو پیدا کر لیا ممیت جبھی کہلایا جب خلق کو اس نے موت دی رازق جبھی کہلایا جب اس نے بندوں کو رزق پہونچایا اسی طرح اور دوسری صفتیں جنکا حمل ذاتِ باری پر جبھی ممکن ہوا جب ان صفتوں کا خداوند عالم سے ظہور ہو لیا۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۲) دل کی طرف رجوع کرتا ہوں اور دل جو فیصلہ کر دیتا ہے اس سے شک زائل اور یقین حاصل ہو جاتا ہو۔

ہشام: تو اس تقریر سے ثابت ہوا کہ خدا نے دل کو انسان کے بدن میں اس مصلحت سے پیدا کیا ہے کہ انسان کے ظاہری اعضا میں جو شک پیدا ہو اسکو تمیز کر کے زائل کرے اور اختلاف سے جو فساد ہو اس کو رفع کرتا ہے۔

عمرو بن عبید: ہاں ایسا ہی ہے۔

ہشام: ابو مروان (کنیت عمرو بن عبید) اب آپ انصاف سے یہ بھی فرماویں کہ خدا نے کسی ایک شخص کے اعضا جوارح کو بھی مطلق العنان اور آزاد نہ چھوڑا بلکہ ہر انسان کے بدن میں ایک امام اور سردار (دل) کو پیدا کر رکھا ہو جو ہر وقت ان اعضا سے اختلافات کو رفع کر کے ان میں امن اور صلح قائم رکھتا ہے اور جو کچھ (باقی ص۱۳۴ پر)

غرضکہ صفات کی نسبت خداوند عالم کی طرف ایک ہی طرز پر نہیں اس لئے کہ بعض صفتیں تو ایسی ہیں جو بلاواسطہ اور بغیر کسی چیز کے توسط کے اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور بعض صفتیں اس کی طرف ان افعال کے لحاظ سے منسوب ہوتی ہیں جو اس سے صادر ہوں

اس دوسری قسم کے صفات یعنی صفات افعال الٰہی میں اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان یہ نزاع نہیں کہ یہ صفات عین ذات ہیں یا زائد بر ذات اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ان صفات کا اطلاق خداوند عالم پر ان افعال کے لحاظ سے ہوتا ہے جو اس سے صادر ہوتے ہیں اصل جھگڑا پہلی قسم کے صفات میں ہے جو خداوند عالم کے لئے بلاواسطہ کسی چیز کے ثابت ہوتے ہیں جیسے علم و قدرت وغیرہ ان صفات کے متعلق اشاعرہ اور معتزلہ میں جھگڑا یہ ہے کہ یہ صفات عین ذات خداوندی ہیں یا یہ صفات زائد بر ذات ہیں۔ اس جھگڑے کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان صفات کی ذرا تشریح کر لیں۔

قدرت

منجملہ صفات ذات کے متکلمین نے قدرت کو شمار کیا ہے متکلمین کے نزدیک اس کے معنی ہیں کہ کسی چیز کا کرنا یا نہ کرنا اس کے لئے ضروری نہیں خداوند عالم نے اس کائنات کو اس نظم و انتظام سمیت اپنی مشیت کے مطابق پیدا کیا اور اگر نہ چاہتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی۔

خداوند عالم کی قدرت ہر چیز سے متعلق ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ جس وجہ سے خدا ہر چیز پر قادر ہوتا ہے وہ خود اسکی ذات ہے اور کسی چیز کا مقدور ہونا بس میں ہونا اس چیز کے امکان کی وجہ سے ہوتا ہے اور خداوند عالم کی ذات کو ہر ممکن چیز سے مساوی نسبت حاصل ہے پس جب یہ ثابت ہے کہ خدا بعض چیزوں پر قادر ہے تو یہ بھی ضرور ثابت ہے کہ وہ کل چیزوں پر قادر ہے۔

اس عقیدہ پر سبھی مسلمان متفق ہیں کسی نے بھی مخالفت نہیں کی سوا بعض فلاسفہ اور بعض معتزلہ کے۔ فلاسفہ کا کہنا ہے کہ خداوند عالم واحد ہے اور واحد سے واحد ہی صادر ہو سکتا ہے لہٰذا اللہ تمام ممکنات پر قادر نہیں اس لئے فلاسفہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے عقل اول کو پیدا کیا اور بقیہ ممکنات اسی عقل اول کے واسطہ سے صادر ہوئے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳)
یہ اعتقاد درست پاتے ہیں اس کو اپنے اس امام (دل) سے تصدیق کرا لیا کرتے ہیں اور جس بات میں ان کو شک ہوتا ہے اس کو وہ امام (دل) دفع کر دیا کرتا ہے لیکن خدا نے تمام دنیا کی مخلوقات کو جنہیں لاکھوں اختلاف اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ایسے شدید تحیر اور پریشانی اور فتنہ و فساد میں چھوڑ دیا اور ان کے لئے کوئی امام مقرر نہیں فرمایا کہ جس وقت اور جس امر میں ان لوگوں کو شک اور اختلاف ہوا کرے اس میں اپنے امام کی طرف رجوع کر کے شک کو زائل اور حیرت و پریشانی کو دفع کر لیا کریں اور ان کی معاشرت کی حالت کو وہ امام درست رکھا کرے، کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے؟ (باقی صفحہ ۱۳۵ پر)

مجوسیوں کا کہنا ہے کہ خداوند عالم صرف خیر پر قادر ہے شر اس کے مقدور سے نہیں بلکہ وہ شیطانی فعل ہے نظام معتزلی اور اس کے پیرو کہتے ہیں کہ خداوند عالم قبیح پر قادر نہیں اس لئے کہ اگر خداوند عالم کسی قبیح کو قبیح جانتے ہوئے کرے تو اس کا یہ فعل نادانی ہے اور اگر اس کی قباحت سے لاعلم ہوکر کرے تو خداوند عالم کا ناقص ہونا لازم آئے گا۔

ان لوگوں نے اس مسئلہ میں جو غلطی کی ہے تو صرف اس غلط فہمی کی بنا پر کہ قدرت مستلزم وقوع ہے (یعنی جب خدا کسی امر پر قادر ہوگا تو وہ امر واقع بھی ضرور ہو جائے گا) اور یہ غلط فہمی اور تو ہم نہایت لغو ہے کیونکہ جس چیز پر قدرت حاصل ہو اس کا واقع ہونا ضروری نہیں ہوتا مثلاً ہم لوگ بہت سی برائیوں جیسے زنا۔ شراب خوری۔ چوری۔ اکل حرام وغیرہ امور پر قادر ہیں کہ جب چاہیں ان کاموں کو کر سکتے ہیں۔ مگر قادر ہونے سے کیا یہ امور ہم سے برابر واقع بھی ہوتے رہتے ہیں؟ پس جب ہم ایسے لاچار اور کمزور بندوں کی حالت یہ ہے تو خدائے قادر حکیم کا اختیار اور اسکی قدرت کی حد کس درجہ ہوگی؟ غرض خدا کی قدرت کا تعلق ہر اس چیز سے ہے جو اپنی ذاتی حیثیت سے ممکن ہو یعنی ہو سکتی ہو اگرچہ دوسرے مصالح سے خدا اس کو واقع نہ کرے تو خداوند عالم ان کل چیزوں پر ان کے امکان ذاتی کی وجہ سے قادر ہے اور دوسرے اسباب و مصالح سے ان چیزوں کا واقع نہ ہونا ان کو مقدوریت سے خارج نہیں کر سکتا کسی چیز کا دوسرے موانع سے واقع نہ ہونا اس کے امکان ذاتی کا منافی نہیں ہے اور یہ معلوم ہے کہ جو مقدورات واقع نہیں ہوتے وہ اپنی ذات سے محال نہیں ہیں۔ لہٰذا صحیح یہی عقیدہ ہے کہ خدا کی قدرت کا تعلق ہر مقدور سے صحیح اور برابر کا ہے۔

علم

منجملہ صفات ثبوتیہ کے یہ بھی ہے کہ خداوند عالم ہر چیز کا عالم ہے کلیات کا بھی اور جزئیات کا بھی۔ ایسی چیزوں کا بھی جو معدوم ہیں مگر ان کا ہونا ممکن ہے اور ایسی چیزوں کا بھی جن کا ہونا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴)

ہشام کی اس تقریر کو سن کر عمرو بن عبید نے سکوت اختیار کر لیا پھر تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر ہشام کی صورت دیکھی اور متحیر ہو کر پوچھا تم ہشام بن الحکم تو نہیں ہو؟

ہشام: واہ ہشام بن الحکم کی بھی خوب کہی وہ کہاں اور میں کہاں؟

عمرو بن عبید: اچھا تم ہشام کے شاگرد ہو یا ان کی صحبت میں کبھی رہے ہو

ہشام: نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔

عمرو بن عبید: پھر تم کون ہو اور تمہارا مسکان کہاں ہے

ہشام: میں ایک مسافر ہوں اور غریب خانہ کوفہ میں ہے اور وہیں سے آیا ہوں۔

عمرو بن عبید: تو پھر تم ہشام ہی کیوں چھپاتے ہو ۔۔۱۲

محالات سے ہے جو کچھ ہو چکا یا جو کچھ ہوگا۔ غرضکہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اس کا ثبوت کلام مجید کے ان آیات سے ملتا ہے عالم الغیب لا یعزب عنه مثقال ذرة فی السماوات و لا فی الارض و لا اصغر من ذالك و لا اکبر الا فی کتاب مبین (سورہ انبیا) عالم الغیب جس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں اور ذرہ سے چھوٹی چیز اور ذرہ سے بڑی غرض جتنی چیزیں ہیں سب واضح اور روشن کتاب (لوح محفوظ) میں محفوظ ہیں۔

وعنده مفاتح الغیب لا یعلمها الا هو و یعلم ما فی البر و البحر و ما تسقط من ورقة الا یعلمها و لا حبة فی ظلمات الارض و لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین

اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ خشکی و تری میں اس کو بھی وہی جانتا ہے اور کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور نہ کوئی خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے

خداوند عالم کے ہر شے کے عالم ہونا کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تمام موجودات کو ہر حیثیت سے مکمل پیدا کیا اُن کی بناوٹ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور غیر عالم کے لئے یہ بات ناممکن ہو کہ اس کا ہر کام یکے بعد دیگرے ہر حیثیت سے مکمل اور تمام خامیوں سے پاک ہو۔

مزید برآں ہر چیز خدا کے علاوہ ممکن ہے اور ہر ممکن محتاج ہے ایسی علت کا جو اس کے ایجاد کی مقتضی ہو اور موجودات و ممکنات کے ایجاد کی علت اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

بعض متکلمین کا کہنا ہے کہ خداوند عالم خود اپنے آپ کو نہیں جانتا اس لئے کہ علم ایک نسبت ہوتی ہے عالم اور معلوم کے درمیان اور عالم و معلوم کے درمیان مغایرۃ کا ہونا ضروری ہے لہذا اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا علم مغایر ہوگا اسکی ذات کے

اس دعوی کا جواب یہ ہے کہ علم و معلوم میں اعتباری مغایرت کافی ہے اور یہ یہاں موجود ہے بالمعنی کہ خداوند عالم کی ذات اس حیثیت سے کہ وہ عالم ہے غیر ہے اپنی ذات کے اس حیثیت سے کہ وہ معلوم ہے۔ اس قسم کی برائے نام مغایرت کافی ہے

کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ خداوند عالم جزئیات کا عالم نہیں ہے نہ کسی چیز کو اس کے وجود میں آنے سے پہلے جانتا ہے جزئیات کا عالم تو اس وجہ سے نہیں کہ جزئیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور جب معلوم میں تغیر و تبدل ہوگا تو عالم میں تغیر و تبدل بھی ضروری ہے اور یہ ثابت ہے کہ خداوند عالم کا علم عین ذات ہو تو نتیجۃً اسکی ذات میں تبدل و تغیر لازم آئے گا۔

کسی چیز کو اس کے وجود میں آنے سے پہلے اس لئے جانتا کہ اگر اس کا علم اس سے متعلق ہو تو اس

چیز کا وجود میں آنا واجب ہو جائے گا اور اس طرح ممکن چیز واجب بن جائیگی اور اگر وہ چیز وجود میں نہ آئی تو خداوند عالم جاہل ٹھہرے گا اس کا علم تو کہتا تھا کہ یہ چیز وجود میں آئے گی مگر یہ چیز غلط ثابت ہوئی

پہلے دعوے کا جواب یہ ہو کہ جزئیات کا عالم ہونیکی وجہ سے یہ ضروری نہیں کہ اگر جزئیات میں تغیر ہو تو علم میں بھی تغیر ہو جائے اسلئے کہ تغیر جو کچھ ہوگا وہ معلوم میں ہوگا اور معلوم کے متغیر ہونیکی وجہ سے یہ ضروری نہیں کہ عالم میں بھی تغیر ہو جائے مثلاً زید جب موجود ہوگا تو کہا جائیگا کہ خدا اسکے وجود کو جانتا ہے اور جب معدوم ہوگا تو اسکے وجود کی نسبت ہی خدا کی طرف ختم ہو جائیگی۔ تو علم اپنے حال پر باقی رہا اسمیں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا غرضکہ تغیر اضافات اور نسبتوں میں ہوتا ہو نہ کہ ذات یا صفات حقیقیہ میں اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ زید عمرو پر قدرت رکھتا ہے لیکن اگر عمرو مرجائے تو اسکا یہ مطلب تھوڑی ہوگا کہ زید کی قدرت بھی ختم ہو گئی البتہ یہ خصوصی نسبت عمرو کے مرنے پر باقی نہ رہے گی۔

دوسرے دعوے کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم کے عالم متجددات ہونے کی وجہ سے یہ ضروری نہیں کہ وہ متجددات حدود امکان سے خارج ہو کر حدود واجب میں داخل ہو جائیں اس لئے کہ خداوند عالم کے علم کا تعلق متجددات سے اُن کے متجددات ہونے کی حیثیت ہی سے ہوتا ہے لہذا اگر اپنے سبب کے وجود کی وجہ سے ان متجددات کا وجوب واجب بھی ہوا تب بھی وہ امکان ذاتی کے حدود سے خارج نہ ہوں گے اس لئے کہ ان کا وجود ذاتی نہیں بلکہ عارضی ہے اور اپنے سبب کی وجہ سے ہے اور ہر ممکن عارضی طور پر واجب بھی ہو سکتا ہے۔

حیات وارادہ

منجملہ صفات ثبوتیہ یہ بھی ہے کہ خداوند عالم حی و مرید بھی ہے اس لئے کہ خداوند عالم قادر ہے اور ہر عالم و قادر کے لئے حی ہونا ضروری ہے۔ اس کا حی ہونا ہمارے حی ہونے جیسا نہیں ہماری زندگی عبارت ہے اعتدال مزاج حسّ و حرکت نیز اور دیگر لوازم حیات سے لیکن خداوند عالم کے لئے اعتدال مزاج حس و حرکت وغیرہ کا سوال ہی نہیں

فرقہ امامیہ جو صفات خداوندی کو عین ذات قرار دیتا ہے خداوند عالم کی حیات کو معنائے سلبی میں لیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسکی ذات سے علم و قدرت کا الگ ہونا محال ہے کیونکہ صفت کا وجود فرع ہے اس کے ناممکن ہونے کی۔ لیکن اشاعرہ اور انکے ساتھ بعض معتزلہ بھی جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کی ذات اور ہے اور اس کے صفات اور ہیں اُن کے نزدیک حیاۃ خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ علم کامل اور قدرت شاملہ اُسے حاصل ہے

(شرح تجرید ص۱۷۷ مواقف ص۸۱)

خداوند عالم کے مرید ہونے پر بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور اس کے مرید ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے بعض چیزوں کو پیدا کیا اور بعض کو نہیں پیدا کیا حالانکہ اس کی قدرت ہر چیز کو شامل ہے اور اس کا علم ہر ہو سکنے والی چیز کو محیط ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جن چیزوں کو اس

چاہا جن چیزوں سے اس کا ارادہ متعلق ہوا وہ تو وجود میں آگئیں اور جن چیزوں سے اس کا ارادہ متعلق نہیں ہوا وہ نہیں پیدا ہوئیں۔

شیخ مفیدؒ اپنی کتاب اوائل المقالات میں لکھتے ہیں کہ ارادہ پروردگار خود اس کا فعل ہے اور بندوں کے افعال کے لحاظ سے اسکے مرید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان افعال کو بجالانے کا حکم دیتا ائمہ اہل بیت نے یہی معنے بتائے ہیں۔

سمع وبصر منجملہ دیگر صفات الٰہیہ کے خداوند عالم کا سمیع وبصیر ہونا بھی ہے۔ علامہ لاہجی مواقف میں علامہ حلی شرح تجرید میں لکھتے ہیں کہ دین محمدی کا یہ بدیہی مسئلہ ہے اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے خداوند عالم کے سمیع وبصیر ہونے کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ خداوند عالم کا حی ہونا ثابت و مسلم ہے اور ہر حی کے لئے سمیع وبصیر ہونا ضروری ہے اگر سمیع وبصیر نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ بہرا اور اندھا ہوگا اور خداوند عالم کا ان دونوں سے متصف ہونا اس کے لئے صریحی عیب ہے۔ سمیع وبصیر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر سنی اور دیکھی جانے والی چیز کا عالم ہے۔ اس لئے کہ اس کا سننا اور دیکھنا اگر اسی طرح ہو جس طرح تمام مخلوقات کا ہے یعنی مخلوقات ہی کی طرح وہ کان سے سُنے اور آنکھ سے دیکھے تو اس صورت میں اس کا جسم ہونا لازم آئے گا اور یہ جسم مختلف اجزاء سے مرکب ہوگا ہر جزء علیحدہ علیحدہ کام کے لئے ہوگا کوئی سننے کے لئے ہوگا کوئی دیکھنے کے لئے اور یہ بات خداوند عالم کے لئے محال ہے لہذا لازمی طور پر ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس کا دیکھنا اور سُننا مخلوقات کے دیکھنے اور سننے جیسا نہیں۔

شیخ مفیدؒ تحریر فرماتے ہیں:

"ذات قدیم پروردگار ان کل صفتوں کی اس وجہ سے مستحق ہے کہ یہ صفتیں قرآن وحدیث میں آچکی ہیں قیاس اور عقلی دلیلوں کی وجہ سے نہیں۔ اور یہ جتنی بھی صفتیں ذکر کی گئی ہیں ان سب کا خلاصہ معنی یہ ہے کہ خداوند عالم عالم ہے پس اس کے سمیع وبصیر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر سنی اور دیکھی جانے والی چیز کا عالم ہے"

شیخ مفیدؒ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ کسی بھی شیعہ عالم نے اسمیں اختلاف نہیں کیا۔ یہی مسلک بغداد کے معتزلیین کا بھی ہے صرف بصرہ کے معتزلیوں اور فرقہ مشبہہ والوں نے اس سے اختلاف کیا ہے (اوائل المقالات صہ۲۱) اشاعرہ اور جمہور معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ سمیع وبصیر ہونے کی صفتیں علم ہیں اندر علم ہیں یعنی علم کے علاوہ صفتیں ہیں (مواقف صہ۸۹)

مواقف کی عبارت سے صراحت ہوتی ہے کہ معتزلہ کی اکثریت اس مسئلہ میں اشاعرہ کی ہمنوا ہے یعنی اس کے سمیع وبصیر ہونے کی صفت کو اس کے عالم ہونے کی صفت کے علاوہ قرار دیتے ہیں۔

تکلم منجملہ صفات ثبوتیہ کے تکلم بھی ہے۔ خداوند عالم کے متکلم ہونے پر بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے۔ اختلاف ہے تو بس یہ کہ اس کا کلام حادث ہے یا قدیم۔ یہ اختلاف و نزاع سب سے پہلے معتزلہ اور محدثین کے درمیان قائم ہوئی جب کہ معتزلہ کا نیا نیا ظہور ہوا تھا محدثین اور معتزلہ دونوں نے اپنے اپنے مذہب اور نقطۂ خیال کی تائید میں بڑے جوش و ولولہ کے مظاہرے کئے۔ ہر ایک نے دوسرے پر گالیوں کی بوچھار کی فاسق ٹھہرایا طرح طرح کی تہمتیں لگائیں۔ یہ جنگ و نزاع اس وقت اپنی انتہا کو پہونچ گئی جب عباسی خلفا معتزلہ کے پشت پناہ بن گئے اور انھوں نے بھی وہی نظریات اپنا لئے جو معتزلہ کے تھے جیسے مامون، معتصم اور واثق۔ ان سلاطین نے قوت و طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ وہی عقائد و نظریات اختیار کریں جو معتزلہ کے ہیں فقہاء و محدثین کو بھی اسی لئے اپنے تشدد کا نشانہ بنایا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح معتزلہ اور فقہاء و محدثین کے درمیان اختلافات تھے اسی طرح خود معتزلہ کے آپس میں بھی بہت سے مسائل میں اختلافات تھے۔ لیکن معتزلہ اور فقہاء و محدثین کے درمیان یہ اختلافات اس وقت سخت و شدید ہوئے جب معتزلہ نے خلق قرآن کا نظریہ ظاہر کیا یعنی یہ کہا کہ قرآن مخلوق اور حادث ہے یہ نظریہ سب سے بڑا معرکہ آرا مسئلہ ثابت ہوا حالانکہ اور بھی بہت سے مسائل ایسے تھے جن میں معتزلہ اور محدثین کے درمیان اختلافات تھے اور ان مسائل کو بہ نسبت مسئلہ خلق قرآن کے دین سے زیادہ گہرا تعلق بھی تھا جیسے بندہ کے فاعل مجبور و مختار ہونے کی بحث، رویت باری کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ مگر خلق قرآن کے مسئلہ پر معتزلہ و محدثین کے درمیان جیسی معرکہ آرائیاں ہوئیں شاید ہی کسی اور مسئلہ پر ہوئی ہوں۔

چنانچہ بندہ کے فاعل مختار یا مجبور محض ہونے کا مسئلہ بہ نسبت دیگر کلامی مسائل کے بہت پیچیدہ مسئلہ تھا اور بقیہ مسائل کی بہ نسبت اُسے دین سے گہرا تعلق بھی تھا مگر اس مسئلہ میں معتزلہ اور محدثین کی نزاع و تکرار اس حد کو نہیں پہونچی جتنا کہ مسئلہ خلق قرآن میں پہونچ گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ ابتک ان دونوں میں جتنے اختلافات ہوا کئے تھے وہ بس علمی بحث و تکرار کی حد تک رہے منطقی و فلسفیانہ دلائل سے کام لیا جاتا تھا جیسا کہ عام طور پر علمی بحثوں میں دستور ہے حکومت غیر جانبدار رہی تھی اس نے کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا تھا لیکن معتزلہ نے یہ دیکھ کر کہ مامون ہماری طرف متوجہ ہے اس کے سوچنے کا انداز بھی ہمارے ہی جیسا ہے انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی انھوں نے دیکھا کہ خلق قرآن کا مسئلہ ایسا ہے کہ ہم اس کے آڑ میں اپنے ان دشمنوں سے جو ہمیں زندقہ اور الحاد کی تہمت لگایا کرتے ہیں پوری طرح بدلہ چکا سکتے ہیں۔

ان معتزلہ نے مامون کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی کہ قرآن کے مخلوق ہونے سے انکار کرنا بالکل

ایسا ہی ہے جیسا عیسائیوں کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدائی میں شریک مان کر موحد نہیں رہے اسی طرح قرآن کو غیر مخلوق ماننے والے سچے موحد نہیں جس طرح اُنکے نزدیک خدا قدیم ہے اسی طرح قرآن بھی قدیم ہے حالانکہ قدیم بس اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

معتزلہ کے ایک فقیہ احمد بن داؤد نے اس سلسلہ میں اہم رول ادا کیا یہ مامون کے مقرب بارگاہ تھے مامون اس پر بہت بھروسہ بھی کرتا تھا اس احمد بن داؤد نے مامون کو اتنا ہمنوا بنالیا اور اسطرح اُسکے ذہن و دماغ پر قابض ہو بیٹھا کہ مامون نے ہر صوبہ ہر ضلع کے حکام کو فرامین روانہ کئے کہ تم لوگ اپنے اپنے یہاں کے فقہاء و محدثین کو بلاؤ اور مسئلہ خلق قرآن کے متعلق اُن کے خیالات معلوم کرو اور جس کو بھی اس مسئلہ میں معتزلہ کا ہم خیال نہ پاؤ اسے سخت ترین سزائیں دو۔

مامون کے بعد معتصم اور واثق خلیفہ ہوئے ان دونوں کا رویہ بھی معتزلہ کے مخالفین کے ساتھ ویسا ہی رہا جیسا کہ مامون کا تھا ان دونوں کے عہد حکومت میں محدثین کے مصائب و آلام کی انتہا نہیں رہی امام احمد حنبل ۸ مہینوں تک جلادوں کے ہاتھ میں رہے جو انھیں سخت سے سخت تکلیفیں اور اذیتیں پہونچاتے مگر امام احمد کسی طرح اپنی رائے سے نہیں ہٹتے وہ یہی کہتے رہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ بھی اسی طرح غیر مخلوق اور قدیم ہے جس طرح خود اللہ قدیم ہے۔ واثق کے بعد متوکل خلیفہ ہوا اس کے زمانہ میں کایا ہی پلٹ گئی اس نے محدثین اور اُن کے پیروؤں کی پشت پناہی کی معتزلہ جو ابتک دربار پر چھائے ہوئے تھے چن چن کر نکالے گئے اور اس وقت فقہاء نے آرام کی سانس لی اور انھیں اندازہ ہوا کہ اب پانسہ پلٹ چکا ہے، اب اس وقت خود اُن معتزلہ کی جان کے لالے پڑ گئے جو کل تک محدثین کے دشمن تھے اور حکومت کی طاقت سے اپنے نظریات منوانے پر تلے ہوئے تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ خلق قرآن کو بہانہ بنا کر معتزلہ نے محدثین کو سزا دینے کی کوشش کی تھی جو معتزلہ کو الحاد و زندقہ کی تہمت لگایا کرتے تھے۔ معتزلہ و محدثین کی تاریخ میں یہ مسئلہ سب سے اہم اور خطرناک مسئلہ بن گیا کیونکہ اس مسئلہ میں بحث و تکرار علمی اور منطقی حدود تک نہیں رہی جس طرح دیگر اختلافی مسائل میں ہوا کی بلکہ نوبت قتل و غارت قید و بند اور دیس نکالے تک جا پہونچی اس وقت کے حکام کو موقع مل گیا کہ اس مسئلہ کو بہانہ بنا کر ان لوگوں سے جی کھول کر انتقام لیا جائے جو ہمارے سیاسی حریف اور ہماری من مانی کارروائیوں پر ناراضگی کا اظہار کیا کرتے اب ہر منزل پر معتزلہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا اور فقہاء و محدثین حکام کی پشت پناہی حاصل ہو جانے کے سبب اونچے ہو رہے تھے انہوں نے بھی معتزلہ کے ساتھ وہی سب کچھ کیا جو معتزلہ اُن کے ساتھ کر چکے تھے۔

بہر حال محدثین و علماء اور اُن کے پیرو اشاعرہ اس بات کے مدعی تھے کہ متکلم ہونا اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی ہر صفت قدیم اور قائم بذاتہ ہے وہ خداوند عالم کے متکلم ہونے کی صفت کو کلام نفسی سے

تعبیر کرتے ہیں اور اسکو بھی اسی طرح قدیم اور غیر مخلوق قرار دیتے ہیں جس طرح خود خداوند عالم غیر مخلوق ہے۔ اُن کے نزدیک لفظ کلام مشترک ہے کبھی تو اس آواز کو کلام کہتے ہیں جو حروف سے مرکب ہو کبھی اس معنیٰ کو کلام کہتے ہیں جو حروف سے مرکب ہو اور کبھی اس معنے کو کلام کہتے ہیں جو نفس کے اندر دل میں یا (دماغ میں) قائم ہو جسے بذریعہ الفاظ ادا کیا جا سکتا ہے۔

اشاعرہ کا کہنا ہے کہ ہر شخص جب کلام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کچھ معانی و مطالب کو اپنے ذہن میں ترتیب دے لیتا ہے اسی خیالی ترتیب کو جو ذہن میں پیدا ہوتی ہے کلام نفسی کہتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جن الفاظ کو ہم بولتے ہیں ان کے معانی بھی ذہن میں ضرور موجود ہوتے ہیں انھیں معانی کو کلام نفسی کہتے ہیں رہ گئیں آوازیں حروف اور وہ کلمات جو آسمانی کتابوں میں موجود ہیں وہ حقیقۃً کلام نہیں وہ تو ترجمان ہیں اللہ تعالیٰ کے کلام کے۔ آوازیں۔ حروف۔ کلمات۔ زمانہ مکان اور زبان کے بدلنے سے مختلف ہو سکتے ہیں مگر کلام حقیقی میں نہ تغیر ہوتا ہے نہ تبدل اور جس طرح کلام حقیقی پر الفاظ دلالت کرتے ہیں اسی طرح اشارہ اور کنایہ بھی دلالت کرتا ہے اور کلام حقیقی ان تمام چیزوں سے بالکل علیحدہ چیز ہے جو کلام حقیقی کے ترجمان ہیں۔ تمام اہلِ سنت کا یہی عقیدہ ہے کسی نے بھی مخالفت نہیں کی سوا فرقہ حنابلہ کے جن کا عقیدہ ہے کہ حروف و اصوات ہی خدا کا کلام ہیں اور یہ حروف و اصوات خدا کی ذات میں قائم ہیں اور خدا کی طرح یہ بھی قدیم ہیں یہاں تک کہ کلام مجید کے الفاظ و حروف تو الگ رہے جلد اور غلاف بھی قدیم ہیں۔

معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ یہی الفاظ و حروف جو توریت و انجیل اور قرآن میں موجود ہیں یہی خدا کا کلام ہیں خداوند عالم نے انبیاء کے ذہن اور ملائکہ کے ذہن میں نیز اس درخت میں جسنے جناب موسیٰ سے کلام کیا تھا اسی طرح کلام کو پیدا کیا جس طرح تمام کائنات و موجودات کو پیدا کیا ان کتابوں کے علاوہ اور کسی چیز کو کلام خدا کہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ اشاعرہ مدعی ہیں۔ تکلم کی نسبت خداوند عالم کی طرف اسی طرح ہے جس طرح اس کے خالق و رزاق ہونے کی نسبت ہے یعنی صفت تکلم صفات ذات نہیں بلکہ صفات افعال خداوندی سے ہے۔

اس کے ثبوت میں معتزلہ عقلی دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں اور نقلی بھی۔ عقلی دلیل تو یہ کہ اگر کلام خُدا بھی قدیم ہو جس طرح وہ خود قدیم ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کو جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن باتوں سے روکا ہے یا جن باتوں کی اس نے توریت و انجیل اور قرآن مجید میں خبر دی ہے یہ سب بھی قدیم ہوں اور اسی وقت سے ہوں جب سے کہ خدا ہے حالانکہ اس وقت نہ کوئی سننے والا تھا نہ کوئی مکلف بندہ تھا لہٰذا اس کا حکم دینا اور کسی بات کی خبر دینا فضول سی بات تھی اور خدا کے متعلق فضول باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مزید برآں اگر کلام خدا کو قدیم مانا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا کے لئے فعل قبیح کا مرتکب ہونا جائز ہے۔ بایں معنی کہ اگر وہ ازل میں بے فائدہ کلام کرتا رہا تو سفیہانہ فعل کا مرتکب تھا اور یہ قطعی طور پر قبیح بات ہے اور اگر اسکے کلام کا کوئی فائدہ تھا تو خود خدا کو یہ فائدہ تھا یا کسی اور کو اگر یہ کہا جائے کہ اپنے کلام سے خود اسی کو فائدہ تھا تو بالکل غلط ہے کیونکہ بولنے والا اپنے کلام سے اپنے کو یا تو یوں فائدہ پہونچا سکتا ہے کہ اس کلام سے اسکو طرب و وجد پیدا ہوتا ہے یا اس لئے بولتا ہو کہ اسے یاد کرے یا اس لئے کلام کرتا ہے کہ اس سے کسی کی عبادت مقصود ہو جیسے ہم لوگ دعا و نماز پڑھتے ہیں تو یہ تمام باتیں خدائے تعالیٰ کے بارے میں ناممکن ہیں کیونکہ اس کی ذات ان تینوں باتوں سے پاک و منزہ ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کلام ازلی سے کسی دوسرے کو فائدہ تھا تو دوسرے کو اسی وقت فائدہ پہنچ سکتا ہے جبکہ وہ سُنے اور سمجھے بھی اور جبکہ معلوم ہے کہ ازل میں نہ کوئی سننے والا تھا اور نہ کوئی سمجھنے والا تو فائدہ کیسے پہونچتا تھا۔

نیز یہ بھی لازم آتا ہے کہ خداوند عالم کا کلام کذب ہو جائے کیونکہ قرآن میں فرماتا ہو انا ارسلنا نوحاً ہم نے نوح کو رسول بنا کر بھیجا انا اوحینا الی ابراھیم ہم نے ابراہیم پر وحی کی اھلکنا القرون ہم نے گذشتہ امتوں کو ہلاک کر دیا ضربنا لکم الامثال ہم نے تمہارے لئے امثال بیان کر دی۔ وغیرہ وغیرہ یہ ظاہر ہے کہ ان تمام جملوں میں گذرے ہوئے زمانہ کے واقعات کی خبریں دیگئی ہیں تو چاہئے کہ پہلے واقعات ہولیں تب خبر دی جائے اور جب کلام خدا کو قدیم مانا جائے گا تو لازم آئے گا کہ جب سے اللہ تعالیٰ موجود ہے تب سے ان واقعات کی خبریں دیتا رہا ہو حالانکہ ان واقعات کا وقوع ابھی تک نہیں ہوا تھا اور غیر واقع امور کی خبر دینا کذب ہے لہذا لازم آتا ہے کہ خداوند عالم نے قرآن میں یہ جتنی باتیں کہی ہیں وہ جھوٹ ہیں۔

دلائل نقلیہ میں معتزلہ کلام مجید کی ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن سے صراحت ہوتی ہے کہ کلام خدا حادث اور مخلوق ہے جیسے خداوند عالم کے یہ ارشادات کہ مایاتیھم من ذکر من ربھم محدث مایاتیھم من ذکر من الرحمان محدث ان آیات میں خداوند عالم نے اپنے ذکر یعنی کلام کو محدث یعنی حادث (نئے سے حال ہونے والا نہ پہلے سے وجود میں آنے والا بتایا ہے) یا جیسے خداوند عالم کا ارشاد کہ انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون ہم جب کسی شئے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم صرف یہ کہدیتے ہیں کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آئندہ پیدا ہونے والی چیزوں کیلئے وہ کن فرما دیتا ہے تو موجود ہو جاتی ہیں اور جب تک نہیں فرماتا نہیں ہوتیں۔ یہی معنی حدوث کے ہیں اسی طرح کی اور بہت سی آیتیں ہیں جنھیں معتزلہ نے اپنے عقائد کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

شیعہ امامیہ اس مسئلہ میں معتزلہ سے متفق ہیں انکا بھی عقیدہ ہے کہ کلام خدا حادث و مخلوق ہے

اور جس طرح خداوند عالم نے سارے مخلوقات کو خلق فرمایا اسی طرح اپنے کلام کو بھی
علامہ حلی تحریر فرماتے ہیں :۔
"کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے بایں معنی کہ وہ ایسی آواز جسے کلام کہتے ہوں
اور جو حروف سے مرکب ہو کسی جسم بے روح میں قائم کر سکتا ہے (یعنی اس سے آواز اور
گفتگو سنائی دے سکتی ہے) جیسے خداوند عالم نے جناب موسیٰ سے بذریعہ درخت کلام کیا
کہ اس میں آوازیں اور حروف پیدا کر دے اور جناب موسیٰ اُسے سنتے اور سمجھتے رہے ۔ مگر
اشعری فرقہ والوں نے اس مسئلہ میں اپنی عقلوں کی بھی اور دیگر ارباب عقل کی عقلوں کی بھی
مخالفت کی ہے انھوں نے خداوند عالم کے لئے ایسے کلام کو ثابت کیا ہے جسے وہ خود سمجھ
سکتے ہیں نہ کوئی اور"
اسی سلسلہ میں علامہ حلی تحریر فرماتے ہیں :
"عقل اور قرآن و حدیث دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ کلام خدائے تعالیٰ حادث
ہے ازلی و قدیم نہیں کیونکہ کلام خدا حروف سے مرکب ہے اور معلوم ہے کہ دو حرف بھی
ایک وقت اور آن واحد میں قوت سامعہ میں جمع نہیں ہو سکتے بلکہ ضرور ہے کہ ایک پہلے
ہوگا اور دوسرا اس کے پیچھے (مثلاً اگر کوئی کہے من تو حرف م پہلے سنائی دے گا اور حرف نون
اس کے بعد اور تب سنائی دے گا جب حرف میم ختم ہو چکا ہوگا اور کان میں باقی نہ ہوگا
اسے معمولی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ پیچھے والی شے حادث ہوتی ہے اور جو چیز اس سے
بلحاظ زمانہ کے کسی قدر مقدم ہو وہ بھی حادث ہوگی (کیونکہ اس سے اتنا معلوم ہو سکے گا کہ
مثلاً ایک منٹ یا ایک سکنڈ یا اس سے زیادہ و کم پہلے پیدا ہوئی ہے) پس جن چیزوں میں
اس طرح کا تقدم و تاخر ہو یقیناً وہ دونوں ہی حادث اور فانی ہیں ۔
احادیث و تحریرات ائمہ معصومین سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ طاہرین اس مسئلہ میں بحث و نزاع کو
پسند نہیں فرماتے تھے اس لئے کہ اس قسم کے مسائل میں کد و کرنا ضروریات دین سے نہیں نہ جھگڑا اتکرار
اور نزاع و خصومت احقاق حق اور ازالہ شکوک کے لئے کہی جا سکتی ہے فرض کیجئے کہ کوئی شخص کلام
خدا کو قدیم ہی مانے جس طرح اشاعرہ قدیم مانتے ہیں وہ خدا کے کلام کو کلام نفسی ہی قرار دے تو
اس سے ان ہنگامہ آرائیوں کا جواز کہاں ثابت ہوتا ہے جنھیں معتزلہ نے جنم دیا اور نزاع و خصومت
بڑھتے بڑھتے کشت و خون تک نوبت جا پہونچی اور معتزلہ و اشاعرہ میں سے بہت سے لوگوں کو جان
سے ہاتھ دھونا پڑا ۔ قرآن و حدیث میں بس اتنا ہی حکم ہے کہ ہم خداوند عالم کے ان اوصاف سے تجاوز
نہ کریں جو قرآن میں مذکور ہیں اور قرآن میں اس کا نام و نشان بھی نہیں کہ خدا کا کلام حادث ہے یا قدیم

اسی لئے آئمہ طاہرین نے جہاں اشاعرہ کی اس حرکت کو ناپسند کیا کہ وہ وحی ربانی کے برعکس کلام خدا کو قدیم قرار دیتے ہیں وہاں معتزلہ کی اس بات کو بھی پسند نہیں کیا کہ انھوں نے کلام خدا کے حادث و مخلوق ہونے پر اتنا اصرار کیا کہ نوبت کشت و خون تک جا پہونچی چنانچہ حسن بن خالد بیان کرتا ہے کہ میں نے امام رضاؑ سے سوال کیا کہ آپ قرآن کے متعلق کیا فرماتے ہیں امام نے فرمایا نہ وہ خالق ہے نہ مخلوق بلکہ وہ کلام خدا ہے۔

امام علی نقیؑ سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ قرآن میں جنگ وجدل میں بلا وجہ ہے اس میں سائل اور مجیب دونوں شریک ہیں۔ سائل ایسی بات پوچھتا ہے جس کا پوچھنا اس کے فرائض میں داخل نہیں اور جواب دینے والا ایسی بات کا جواب دیتا ہے جو اس کی ذمہ داری نہیں خالق بس اللہ ہی ہے اس کے ماسوا جتنی چیزیں وہ سب مخلوق ہیں قرآن خدا کا کلام ہے اس کا اپنی طرف سے کوئی نام نہ رکھو اس طرح تم گمراہوں میں ہو جاؤ گے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں قرآن محدث ہے مگر غیر مخلوق ہے اور خدا کی طرح ازلی و قدیم نہیں (توحید صدوق ص ۱۲۸)

مختصر یہ کہ اس مسئلہ میں امامیہ کا مسلک ائمہ طاہرین کی ہدایات کی روشنی میں غلو و تشدد سے پاک ہے اگرچہ وہ کلام خدا کو کائنات کی دیگر چیزوں کی طرح حادث مانتے ہیں معتزلہ کے ہمنوا ہیں مگر نہ معتزلہ کی طرح اس میں تشدد مناسب سمجھتا ہے نہ اشاعرہ کی طرح غلو پسند۔ وہ مخلوق و قدیم ہونے کی بحث میں پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ قرآن نے خود اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

خداوند عالم کے صفات عین ذات ہیں

خداوند عالم کے کچھ صفات صفات ذات ہیں جیسے علم و قدرت حیاۃ و ارادہ وغیرہ اور کچھ صفات افعال ہیں جیسے اس کا رازق و ممیت ہونا۔

صفات ذات کے متعلق شیعہ امامیہ اور بہت سے معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ خداوند عالم کے صفات عین ذات ہیں۔ اللہ عین علم ہے عین قدرت ہے عین سمع و بصر اور حیاۃ ہے علم و قدرت اسکی ذات کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔

اشاعرہ کا مسلک یہ ہے کہ خداوند عالم کے صفات قدیم اور زائد بر ذات ہیں وہ عالم ہے علم کی وجہ سے اور اس کا علم غیر ہے اس کی ذات کے اسی طرح وہ ارادہ کی وجہ سے مرید اور حیاۃ کی وجہ سے حی ہے اور یہ چیزیں اس کی ذات سے جداگانہ ہیں۔

شیعہ امامیہ کی دلیل یہ ہے کہ اگر خداوند عالم کی صفات اسکی ذات سے الگ کوئی چیز ہوتے تو

دو ہی صورتیں تھیں یا تو صفات قدیم ہوتے یا حادث اگر قدیم ہوتے تو تعدد قدما لازم آتا یعنی ایک قدیم تو اللہ پھر ہر ہر صفت اپنی اپنی جگہ قدیم اور یہ قول عیسائیوں کے قول سے بھی بدتر ہے جو صرف ۳ قدیم مانتے ہیں اب۔ ابن۔ روح اور یہاں بہت سے قدیم ماننے پڑیں گے۔

اور اگر اس کے صفات حادث ہوں بایں معنے کہ بعد میں پیدا ہوئے تو جب تک وہ صفات پیدا نہ ہوئے تھے اس وقت تک کے لئے چاہے وہ ایک منٹ ایک سکنڈ کے لئے کیوں نہو اللہ کا ان صفات سے خالی ہونا لازم آئے گا اور محتاج ہونا بھی خداوند عالم علم کا محتاج ہوگا تاکہ عالم کہا جا سکے قدرت کا محتاج ہوگا تاکہ قادر ہو سکے اسی طرح بقیہ صفات۔ اس بنا پر خدا ناقص ٹھہرے گا۔

حسین بن خالد روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام رضا کو ارشاد فرماتے سُنا۔

اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے علیم و قادر، وحی و سمیع و بصیر ہے۔ میں نے عرض کی فرزند رسول کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم عالم ہے علم کی وجہ سے قادر ہے قدرت کی وجہ سے حی ہے حیاۃ کی وجہ سے قدیم ہے قدم کی وجہ سے سمیع ہے سمع کی وجہ سے امام نے فرمایا جس نے ایسا کہا اور ایسا عقیدہ رکھا اس نے اللہ کے ساتھ دوسرا خدا قرار دیا اور اس سے ہمیں کوئی تعلق نہیں پھر امام نے فرمایا۔

خداوند عالم ہمیشہ سے علیم و قادر حی و سمیع و بصیر بذاتہ ہے مشرکین و مشبہہ جو کہتے ہیں اس سے بلند و برتر ہے اسکی ذات "۔

جناب صدوقؒ نے اپنی کتاب التوحید میں اس موضوع سے متعلق ائمہ طاہرینؑ سے مروی بہت سی حدیثیں درج کی ہیں اور ہر حدیث صراحتًہ بتاتی ہے کہ خداوند عالم کے صفات اس کے عین ذات ہیں۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین کا یہ فقرہ مذکور ہے جس میں آپ نے حقیقت توحید کی وضاحت فرمائی ہے وکمال توحیدہ الاخلاص لہ وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ بشہادۃ کل صفۃ انہا غیر الموصوف فمن وصف اللہ فقد قرنہ ومن قرنہ فقد ثناہ ومن ثناہ فقد جزاہ ومن جزاہ فقد جہلہ

کمال توحید تنزیہ و اخلاص ہے اور کمال تنزیہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے لہذا جس نے ذات الٰہی کے علاوہ صفت مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا اور جس نے اسکی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس کے لئے جز بنا ڈالا اور جو اس کے لئے اجزا کا قائل ہوا وہ اس سے جاہل رہا۔

"یعنی کمالِ معرفت یہ ہے کہ اسکی ذات میں صفتوں کو الگ سے نہ سمویا جائے کہ ذات احدیت میں دوئی کی جھلک پیدا ہو جائے اور توحید اپنے صحیح مفہوم کو کھو کر ایک تین میں اور تین ایک میں کے چکر میں

پڑ جائے کیونکہ اس کی ذات جوہر و عرض کا مجموعہ نہیں کہ اس میں صفتیں اس طرح قائم ہوں جس طرح پھول میں خوشبو اور ستاروں میں چمک بلکہ اس کی ذات خود تمام صفتوں کا سرچشمہ ہے اور وہ اپنے کمالات ذاتی کے اظہار کے لئے کسی توسط کی محتاج نہیں اگر اسے عالم کہا جاتا ہے تو اس بنا پر کہ اس سے علم کے آثار نمایاں ہیں اور اگر اسے قادر کہا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہر ذرہ اسکی قدرت کی کارفرمائی کا پتہ دے رہا ہے اور سمیع و بصیر کہا جاتا ہے تو اس وجہ سے کہ کائنات کی شیرازہ بندی اور مخلوقات کی چارہ سازی دیکھے اور سنے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مگر ان صفتوں کی نمود اسکی ذات میں اس طرح نہیں ٹھہرائی جا سکتی جس طرح ممکنات میں کہ اس میں علم آئے تو وہ عالم ہو اور ہاتھ پیروں میں توانائی آئے تو وہ قادر و توانا ہو کیونکہ صفتوں کو ذات سے الگ ماننے کا لازمی نتیجہ دوئی ہے اور جہاں دوئی کا تصور ہوا وہاں توحید کا عقیدہ رخصت ہوا۔ اسی مفہوم کو امام جعفر صادق اپنے کلام میں واضح فرماتے ہوئے کہتے ہیں لم یزل ربنا عزوجل والعلم ذاته ولا معلوم والسمع ذاته ولا مسموع والبصر ذاته ولا مبصر والقدرة ذاته ولا مقدر

ہمارا خدائے بزرگ و برتر ہمیشہ سے عین علم رہا حالانکہ معلوم ابھی کتم عدم میں تھا۔ اور عین سمع و بصر رہا حالانکہ نہ کسی آواز کی گونج بلند ہوئی اور نہ کوئی دکھائی دینے والی چیز تھی اور عین قدرت رہا حالانکہ قدرت کے اثرات کو قبول کرنے والی کوئی شے نہ تھی۔

(توحید صدوق و ترجمہ نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین مطبوعہ لاہور)

دیدارِ الٰہی

فرقہ امامیہ اس بات کا معتقد ہے کہ خداوند عالم نہ دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے نہ آخرۃ میں۔ اس لئے کہ جو نہ جسم ہو نہ کسی جسم میں حلول کئے ہو نہ کسی جہت یا مکان یا جگہ میں واقع ہو نہ آمنے سامنے ہو اس کا دیکھا جانا ممکن نہیں۔ کلام مجید کی آیتیں بھی یہی بتاتی ہیں اور پیغمبر خدا کے ارشادات بھی یہی۔

ارشاد خداوندی ہے لا تدرکه الابصار وهو یدرک الابصار اس کو نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں وہ نگاہوں کو دیکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ سے خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے البتہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ قائم رہے تو ممکن ہے مجھے تم دیکھ لو۔

(اس آیت کی تفسیر میں امام رضاؑ سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے شدید اصرار کیا کہ ہمیں خدا کو دکھا دیجئے۔ خداوند عالم نے جناب موسیٰ پر وحی نازل فرمائی کہ موسیٰ تم یہ سوال کر کے

دیکھو۔ جب جناب موسیٰ نے اس کا سوال کیا تو وحی نازل ہوئی کہ موسیٰ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے البتہ تم اس پہاڑ کی طرف نظر کرو یہ اگر اپنی جگہ ٹھہرا رہ جائے تو شاید تم دیکھ لو۔ خداوند عالم نے نور کی چھوٹ اس پہاڑ پر ڈالی پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور جناب موسیٰ غش کھا کر گر پڑے جب ہوش آیا تو عرض کی خداوندا میں توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا ایمان و اعتقاد لانے والا ہوں اس بات پر کہ تو دیکھا نہیں جا سکتا)

یہ آیت صرف اسی پر نہیں دلالۃ کرتی کہ خداوند عالم کا دکھائی دینا ناممکنات سے ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ دکھائی دینا خداوند عالم کی بہ نسبت ناممکنات سے ہے اس لئے کہ خداوند عالم نے اسے پہاڑ کے اپنی جگہ برقرار رہنے پر معلق کیا ہے اور تزلزل کے ساتھ برقرار رہنا ناممکنات سے ہے ورنہ ایک ہی چیز کا ایک ہی وقت ساکن و متحرک ہونا دونوں لازم آئے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے لایدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ سے نہ گذر جائے تو جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا کہ نہ اونٹ اتنا چھوٹا ہو نہ سوئی کا ناکہ بڑا ناممکن ہے اسی طرح پہاڑ کا ایک ہی وقت میں متزلزل ہونا اور ٹھہرا ہوا ہونا بھی ناممکن ہے اور جب انبیاء کرام کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خدا کو دیکھ سکیں تو عوام الناس کب اُسے دیکھ سکیں گے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ فاخذتھم الصاعقۃ بظلمھم (اور وہ وقت بھی یاد کرو جب اے بنی اسرائیل) تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں اس پر تمہیں بجلی نے لے ڈالا اور تم تکتے ہی رہ گئے (پ رکوع ۶)

صفوان بن یحییٰ بیان کرتا ہے کہ مجھ سے ابو قرہ نے خواہش کی کہ مجھے امام علی رضاؑ کی خدمت میں لے چلو چنانچہ میں نے امام سے اسکو ساتھ لانے کی اجازت چاہی آپ نے اجازت مرحمت فرمائی ابو قرہ نے حاضر ہو کر کہا۔

"ہمارے یہاں کی روایتوں میں ہے کہ خداوند عالم نے اپنے دیدار اور ہم کلامی کو دو بزرگوں میں تقسیم کیا جناب موسیٰ کو شرف ہمکلامی سے سرفراز کیا اور حضرت محمد مصطفےٰ کو شرف دیدار سے"

امام نے فرمایا:

پھر خداوند عالم کی طرف سے جن و انس کو کس نے یہ بات پہونچائی کہ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار اس کو نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں وہ البتہ نگاہوں کا دیکھنے والا ہے۔ ولایحیطون بہ علما اسے پوری طرح نہیں جان سکتے۔ ولیس کمثلہ شی خدا جیسی کوئی چیز نہیں۔ کیا حضرت محمد مصطفےٰ ہی نے یہ بات ہم لوگوں کو خداوند عالم

کی طرف سے نہیں پہونچائی ہے؟
ابو قرہ نے کہا بے شک پیغمبر ہی نے یہ بتایا ہے۔
امام نے فرمایا
تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص خلائق کے پاس آئے اور کہے کہ میں خدا کے پاس سے آیا ہوں وہ لوگوں کو احکام خدا کی دعوت دے اور لوگوں سے کہے کہ لاتدرکہ الابصار خدا کو نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں اور لایحیطون بہ علماً خلائق اسکو جان نہیں سکتے پھر وہی شخص لوگوں سے کہے کہ میں نے اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے اُسے اچھی طرح جانا ہے وہ انسان کی صورت پر ہے کیا یہ شرمناک بات نہیں ایسی بات تو زندیقوں نے بھی نہیں کہی ہوگی۔
ابو قرہ نے کہا خداوند عالم کا یہ بھی تو ارشاد ہے ولقد راٰہ نزلۃ اخری
امام نے فرمایا اسی آیت کے بعد دوسری آیت ہے جو بتاتی ہے کہ پیغمبر نے خدا کو نہیں دیکھا ارشاد ہوتا ہے ماکذب الفواد مارای یعنی پیغمبر کے دل نے نہیں جھٹلایا اُن چیزوں کو جن چیزوں کو پیغمبر کی آنکھوں نے دیکھا۔ پھر خداوند عالم نے وضاحت فرمائی ہے کہ پیغمبر کی آنکھوں نے کیا دیکھا لقد رای من ایات ربہ الکبری اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کی نشانیاں اور چیز ہیں اور خود خدا اور چیز ہے۔ خداوند عالم کا تو ارشاد ہے ولایحیطون بہ علماً اسکا احاطہ علمی نہیں ہو سکتا اور جب آنکھیں اس کو دیکھ لیں گی تو احاطہ کرنے میں کیا کمی رہ جائے گی؟
اس مسئلہ میں معتزلہ بھی شیعوں کے پوری طرح ہمنوا ہیں اور یہ مسئلہ منجملہ اُن مسائل کے ہو جن میں معتزلہ نے محدثین اور اشاعرہ سبھی کی مخالفت کی ہے معتزلہ کے علاوہ بقیہ اہل سنت اس بات کے معتقد ہیں کہ خدا کا دیدار دنیا میں بھی ممکن ہے اور آخرۃ میں تو وہ بہر حال دیکھا ہی جائے گا۔
اہلسنت جو خدا کے دیدار کے قائل ہیں اپنے ثبوت میں کلام مجید کی بعض ایسی آیتوں کو پیش کرتے ہیں جن سے دیدار الٰہی کا وہم ہوتا ہے چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جناب موسیٰ نے خداوند عالم سے دیدار کی تمنا کی اور اگر دیدار ناممکن و محال ہوتا تو موسیٰ کا یہ فعل لغو ہوتا اور انبیا کرام سے لغو افعال کا صدور ناممکن ہے
نیز یہ کہ خداوند عالم نے جناب موسیٰ کے جواب میں فرمایا ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی تم پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ جما رہے تو تم ضرور دیکھ سکوگے اور جبکہ پہاڑ کا جما رہنا ناممکن نہیں تھا تو خدا کا دیکھا جانا بھی ناممکن نہیں ہے۔
حالانکہ یہ آیت اگر کسی چیز کو بتاتی ہے تو دیدار الٰہی کے ناممکن ہونے ہی کو بتاتی ہے نہ اس کے ممکن ہونے کو اس لئے کہ زلزلہ اور تزلزل کی حالت میں پہاڑ کا ٹھہرا رہنا عقلاً محال ہے کس کی عقل میں

یہ بات آئے گی کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں ہل بھی رہی ہو اور ساکن بھی۔

اہل سنت دیدار الٰہی کے امکان میں ایک اور آیت پیش کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے جنت والوں کی تعریف میں کہا ہے وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ شاداب چہرے اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ الی ربہا ناظرۃ کا مقصود ہی یہ ہے کہ خدا ضرور دکھائی دے گا کیونکہ جس چیز کی طرف نظر کی جائے گی وہ چیز حتماً دکھائی دے گی۔

حالانکہ کسی چیز کی طرف نظر کرنے سے یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز دکھائی بھی دے جائے۔

اشاعرہ کو اس پر بہت اصرار ہے کہ خداوند عالم بروز قیامت مومنین کو ضرور دکھائی دیگا۔ البتہ کفار محروم رہیں گے۔ اشاعرہ کے علاوہ وہ دیگر اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم کا دنیا و آخرۃ دونوں میں دکھائی دینا جائز ہے وہ لوگ تو اور بھی اس کے شدومد سے قائل ہیں جو کہتے ہیں کہ خداوند عالم جسم مرکب ہے جس طرح دیگر اجسام اعضاء وغیرہ سے مرکب ہوتے ہیں خدا نے اپنے لئے ایک خاص جگہ معین کر رکھی ہے وہ ہنستا بھی ہے اور اس طرح ہنستا ہے کہ اسکی ڈاڑھیں دکھائی دیتی ہیں۔

جبر و اختیار یا قضا و قدر

وہ لوگ جو انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ انسان جو کچھ کرتا ہے خود اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے خدا کو اس میں کوئی دخل نہیں ان لوگوں کو عام طور سے قدریہ کہا جاتا ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ افعال خواہ وہ نیک ہوں یا بد ان کا خالق اصل میں اللہ ہی ہے انھیں عام طور پر جبریہ کی لفظ سے یاد کیا جاتا ہے[ل]۔

انسان فاعل مختار ہے یا فاعل مجبور یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ ۱۳سو برس سے علماء و متکلمین کے درمیان موضوع بحث بنا ہوا ہے اور آج تک طے نہیں ہو سکا نہ علماء و محققین ایک رائے پر متفق ہو سکے۔

اکثر مصنفین کا خیال یہ ہے کہ شروع زمانہ اسلام میں جن لوگوں نے انسان کے فاعل مختار یا فاعلِ مجبور ہونے کی بحث اٹھائی اور اس بحث کو اٹھا کر مسلمانوں میں انتشار پھیلایا وہ نومسلم افراد تھے

ل قدریہ کی لفظ اصل میں اُن الفاظ میں سے ہے جو متضاد معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ قدریہ اُن لوگوں کو بھی کہا جاتا ہے جو انسان کے فاعل مختار ہونے کے قائل ہیں اور ان لوگوں کو بھی کہا جاتا ہے جو انسان کو فاعل مجبور مانتے ہیں مگر ہم اپنے مطلب کو عام فہم بنانے کے لئے قدریہ سے مراد اُن لوگوں کو لیں گے جو انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں اور جبریہ سے اُن لوگوں کو جو انسان کو فاعل مجبور مانتے ہیں ۱۲

جو اپنے پرانے دین و مذہب کو خیر باد کہہ کر نئے نئے دین اسلام میں داخل ہوئے اور اُن کے اسلام لانے کی غرض بھی یہ تھی کہ مسلمانوں میں انتشار پھیلائیں اور اُن کے ذہن و دماغ کو شکوک و شبہات سے بھر دیں۔

انسان مجبور پیدا ہوا ہے یہ نظریہ انسان کے فاعل مختار ہونے کے نظریہ کے مقابلہ میں زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہوا ستم پیشہ و جفا کار افراد اور حکام و سلاطین نے تو اس نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ پسند کیا کیونکہ اس نظریہ کو اختیار کرنے کی صورت میں ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر پڑتی تھی اور انھیں اپنے جور و ستم اور ہوس رانیوں کی کھلی چھوٹ مل جاتی تھی۔

حضرت سرور کائنات نے اس قسم کے مسائل میں جن میں پڑنے سے سوا حیرت و سرگشتگی کے اور کچھ نہیں حاصل ہو سکتا سختی سے ممانعت فرمائی تھی اور ایمان کی تعریف فرما دی تھی کہ الایمان ان تومن باللہ والیوم الاخر و ملائکتہ و رسلہ و تومن بالقدر خیرہ وشرہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ روز قیامت ملائکہ و مرسلین کا اعتقاد رکھو نیز مقدرات الٰہی پر خواہ خیر ہوں یا شر۔

مگر پیغمبر خدا کی ان سب تاکیدات کے باوجود آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلمان قضا و قدر کی الجھنوں میں پڑ گئے بعد وفات پیغمبر جب نئے نئے فتنے رونما ہوئے اور مسلمانوں کا دوسری قوموں سے میل جول ہوا جو پرانے ادیان و مذاہب کے حامل تھے اور تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے تو چونکہ ان نئے مسلمانوں کے ذہن و دماغ سے سابقہ مذاہب کے اثرات پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے عقائد و نظریات تھے جو ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر بعد میں بھی چھائے رہے اس لئے اُن کے میل جول سے عرب کے مسلمان بھی کافی حد تک متاثر ہوئے۔

حضرت علیؑ کے زمانہ کا واقعہ ہے آپ جب جنگ صفین سے واپس تشریف لا رہے تھے تو آپ کے انصار میں سے ایک شخص نے آپ سے سوال کیا

کیا ہمارا اہل شام سے لڑنے کے لئے جانا قضا و قدر سے تھا؟

امیر المومنین نے فرمایا خدائے وحدہ لاشریک کی قسم ہم جہاں گئے جس وادی میں اترے قضا و قدر الٰہی کے سبب ہی اُترے۔

اس وقت اس شخص نے عرض کی اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پھر ہم کسی اجر کے مستحق نہ ہوں گے۔

امیر المومنین نے فرمایا

ویحک لعلک ظننت قضاءً لازما وقدرا حاتما لو کان ذالک لبطل الثواب العقاب والوعد والوعید والامر والنھی ولم تات لائمۃ من اللہ لمذنب و محمدۃ لمحسن ولم یکن المحسن اولی بالمدح من المسی ولا المسی اولی بالذم من المحسن، تلک مقالۃ عباد الاوثان وجنود الشیطان وشھود الزور واھل العمی عن الصواب

وھم قدریۃ ھذہ الامۃ ومجوسھا

خدا تم پر رحم کرے تم شاید اس کا مطلب یہ سمجھے کہ قضا و قدر لازمی و حتمی ہے اگر ایسا ہوتا تو عذاب و ثواب غلط تھا جنت کا وعدہ جہنم کی دھمکی بیکار تھی نہ نیکوکار بدکار کے مقابلہ میں مدح و ستائش کا سزاوار ہوتا نہ بدکار نیکوکار کے مقابلہ میں مذمت کا حقدار یہ تو بتوں کی پرستش کرنے والوں شیطان کے پیروؤں مکر و فریب کے مجسموں بصیرت سے محروم اور راہ صواب سے برگشتہ لوگوں کا مقولہ ہے یہی لوگ اس امت کے قدریہ اور مجوس ہیں۔

اسی سلسلہ میں امیر المومنین نے فرمایا۔

ان اللہ امر تخییرا و نھی تحذیرا و کلف تیسیرا ولم یعص مغلوبا ولم یطع کارھا ولم یرسل الرسل الی خلقہ عبثاً والقضاء والقدر ھما الامر من اللہ والحکم وامر اللہ لا یوجب الجاء العبد وسلب الاختیار فاللہ سبحانہ یامرُ و یحکم وللعبد حریتہ وارادتہ فی الاطاعۃ والعصیان

بیشک خدا نے حکم دیا ہے مگر عمل میں اختیار دیا ہے اور روکا ہے مگر تنبیہ کے طور جبر کے طور پر نہیں اس نے سہل و آسان تکلیف دی ہے اسکی نافرمانی اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ بے بس ہو چکا ہے اور نہ اسکی اطاعت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس نے مجبور کر رکھا ہے اس نے رسول بیکار نہیں بھیجے

قضا و قدر سے مراد خدا کا امر اور حکم ہے لیکن خدا کے حکم دینے کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے بندہ کو مجبور کر دیا ہے اور اس کا اختیار چھین لیا ہے خداوند عالم امر فرماتا ہے حکم دیتا ہے لیکن بندہ کی آزادی باقی رہتی ہے کہ خواہ خدا کا حکم بجا لائے یا اس کے حکم کی نافرمانی کرے "

امیر المومنین کے ان فقروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قضا و قدر وہ اوامر و نواہی ہیں جو افعال سے متعلق ہیں خداوند عالم کے اوامر و نواہی کی وجہ سے بندہ اپنے اختیار و ارادہ سے محروم نہیں ہو جاتا۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے قضا و قدر سے مراد علم خداوندی ہے کہ بندہ کون کون سے نیک کام کرے گا کون کون سے بد کام

پیغمبر خدا کی یہ حدیث بھی مروی ہے کہ خداوند عالم نے آسمان و زمین کی خلقت سے پچاس ہزار برس پہلے مقدرات کی تقدیر فرما دی تھی۔

قضا کی لفظ کتاب الٰہی میں کئی معنوں میں مستعمل ہوئی ہے

کہیں علم کے معنوں میں جیسے الا حاجۃ فی نفس یعقوب قضاھا

کہیں اعلام و آگاہی کے معنوں میں جیسے وقضی اللہ ذالک الامر ان دابر ھولاء

کہیں حکم کے معنوں میں جیسے واللہ یقضی بالحق
کہیں حتم کے معنوں میں جیسے فلما قضینا علیہ الموت جب ہم نے اسکے لئے موت حتمی کردی
کہیں امر کے معنوں میں جیسے وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ
اسی طرح خلق فعل اور اتمام وغیرہ کے معنوں میں بھی یہ لفظ مختلف مقامات پر کلام مجید میں استعمال ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کے فاعل مختار یا فاعل مجبور ہونے کے مسئلہ میں مسلمان پوری طرح الجھے نت نئی رائیں انھوں نے ظاہر کیں اور مختلف طریقوں سے اُنھوں نے بحثیں کیں اتنی باتیں کہی گئیں کہ ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر اگر کوئی شخص کسی نتیجہ تک پہونچنا چاہے تو نہیں پہنچ سکتا۔ مورخین کا بیان ہے کہ قضا و قدر کے متعلق سب سے پہلے جس شخص نے لب کشائی کی وہ عراق کا ایک نصرانی تھا جو مسلمان ہو چکا تھا پھر دوبارہ نصرانی ہو گیا اور اسی نصرانی سے معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے اس عقیدہ کو حاصل کیا معبد جہنی نے انسان کے فاعل مختار ہونے کے نظریہ کی عراق میں تبلیغ کی اور غیلان دمشقی نے شام میں۔

معبد جہنی ایک طویل عرصہ تک عراق میں اس نظریہ کی تبلیغ و اشاعت کرتا رہا آخر میں یہ عبدالرحمان ابن اشعث کی بغاوت میں شریک ہو گیا جس نے بنی اُمیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا جب ابن اشعث کو شکست ہوئی تو دیگر قیدیوں کے ساتھ معبد جہنی بھی قید ہوا اور حجاج نے اُسے قتل کر ڈالا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خود عبدالملک نے اُسے قتل کیا۔

غیلان دمشقی شام میں اس نظریہ کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم تھا اس میں اور عمر بن عبدالعزیز میں اس مسئلہ پر بہت سے مناظرے ہوئے اور عمر ابن عبدالعزیز کامیاب بھی ہو گئے تھے اور غیلان نے اُن سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں اپنے اس نظریہ کو ترک کر دوں گا اسی کے نتیجہ میں عمر نے اس کے ذمہ یہ خدمت تفویض کی کہ بنی امیہ کے خزانوں میں جو قیمتی تحفے اور ذخیرے ہیں انھیں فروخت کر ڈالو اس نے یہ خدمت قبول کر لی اور اسی سلسلہ میں اس نے گذشتہ زمانہ کے بنی امیہ کو خوب گالیاں دیں انھیں بُرا بھلا کہا کہ ان لوگوں نے غریبوں کا حق مار کر یہ چیزیں اپنے خزانوں میں بند کر رکھی تھیں ہشام بن عبدالملک اسی وقت سے اسکے خلاف کینہ رکھنے لگا تھا جب خود خلیفہ ہوا تو اس نے اسے بھی بلایا اور امام اوزاعی فقیہ شام کو بھی تاکہ اسکے سامنے مسئلہ قدر پر مناظرہ کریں جب اوزاعی نے اُسے لاجواب کر دیا تو ہشام نے پہلے اس کے ہاتھ پیر کٹوائے پھر اُسے قتل کر ڈالا۔

ابن نباتہ کی روایت میں ہے کہ جب عمر ابن عبدالعزیز کو غیلان کے خیالات مسئلہ قدر کے متعلق معلوم ہوئے تو اس کو بلا کر پوچھا تم اس مسئلہ میں کیا کہتے ہو غیلان نے کہا میں وہی کہتا ہوں جو اللہ نے کہا ہے عمر نے پوچھا اللہ نے کیا کہا ہے؟

غیلان نے کہا اللہ نے کہا ہے ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا اسی سلسلہ میں وہ اس آیت تک پہونچا انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا عمر نے کہا اور پڑھو جب وہ اس آیت پر پہونچا وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ تو عمر نے کہا گدھی کے بچے شاخ لے لیتے ہو اور جڑ چھوڑ دیتے ہو۔

عبدالرحیم خیاط اپنی کتاب الانتصار میں لکھتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے غیلان سے کہا تمہارے متعلق لوگ بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں تم اپنے دلائل ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر وہ دلائل ٹھیک ہوں گے تو ہم بھی تمہارے ہم خیال ہو جائیں گے ورنہ تم اس عقیدے سے باز آجانا چنانچہ ہشام نے میمون بن مہران کو غیلان سے مباحثہ کرنے کے لئے بلا بھیجا غیلان نے میمون سے سوال کیا کیا خدا خود یہ چاہ سکتا ہے کہ اسکی نافرمانی کی جائے۔ میمون نے کہا کیا خدا کو کوئی بے بس و مجبور کرکے اسکی نافرمانی کرسکتا ہے؟ غیلان سے اس کا کوئی جواب بن نہ پڑا اس پر ہشام نے اس کے ہاتھ پیر کٹوا ڈالے (کتاب الانتصار لابن الخیاط ص ۱۳۹)

رہ گئے وہ لوگ جو اس کے قائل ہیں کہ انسان فاعل مجبور ہے انھیں لوگوں کو جبریہ کہا جاتا ہے پیغمبر خدا نے اُن لوگوں کو امت مسلمہ کا مجوس فرمایا ہے۔ ایک شخص پیغمبر خدا کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے ایران کے (مجوسی) لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں بہنوں سے نکاح کرتے ہیں اور جب اُن سے اُسکے متعلق بات کی جاتی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تو قضا و قدر الٰہی ہے۔ پیغمبر نے فرمایا ہماری امت میں بھی عنقریب ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اسی مقولہ کے قائل ہوں گے اور یہی لوگ اس امت کے مجوسی ہیں۔

مورخین کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی دعوۃ دی وہ جعد بن درہم ہے جو بنی حکم کا آزاد کردہ غلام تھا اس کی سکونت شام کی تھی اور وہاں اس کا ملنا جلنا یہودیوں سے ہوا کرتا عقیدہ جبر اس نے انھیں یہودیوں سے لیا اس نے بنی اُمیہ کی ملازمت اختیار کی ان کے بچوں کی اتالیقی کرتا تھا۔ جہم بن صفوان جو بعد میں اس عقیدہ کا سب سے بڑا مبلغ ثابت ہوا اس اسی جعد بن درہم سے اس عقیدہ کو حاصل کیا تھا۔

یہ عقیدہ جبر خلفاء و سلاطین کو دل سے پسند آیا کیونکہ اس عقیدہ کی وجہ سے ساری ذمہ داری اللہ پر جا پڑتی تھی اور انسان بے داغ چھوٹ جاتا تھا اور اُسے ہر طرح کے ظلم و زیادتی ہوا و ہوس اور عیش کوشیوں کی چھوٹ مل جاتی تھی

علامہ ابن قتیبہ لکھتے ہیں کہ عطا بن یسار اُمویوں کی طرف سے عہدہ قضا پر فائز تھا اور عقیدۃً معبد جہنی کا ہم خیال تھا (یعنی انسان کو فاعل مختار مانتا تھا) یہ حسن بصری کے پاس آیا اور کہا یہ

حکام و سلاطین جی کھول کر قتل و غارت کرتے ہیں خون بہاتے ہیں لوگوں کا مال و متاع چھین لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں قضا و قدر الٰہی کے سبب حسن بصری نے کہا یہ دشمنان خدا جھوٹے ہیں اس عقیدہ جبر کو بڑا فروغ حاصل ہوا تقریباً سبھی مسلمان اسی عقیدہ کے حامل ہوئے بہت ممکن ہے کہ اس عقیدہ کی ترویج و اشاعت میں حکام کا بھی ہاتھ رہا ہو۔

عراق و خراسان میں اس عقیدہ کی تبلیغ جہم بن صفوان نے کی جو شریح بن حارث کا میر منشی تھا۔ بنی امیہ کے آخری زمانہ میں مسلم بن احوز مازنی نے اسے قتل کیا اسکے مرنے پر اس کے پیرو نہاوند چلے گئے نہاوند میں ایک عرصہ تک یہ مذہب باقی رہا یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ابو منصور ماتریدی نے ظہور کیا ابو منصور ان جہمیوں پر غالب آگیا اور انہی کا مذہب ان شہروں میں رواج پا گیا (مذاہب اسلامیہ ابوزہرہ ص۱۰۵ ملل و نحل جلد اول ص۱۱۳)

میرا خیال ہے کہ جہم بن صفوان اگرچہ اس عقیدہ جبر کا بہت بڑا مبلغ اور داعی تھا اور اپنے زمانہ میں اس نے اس عقیدہ کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جہم سے پہلے کے مسلمان اس عقیدہ سے بالکل ہی کورے تھے اس لئے کہ مسلمان سب سے زیادہ جس چیز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو سب سے بڑا مرجع ہے ان کا وہ ہے قرآن مجید اور قرآن مجید میں ایسی بھی آیتیں ہیں جن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انسان فاعل مجبور ہے اور ایسی بھی جن سے خیال ہوتا ہے کہ انسان فاعل مختار ہے اس لئے کہ دونوں مسلک کے افراد اپنے اپنے عقیدہ کی تائید میں کلام مجید ہی کے آیات سے کام لیتے ہیں مزید برآں پیغمبر خدا اور اصحاب کے زمانہ میں بھی مسلمانوں میں کئی ایسے افراد کا پتہ چلتا ہے کہ جبر و اختیار کی کھٹک ان کے دل میں پیدا ہوئی اور انھوں نے پیغمبر خدا کی طرف رجوع کیا اور آپ سے اصل حقیقت دریافت کی۔

ہم ابھی وہ حدیث بیان کر چکے ہیں کہ ایک شخص نے پیغمبر خدا کے سامنے ایران کے مجوسیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کرتے ہیں جس پر پیغمبر نے فرمایا عنقریب ہماری امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے اور وہی لوگ۔ اس امت کے مجوسی ہیں۔

حضرت علی کے ایک ساتھی کا واقعہ بھی ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ اس نے جنگ صفین سے واپسی کے موقع پر پوچھا تھا کہ یہ جو ہم لوگ لڑنے کے لئے نکلے تھے تو قضا الٰہی کے تحت نکلے یا بغیر اسکے۔

اسی طرح ابن عباس کے متعلق بھی روایات میں ملتا ہے کہ انھوں نے شام کے جبریہ والوں کو خطاب کر کے کہا تھا۔

"کیا تم دوسروں کو تقویٰ کا حکم دیتے ہو حالانکہ متقین تمہاری ہی وجہ سے گمراہ ہوئے تم معاصی سے روکتے ہو حالانکہ تمہاری ہی وجہ سے خطا کاروں کو شہ ملی۔ اے گذشتہ زمانہ کے منافقین کی اولاد

ظالموں کے مددگار تم میں جو ہے وہ خدا پر تہمت دھرنے والا ہے تاکہ اپنے سارے کرتوتوں کی ذمہ داری اللہ پر ڈال دے۔

اس قسم کی روایتیں بتاتی ہیں کہ عقیدہ جبر صفوان جہمی کی دماغی اپج نہ تھی اور نہ وہی اس عقیدہ کا موجد تھا بلکہ یہ عقیدہ مسلمانوں کے ذہن میں صفوان کے بہت پہلے سے تھا لیکن اس عقیدہ کے حاملین اس کی ترویج و اشاعت کے لئے مددگار نہیں پاتے تھے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مسئلہ میں علماء و محققین کے درمیان اتنا زبردست اختلاف ہوا جتنا شاید ہی کسی مسئلہ میں ہوا ہو ہر فریق اپنے عقیدے و نظریہ کا بہت سختی سے قائل ہے یہاں تک کہ اپنے نظریہ کے خلاف دوسرے نظریہ کو کفر و گمراہی سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے فریق کو کافر قرار دیتا ہے۔ جبریہ والے جو بندہ کو فاعل مجبور مانتے ہیں ان لوگوں کے بالکل ضد ہیں جو بندہ کو فاعل مختار مانتے ہیں اس لئے کہ جبریہ والوں کے نزدیک انسان ایک تنکے جیسا ہے جو ہوا کے مقابل ہو ہوا جس طرح چاہتی ہے الٹتی پلٹتی رہتی ہے اور جہاں چاہتی ہے اڑائے جاتی ہے اسطرح انسان اپنے کسی فعل کسی تصرف کا مالک نہیں۔ قدریہ والے یعنی جو بندہ کو فاعل مختار مانتے ہیں کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے کو پورا اختیار سونپ دیا وہ ان کے کسی کام میں دخل نہیں دیتا

اشاعرہ جو ابوالحسن اشعری کے پیرو ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ بندوں یا حیوانات سے صادر ہوتا ہے خواہ خیر خواہ شر خواہ کفر خواہ ایمان خواہ اطاعت و معصیت یہ سب خدائے تعالیٰ کا پیدا اور ایجاد کیا ہوا ہے بندے کو اس کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں البتہ کسب اور عمل اس کا بندہ سے ہوتا ہو کہ اسی اپنے کسب و عمل کی بدولت جزا پاتا ہے۔ (ہدیہ مجیدیہ ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ شاہ عبدالعزیز دہلوی ص۲۸)

معتزلہ اس مسئلہ میں قدریہ کے ہمنوا ہیں یعنی انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے افعال میں اللہ کو کوئی دخل ہی نہیں شذرات الذہب میں ہے کہ فرقہ معتزلہ کے باوا آدم واصل بن عطا کے اصحاب اللہ کو قادر ہی نہیں مانتے تھے اُن کا نظریہ یہ تھا کہ جو کچھ کرتے ہیں بس بندے کرتے ہیں (شذرات الذہب لابن عماد حنبلی جلد اول ص۱۸۳)

یہ واصل قضاو قدر کے مسئلہ میں پوری طرح معبد جہنی کا پیرو تھا اسی لئے اس کی طرف اعتزال کی نسبت بھی دی گئی ہے کیونکہ اس نے اس مسئلہ میں جمہور فقہائے اہل سنت کے خیالات سے کنارہ کشی کرکے معبد جہنی کی رائے اختیار کی تھی (التبصیر فی الدین ص۶۴ فجر الاسلام ص۲۹۵ شذرات الذہب جلد ۱ ص۱۸۳)

اشاعرہ سے ملتا جلتا ایک اور فرقہ ہے فرقہ ماتریدیہ یعنی محمد بن محمود معروف بہ ابی منصور ماتریدی حنفی کے پیرو۔ اس ابو منصور نے ماوراء النہر اور سمرقند وغیرہ کی طرف فقہ حنفی کی ترویج و اشاعت کی یہ ابوالحسن اشعری کا ہم عصر تھا اور دونوں ہی معتزلہ کے حریف تھے سوا اس کے کہ اشعری بصرہ میں

رہتا تھا جو فرقہ اعتزال کا مرکز تھا اور ماتریدی ما ورار النہر رہا۔ اشعری اور ماتریدی دونوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز سے معتزلہ کی مخالفت اور اُن کے نظریات و افکار کی تردید کی۔ سوا اس کے کہ ابو منصور نے بہت سے مسائل میں عقل کی اہمیت کو بھی مانا اور تسلیم کیا کہ بہت سی باتوں میں اسے بھی کافی دخل حاصل ہے چنانچہ حسن و قبح کے عقلی ہونے میں یہ معتزلہ کا ہمنوا ہے۔ بس فرق ہے تو صرف اتنا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل جس چیز کو حسن قرار دے وہ بحکم عقل واجب ہے اور جس چیز کو قبیح قرار دے وہ حرام ہے۔ ماتریدی کا کہنا ہے کہ کسی چیز کو حرام قرار دینا یا حلال کرنا یہ شریعت کا فریضہ ہے عقل ہی تنہا کافی نہیں۔ ابو الحسن اشعری محدثین و فقہا کا ساتھ دیتے ہوئے اس کے قائل ہیں کہ کوئی چیز ذاتی طور پر نہ حسن ہے نہ قبیح جب تک کہ شریعت اسے حسن یا قبیح نہ کہے۔

جبر و اختیار کے مسئلہ میں یہ ماتریدی اشعری اور محدثین کا طرفدار ہے مگر تھوڑے سے فرق کے ساتھ ماتریدی کا مسلک یہ ہے کہ اس عالم وجود میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں یہ کہنا کہ دوسرا بھی کوئی پیدا کر سکتا ہے صریح شرک ہے لیکن اگر چہ کہ سارے افعال اللہ کے پیدا کردہ ہیں مگر خداوند عالم نے بندہ کو اس بات کی قدرت بخشی ہے کہ وہ اللہ کے پیدا کردہ فعل کو اختیار کرے اور اسی اللہ کی دی ہوئی قدرت کے سبب بندہ اس پر بھی قادر ہے کہ خدا کے خلق کردہ فعل کا کسب کرے اور اس پر بھی قادر ہے کہ نہ کسب کرے تو بندہ کو اس کسب میں پورا اختیار حاصل ہے اور اسی کسب کے سبب وہ ثواب و عقاب کا مستحق ہوتا ہے۔

فرقہ جبریہ والے جو اس کے قائل ہیں کہ افعال کا خالق اللہ ہی ہے اپنے مسلک پر حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) بندہ کا فعل بھی اللہ کی قدرت و اختیار کی چیز ہے اس لئے کہ اسکی قدرت تمام کائنات کو شامل ہے اور جو چیز اللہ کی قدرت و اختیار کی ہو گی ضروری ہے کہ تن تنہا اللہ کی قدرت سے واقع ہو ورنہ اگر بندہ کی قدرت سے واقع ہو گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ کی قدرت معطل ہو گئی اور اگر یہ کہا جائے کہ دونوں کی قدرت سے وہ چیز واقع ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کے لئے دو دو موثر اپنا اپنا کام کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کے اللہ کی قدرت و اختیار میں داخل ہونے سے یہ ضروری نہیں کہ اللہ اسکو عمل میں بھی لائے ہر وہ چیز جو اسکی قدرت میں داخل ہے کب ضروری ہے کہ وہ اسکو کرے بھی۔

دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اگر انسان اپنے افعال پر قادر اور ان کا موجد ہو گا تو ایک ہی مقدور پر دو دو قادروں کا اجتماع لازم آئے گا اس لئے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے لہذا اگر بندہ بھی قادر ہو گا تو دو دو قدرتیں اکٹھا ہو جائیں گی اس صورت میں اگر بندہ کوئی کام کرنا چاہے اور اللہ چاہے کہ

یہ کام نہ ہو تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو دونوں کی مرضی پوری ہو گی جو ناممکن ہے یا ایک کی پوری ہو گی ایک کی نہیں اس صورت میں ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ ہی کی مرضی پوری ہو گی اس لئے کہ اس کی قدرت بندہ کی قدرت سے زیادہ قوی ہے ایک اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اگر انسان کو فاعل مختار مان لیا جائے تو جس طرح وہ ہر کام کر سکتا ہے اسی طرح ایمان کو بھی وجود میں لا سکتا ہے اس صورت میں بندوں کے بعض افعال اللہ کے افعال سے بہتر نکلیں گے اللہ نے سور اور بندر کو پیدا کیا اور بندہ نے ایمان کو اور ایمان بندر اور سور سے بہتر ہے۔

معتزلہ اپنے اس مسلک پر کہ انسان فاعل مختار ہے اور جو کچھ کرتا ہے خود کرتا ہے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر وہ اعمال و افعال جو بندے کرتے ہیں خدا کے افعال ہوں جیسا کہ جبریہ و اشاعرہ کا عقیدہ ہے تو بندوں کے گناہ کرنے پر سزا دینا خدا کا ظلم ہو گا حالانکہ خدا ظالم نہیں بلکہ وہ تو ظالموں پر لعنت کرتا ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ خود خدا ایک گناہ اپنے بندے سے کرائے اور پھر اس بندہ کو سزا دے اور مواخذہ کرے کہ کیوں تو نے یہ گناہ کیا۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ عقیدہ درست ہو تو پیغمبر کا بھیجنا اور شریعتوں کا مقرر کرنا سب بے کار اور لغو ہو جائے گا جب خدا ہی بندوں کے ہر فعل کو کرتا ہے تو لوگوں کو یہ حکم دینا کہ پیغمبر کی اطاعت کرو اللہ کے احکام مانو نماز روزہ بجا لاؤ چوری شراب خوری سے بچو سب مہمل ہو جائے گا۔

معتزلہ ان دلیلوں کے علاوہ کلام مجید کی بہت سی آیتیں بھی اپنے مسلک پر پیش کرتے ہیں جو بتاتی ہیں کہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے ان میں بہت سی آیتیں صریحی طور پر بتاتی ہیں کہ افعال کا صدور انسان ہی سے ہوتا ہے جیسے

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا فویل لھم مما یکسبون پس ویل ہو ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے پھرتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت (دنیوی فائدہ) حاصل کر لیں پس افسوس اُن پر کہ اُن کے ہاتھوں نے لکھا اور پھر افسوس ہے اُن پر کہ وہ ایسی کمائی کرتے ہیں (پارہ ۱ ع ۱۹)

ذلک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم وان اللہ سمیع علیم یہ سزا اس وجہ سے دی گئی ہے کہ جب کوئی نعمت خدا کسی قوم کو دیتا ہے تو تاوقتیکہ وہ لوگ خود اپنی حالت نہ بدلیں خدا بھی اُسے نہیں بدلتا فطوعت لہ نفسہ قتل اخیہ فقتلہ قابیل کے نفس نے قابیل کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کیا اور قابیل نے ہابیل کو

قتل کر ڈالا۔

کل امرئ بما کسب رھین ہر شخص اپنے اعمال کا اسیر ہے۔

اسی طرح بہت سی آیتیں بتاتی ہیں کہ اطاعت گزار اپنے اچھے اعمال کی جزا پائے گا اور گنہ گار اپنی نافرمانی کی سزا پائے گا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے الیوم تجزی کل نفس بما کسبت آج کے دن ہر نفس اپنے کئے کی جزا پائے گا۔ الیوم تجزون بما کنتم تعلمون آج کے دن تم اپنے ان تمام کاموں کا بدلہ پاؤگے جو تم کرتے رہے۔ من جاء بالحسنة فلہ عشر امثالھا و من جاء بالسیئة فلا یجزی الا مثلھا جو نیک کام کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو شخص برا کام کرے گا ویسا ہی اُس کو بدلہ دیا جائے گا۔

اسی طرح بعض آیتوں سے صریحی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے کوئی دوسری طاقت اُسے عمل پر مجبور نہیں کرتی جیسے ارشادِ الٰہی ہے فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے اعملوا ما شئتم فمن شاء منکم ان یتقدم او یتاخر جو چاہو کرو تم میں سے جو شخص نیکی کی طرف آگے بڑھنا اور برائی سے پیچھے ہٹنا چاہے خواہ آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے۔

دوسری بہت سی آیتوں میں خود انسان کا اعتراف و اقرار مذکور ہے کہ اس نے جتنے گناہ کئے خود اپنے اختیار و ارادہ سے کئے ورنہ اگر وہ خدا کا فعل ہوتے تو گنہ گاروں کو بڑی گنجائش تھی کہ جب اللہ ان کے اعمال بد کا حساب لینے لگتا تو وہ خدا پر اپنی حجت قائم کرتے کہ ہماری خطا ہی کیا ہے ارشاد ہوتا ہے ما سلککم فی سقر قالوا لم نک من المصلین و لم نک نطعم المسکین و کنا نخوض مع الخائضین و کنا نکذب بیوم الدین آخر تمہیں دوزخ میں کونسی چیز گھسیٹ لائی وہ لوگ کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے نہ محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے اور اہل باطل کے ساتھ ہم بھی برے کاموں میں گھس پڑتے تھے اور روز جزا کو جھٹلایا کرتے تھے کلما القی فیھا فوج سألھم خزنتھا الم یاتکم نذیر قالوا بلیٰ قد جاءنا نذیر فکذبنا و قلنا ما انزل اللہ من شئی ان انتم الا فی ضلال مبین جب اس میں اُن کا کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو اُن سے داروغہ جہنم پوچھے گا کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا وہ کہیں گے ہمارے پاس ڈرانے والا تو ضرور آیا تھا مگر ہم نے اُسکو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کچھ نہیں نازل کیا تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو۔

اسی طرح کی اور بہت سی آیتیں ہیں جنکا مفہوم اور لازمی معنی بتاتا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے خود کرتا ہے وہی اپنے اعمال کا خالق اور موجد ہے

اشاعرہ اور فرقہ جبریہ والے جو انسان کو فاعل مجبور مانتے ہیں وہ بھی اپنے مسلک کی تائید میں

کلام مجید کی بہت سی آیتیں پیش کرتے ہیں۔ جیسے کلام مجید کی یہ آیت واللہ خلقکم وما تعملون اللہ ہی نے تمہیں اور تمہارے کاموں کو پیدا کیا۔ ومن یرد اللہ ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا جو خدا جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو انتہائی تنگ بنا دیتا ہے یضل من یشاء و یھدی من یشاء خدا ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسکی چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں کہ اگر ہم ان کو سطحی اور سرسری نظر سے دیکھیں اور قرائن وغیرہ کو نظر انداز کر دیں تو اُن سے اشاعرہ ہی کی تائید ہوتی ہے لیکن ان آیات پر پوری طرح غور و فکر کر لے اور جس موقع و محل اور مناسبت سے یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کو گہری نظر سے دیکھنے پر مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور ان آیتوں سے اشاعرہ کے مسلک کی قطعی تائید نہیں ہوتی۔

مزید برآں وہ آیتیں جو ان آیتوں کے معارض ہیں اور جن میں انسان کے فاعل مختار ہونے کی صراحت ہے وہ تعداد میں بھی بہت زیادہ ہیں اور ان کا مفہوم بھی پوری طرح واضح ہے۔

اور اگر ہم دونوں طرح کی آیتوں سے قطع نظر کر لیں اور فرض کر لیں کہ دونوں طرف برابر کی آیتیں ہیں تب بھی ہمیں ان آیتوں کی لازمی طور پر تاویل کرنا پڑے گی جن سے اشاعرہ کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ وہ آیتیں جن میں انسان کے فاعل مختار ہونے کا ذکر ہے ان کی مؤید عقل بھی ہے اور وجدان بھی اور عقل و وجدان دونوں کا فیصلہ ہے کہ انسان ہی اپنے اعمال کا خالق ہے۔ ہر انسان اچھی طرح جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تو وہ کام اسکے ارادہ و اختیار کے مطابق ظہور میں آ کر ہی رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ اشاعرہ وجہمیہ وغیرہ جو انسان کو فاعل مجبور مانتے ہیں وہ صرف وجدان اور عقل ہی سے مخالف نہیں بلکہ انھوں نے اللہ پر بھی زیادتی کی اور یہ کہہ بیٹھے کہ اللہ اپنے بندوں پر جور و ظلم کرتا ہے حالانکہ خداوند عالم نے ظالموں پر لعنت کی ہے ظالموں اور زیاں کاروں کو عذاب و عقاب کی دھمکی دی ہے بھلا اس سے بڑھ کر قبیح و شرمناک ظلم کیا ہوگا کہ خداوند عالم اپنے بندوں کو ایسے کام پر سزا دے جس کا کرنے والا خود خدا ہے۔

لہذا اگر ہم مان بھی لیں کہ وہ آیتیں جنھیں اشاعرہ اور جہمیہ والے اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتے ہیں ان کا مطلب و مفہوم واضح ہے ان میں کوئی پیچیدگی نہیں تب بھی ہمیں ان آیات کی ایسی تاویل لازمی طور پر کرنا پڑے گی جو عدالت و لطف خداوندی کے مناسب ہو نیز عقل کے بھی موافق ہو جو ایک انسان کے دوسرے انسان پر ظلم کرنے کو منع کرتی ہے چہ جائیکہ خود اللہ تعالیٰ ظلم کرے۔

اسی طرح معتزلہ بھی اپنے مسلک پر جو آیتیں پیش کرتے ہیں وہ بھی پوری پوری انکی مؤید نہیں۔ معتزلہ معبد جہنی اور غیلان دمشقی کے پیرو ہیں اور یہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ انسان کو اپنے

افعال و اعمال میں اختیار مطلق حاصل ہے اور یہ آیتیں زیادہ سے زیادہ یہ بتاتی ہیں کہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ خود کرتا ہے اسی سے اس کے تمام اعمال صادر ہوتے ہیں مگر یہ کہ اللہ نے سب کچھ بندوں کے حوالے کر دیا ہے اور اب اسے خود کسی بات کی قدرت نہیں رہی تو یہ ان آیات سے ہرگز نہیں ثابت ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اشاعرہ اور جہمیہ کا مسلک جس قدر شرمناک ہے اس سے کم معتزلہ کا مسلک شرمناک نہیں جنھوں نے اللہ سے قدرت و اختیار ہی سلب کر لیا ہے اور اللہ کی حیثیت اُن کے نزدیک ایک معزول بادشاہ کی ہو کر رہ گئی ہے۔

شیعہ امامیہ جو تمام اسلامی فرقوں سے قدیم ترین اور اولین اسلامی فرقہ ہے نہ تو پوری طرح معتزلہ کا ہمنوا ہے نہ اشاعرہ کا۔ شیعوں نے درمیانی راہ اختیار کی ہے اُن کا نظریہ یہ ہے کہ انسان ہے تو اپنے افعال کا خود موجد جو کچھ کرتا ہے خود کرتا ہے مگر اللہ کی دی ہوئی قدرت کے سبب۔ خداوند عالم کی اسی عطا کردہ قدرت کے سبب اور دواعی و اسباب کے موجود ہونے اور کسی رکاوٹ کے نہ ہونے کے سبب اس سے کسی فعل کا صدور ہوتا ہے اور اسکی طرف فعل کی نسبت دی جاتی ہے۔ اس صورت میں انسان کو مجبور نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ خداوند عالم نے اسے جو قدرت بخشی ہے اس کا تعلق صرف کرنے یا نہ کرنے ہی سے نہیں بلکہ اس قدرت کی نسبت دونوں سے برابر کی ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے۔

اسی طرح اس فعل کی نسبت محض اس وجہ سے کہ اس نے انسان کو کرنے یا نہ کرنے کی قدرت بخشی ہے اللہ کی طرف بھی نہیں دی جا سکتی اس لئے کرنے یا نہ کرنے پر اس کی دی ہوئی قدرت فعل کے وجود میں آنے یا نہ آنے کا مکمل سبب نہیں مثال کے طور پر یوں سمجھا جائے کہ ہم کسی شخص کو کچھ روپے دیں اور اسکو خرچ کرنے کی اجازت بھی دیدیں تو اگر وہ شخص اس روپئے کو حرام کاموں میں صرف کر دے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ ہوگا کہ وہ حرام کام اس نے ہماری وجہ سے کیا ہم نے تو محض اسے روپے دئے اور خرچ کرنے کی اجازت دی اب جو اس نے اسکو بجائے حلال کاموں میں صرف کرنے کے ناجائز کاموں میں صرف کیا تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔

مختصر یہ کہ اس مسئلہ میں شیعہ امامیہ کا خود ایک مستقل مذہب ہے تمام اسلامی فرقوں سے الگ جہمیہ اور اشاعرہ افعال کی نسبت اللہ کی طرف دیتے ہیں اُن کے نزدیک بندوں کو اُن کے ایجاد میں کوئی اثر نہیں۔

معتزلہ اور قدریہ وغیرہ کہتے ہیں کہ بندوں کے کاموں میں اللہ کو کوئی دخل ہی نہیں خود انسان جو چاہتا ہے کرتا ہے انھوں نے ترقی کر کے خداوند عالم کے علم ازلی و ارادہ ازلی تک کی نفی کر دی ہے

اکٹھا کرنا مقصود نہیں ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے اسلامی فرقوں اور شیعہ امامیہ کے نظریہ میں کس حد تک مناسبت ہے۔ اس لحاظ سے کہ معتزلہ افعال کی نسبت بندوں کی طرف دیتے ہیں وہ شیعوں سے قریب تر ہیں کیونکہ شیعوں کا مسلک یہی ہے کہ افعال انسانی عمل سے اللہ نے انسان کو کرنے اور نہ کرنے کی قدرت بخشی ہے اچھا یا برا دونوں انسان کے اختیار و پسند سے ظہور میں آتا ہے اور اللہ نے انسان کو جو قدرت بخشی ہے اس کا تعلق دونوں پہلوؤں سے برابر کا ہے یعنی کرنے کی بھی قدرت اور نہ کرنے کی بھی قدرت۔

خدا کا درود و سلام ہو امیر المومنین پر آپ نے ایک شخص کا جواب دیتے ہوئے جس نے توحید و عدل کے متعلق آپ سے سوال کیا تھا فرمایا۔

"توحید یہ ہے کہ تم اس کے متعلق وہم نہ کرو اور عدل یہ ہے کہ تم اس پر تہمت نہ دھرو جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ اللہ ہی تمام افعال کا خالق ہے اس نے اس پر ظلم کی تہمت دھری اور جو اس کا قائل ہو کہ خداوند عالم ناقابل برداشت کاموں کی تکلیف بندوں کو دیتا ہے اس نے خدا کی طرف قبیح کی نسبت دی جس شخص نے یہ کہا کہ اللہ بندوں کے اعمال پر قادر نہیں اور بندوں کے سارے اعمال خود اُن کے ارادے سے ہوتے ہیں اللہ کو کوئی دخل نہیں اُس نے اللہ کو عاجز قرار دیا۔"

سلیمان بن جعفر جعفری نے روایت کی ہے کہ امام رضاؑ سے کسی شخص نے جبر و تفویض کے متعلق سوال کیا امام نے فرمایا

"خداوند عالم کی جبری طور پر اطاعت نہیں کی گئی یعنی خداوند عالم نے بندوں کو ایسا مجبور نہیں بنایا کہ وہ ضرور ہی اسکی اطاعت کریں اور نہ اسے بے بس و لاچار سمجھ کر اسکی نافرمانی کی گئی اس نے اپنی مملکت میں اپنے بندوں کو بے نکیل نہیں چھوڑ دیا خداوند عالم ان تمام چیزوں کا مالک ہے جس کا اس نے اپنے بندوں کو مالک بنایا ہے اور ان تمام باتوں پر قادر ہے جن پر اس نے بندوں کو قدرت بخشی ہے اگر بندہ خدا کی اطاعت گزاری کرے تو اللہ اُسے اُس اطاعت سے باز نہ رکھے گا نہ مانع ہوگا اور معصیت کرے تو اللہ چاہے تو اسکے اور اسکے فعل میں حائل ہو جائے اور چاہے تو نہ حائل ہو اور بندہ اس معصیت کا ارتکاب کر بیٹھے اور اگر وہ معصیت کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسکا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ اللہ ہی نے اسے اس معصیت کے کام میں ڈالا۔"

یہ روایت بتاتی ہے کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کو انکے کاموں پر قدرت بخشی ہے اس طرح یہ بھی بتاتی ہے کہ بندے اپنے افعال میں مختار ہیں اور بندے اگر برے کام پر آمادہ ہوں تو بھی قدرت رکھتے ہوئے بھی کہ چاہے تو انھیں نہ کرنے دے روکتا نہیں تاکہ وہ اپنے افعال و اعمال میں مجبور نہ ٹھہریں۔

حسن و قبح

اشاعرہ اور فقہا و محدثین اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ قبیح وہ ہے جو شرعاً ممنوع ہو اور حسن وہ ہے جس کے متعلق شارع کی طرف سے ممانعت نہ وارد ہو خواہ شارع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہو یا نہ دیا ہو۔

شیعہ امامیہ اور معتزلہ کی اکثریت اس کی قائل ہے کہ بہت سی چیزیں ذاتی طور پر حسن ہوتی ہیں خواہ اس کے متعلق کوئی حکم شرعی وارد ہو یا نہ ہو جیسے سچ بولنا اور دوسرے کے ساتھ نیکی کرنا اور بعض چیزیں ذاتی طور پر قبیح ہوتی ہیں اور اُن کا کرنے والا مذمت و ملامت کا حقدار ہوتا ہے جیسے جھوٹ بولنا ظلم و زیادتی کرنا ان کاموں کو دنیا بھر کے اہل عقل و خرد برا سمجھتے ہیں خواہ شرعاً اس کے متعلق کوئی ممانعت وارد ہو یا نہ ہو۔

اگر کسی چیز کا اچھا ہونا یا کسی چیز کا بُرا ہونا شارع کے حکم یا منع کرنے ہی پر موقوف ہوتا تو وہ لوگ جو کسی مذہب کے پابند نہیں سچائی اور نیکی کو اچھا اور کذب و ظلم کو برا نہ قرار دیتے۔

مزید برآں اشاعرہ کے نظریہ کی بنا پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کفر اختیار کرنے اور انبیا کو جھٹلانے کا حکم دے اچھے لوگوں کو جہنم میں جھونک دے اور گنہ گاروں کو جنت میں بھیج دے یا انبیا و مرسلین کو دوزخ میں ڈال دے اور شیطان کو بہشت کا سردار بنا دے کیونکہ جب حسن و قبح کا دار و مدار شریعت ہی کا حکم یا شریعت ہی کا منع کرنا ٹھہرا تو اگر خدا ایسا کرے تو لامحالہ اس کو حسن ماننا پڑے گا اور اگر وہ سچ بولنے امانت ادا کرنے یتیموں پر احسان کرنے سے منع کر دے تو لازمی طور پر یہ سب باتیں قبیح ہوں گی۔

اشاعرہ اپنے مسلک پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان فاعل مجبور ہے وہ اپنے افعال میں مختار نہیں اور جب انسان کے افعال اس کے اختیار کی چیزیں نہیں تو پھر انھیں حسن یا قبیح کہنا بھی غلط ہوگا۔

نیز یہ کہ اگر افعال ذاتی طور پر حسن یا قبیح ہوں جیسے سچ بولنا بجائے خود حسن ہو جھوٹ بولنا بجائے خود قبیح ہو تو چاہئے کہ اعتبارات کے بدلنے کے باوجود حسن حسن ہی رہے قبیح قبیح ہی رہے۔ اس لئے کہ جو چیز ذاتی طور پر حسن ہوگی وہ بہر حال حسن رہے گی جو چیز ذاتی طور پر قبیح ہوگی وہ بہر حال قبیح رہیگی حالانکہ بری چیز کسی کسی وجہ سے حسن بھی ہو جاتی ہے اور حسن چیز کبھی کبھی قبیح بھی ہو جاتی ہے مثلاً اگر جھوٹ بولنے سے کسی نبی یا پیغمبر کی جان بچتی ہو تو یہی جھوٹ حسن ہو جائے گا بلکہ واجب ہو جائے گا اور سچ بولنے سے اگر کسی بے گناہ کی جان جاتی ہو تو سچ بولنا اس وقت انتہائی قبیح ہوگا

اس کا جواب یہ ہے کہ بحث ذاتی طور پر کسی چیز کے اچھے یا برُے ہونے سے ہے سچ اسلئے اچھا ہے کہ وہ ذاتی طور پر اچھا ہے جھوٹ اس لئے برُا ہے کہ وہ ذاتی طور پر برا ہے موانع یا خصوصی حالات پیدا ہو جانے کی بات دوسری ہے۔

اشاعرہ نے اپنے نظریہ کی تائید میں اور بھی کئی ایک دلیلیں پیش کی ہیں وہ سب کی سب مغالطہ آمیز ہیں کوئی دلیل بھی منطق صحیح کے معیار پر نہیں نہ دلیل و برہان سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ افعال کے اچھے یا برُے ہونے سے انکار کرنا بدیہیات سے انکار کرنا ہے اور وجدان کو جھٹلانا ہے۔ سچ۔ جھوٹ ظلم و فساد ضعیفوں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک ان میں بعض باتوں کے اچھے ہونے بعض کے برے ہونے میں معمولی عقل کا انسان بھی تامل نہیں کرے گا نہ نیکوکار کی تعریف کرتے اور بدکار کی مذمت کرنے سے باز رہے گا چاہے ان باتوں کے متعلق شریعت کا کوئی حکم وارد ہوا نہو۔

خداوند عالم پر لطف واجب ہے

لطف کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کا بندے پر ایسا لطف و کرم عنایت و مہربانی ہونی ضروری ہے جو اُسے اطاعت گزاری سے قریب اور نافرمانی و سرکشی سے دور کردے مگر یہ لطف و مہربانی بس اسی حد تک ہو کہ جبر لازم نہ آئے۔

شیعہ امامیہ کے نزدیک یہ ضروری و لازمی چیز ہے اس لئے کہ خداوند عالم بندہ کی فلاح و بہبودی ہی چاہتا ہے اُنکے ساتھ وہی کرتا ہے جو انھیں زیادہ سے زیادہ نفع پہونچائے انھیں کسی ایسی چیز سے محروم نہیں رکھتا جو انھیں دنیا میں بھی مفید ہو اور آخرۃ میں بھی۔ اشاعرہ اس کے منکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم بندہ کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا ہے جس کام کا بھی حکم دیتا ہے وہ بہتر ہی ہوگا۔

معتزلہ شیعوں کے ہمنوا ہیں اُن کی اکثریت بھی اسکی قائل ہے کہ خداوند عالم پر لطف واجب ہے کیونکہ اُسکے عدل کا یہی تقاضا ہے خداوند عالم بندہ کو کسی کام کرنے کا حکم دیدے مگر اپنی توفیقات اسے نہ دے تو اس کے عادل ہونے کا منافی ہوگا۔

تو شیعہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خداوند عالم کا بندوں پر لطف فرمانا واجب ہے اور معتزلہ بھی کہتے ہیں کہ واجب ہے دونوں میں فرق ہے تو بس یہ کہ معتزلہ لطف کو موجبات و تقاضائے عدل سے قرار دیتے ہیں یعنی اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ ضرور لطف کرے اگر خدا بندہ کو اپنے لطف سے محروم رکھے گا تو وہ ظالم ہوگا اور خدا ظالم نہیں ہو سکتا۔

شیعہ امامیہ کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارا خدا جواد و کریم بھی ہے اور جود و کرم کے لوازم سے ہے کہ خداوند عالم اپنے بندہ کو کسی ایسی چیز سے محروم نہ رکھے جس میں اسکی فلاح و بہبود اور نفع و فائدہ ہو۔

بہت سے معتزلہ اس کے منکر بھی ہیں وہ خداوند عالم کے لئے لطف ضروری نہیں سمجھتے۔

جو لوگ لطف کو خداوند عالم کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اُن کی دلیل یہ ہے کہ اس لطف و توفیق ربانی کے سبب خدا کے حکم کی تعمیل میں سہولت ہوتی ہے اور خداوند عالم نے بندوں کو جو مکلف کیا ہے وہ اسی لئے کہ جس کام کا انھیں حکم دیا جائے وہ کام عمل میں آئے اور جس کام سے روکا جائے اس کام سے باز رہیں۔ لہذا خداوند عالم اگر بندہ کی اتنی مدد نہ کرے اپنے لطف وکرم سے حکم کی بجا آوری آسان نہ بنا دے تو اس کی غرض ہی پوری نہ ہوگی اور اس کی مثال اس شخص جیسی ہوگی جو کسی کو کسی کام کے کرنے کا حکم دے اور یہ جانتا ہو کہ وہ اس کام کو نہیں کرے گا۔

اشاعرہ اپنے اس نظریہ پر کہ خداوند عالم پر لطف واجب نہیں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر خداوند عالم پر لطف واجب ہوتا تو ضروری تھا کہ ہر زمانہ میں ایک نبی اور ہر شہر میں ایک معصوم ہو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے اس لئے کہ لطف بندہ کو اطاعت سے قریب اور معصیت سے دور کرتا ہے لہذا ظاہر ہے کہ اس لطف کے بہترین مصداق انبیا و اولیا ہی ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی اسکا قائل نہیں قائلین لطف اسکا جواب دیتے ہیں کہ انبیا و کرام جنھیں خداوند عالم نے بندوں کی ہدایت اور انھیں گمراہی سے نجات دلانے کے لئے بھیجا ان انبیاء کرام نے طاعت کی طرف بندوں کی رہنمائی کی منکرات سے روکا اطاعت گذاروں کو دائمی نعمت کا وعدہ اور گنہ گاروں کو عذاب الیم کی دھمکی دی اور وہ اپنے ایسے نصائح و تعلیمات چھوڑ گئے کہ اگر بندے ان نصائح و تعلیمات کو پیش نظر رکھیں تو وہی نصائح و تعلیمات انھیں اطاعت سے قریب اور معصیت سے دور رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ پھر شیعوں پر تو یہ اعتراض خصوصیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہر زمانہ میں امام موجود ہوتا ہے اور چاہے لوگ اسکو نہ بھی پہچانیں پھر بھی اس کا وجود الطاف الہی کا ایک حصہ ہے جو بندوں کو طاعت الہی سے قریب کرنے کا باعث ہوگا۔

پھر شیعہ اس کے بھی قائل ہیں کہ ہر زمانہ کے حکام میں ضروری ہے کہ ان میں حاکم عادل اور عالم بالاحکام کے صفات پوری طرح موجود ہوں اور اگر حکام میں ایسے صفات پوری طرح موجود ہوئے تو اس سے بھی بندوں کو طاعت کی بجا آوری اور منہیات سے باز رہنے میں مدد ملے گی۔

نبوۃ

تمام مسلمانوں کا اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر ادیان و مذاہب کے ارباب عقل و دانش کا اسبات پر اتفاق ہے کہ خداوند عالم پر انبیاء و مرسلین کا بھیجنا عقلاً بھی واجب ہے اور نقلاً بھی۔

البتہ اشاعرہ عقلاً واجب ہونے کے منکر ہیں اسلیئے کہ انکے خیال میں ہر اچھی بری چیز عقل ہی سے نہیں معلوم ہو سکتی

قرآن مجید کی آیتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ خداوند عالم انبیاء و مرسلین کو بھیجکر اور اطاعت کے وافر اسباب فراہم کرکے جب تک پوری طرح اتمام حجت نہیں کر لیتا کسی پر عذاب نہیں کرتا۔ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا ہم جب تک رسول نہیں بھیج لیتے عذاب نہیں کرتے۔

رسول بھی خداوند عالم کا بہت بڑا لطف ہے رسول بندوں کو خدا کے احکام پہونچاتا ہے لوگوں کو بتاتا ہو کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری پر کیا جزا اور نافرمانیوں پر کیسی سزائیں ملیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر لطف الہی کا شاندار نمونہ کون ہو سکتا ہے۔

البتہ براہمہ[1] اس کے منکر ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ خدا پر انبیاء و مرسلین کا بھیجنا ضروری نہیں کیونکہ اگر نبی و رسول عقل کے موافق باتیں لے کر آئے گا تو پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں عقل خود کافی ہے اور اگر عقل کے مخالف باتیں لے کر آئے گا تو اسکو ٹھکرا دینا ضروری ہے

فرقہ صابئہ اور وہ لوگ جو تناسخ کے قائل ہیں اُن کا مسلک بھی یہی ہے۔

ان لوگوں کا جواب یہ ہو کہ اگرچہ عقل بعض باتوں کے اچھے یا بُرے ہونے کو سمجھ لیتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک ایک چیز کو جان لے خدا کی عبادت کسطرح کرنی چاہیئے۔ معاملات کیونکر ہوں۔ اولاد میں میراث کیونکر تقسیم ہو اسی طرح اور دیگر مذہبی ضروریات عقل ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ ان باتوں کا کما حقہ علم انبیاء و مرسلین ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

بعض معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ خدا پر نبی کو بھیجنا اسی وقت واجب ہو جب اللہ تعالے کو بندوں کی طرف سے اطمینان ہو کہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لائیں گے اور اگر خداوند عالم کو معلوم ہو کہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو نبی کا بھیجنا اس پر واجب نہیں ہوگا ہاں اتمام حجۃ کے لیے مستحسن ضرور ہوگا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ لولا ارسلت الینا رسولا کاشکہ تو ہماری طرف کسی رسول کو بھیجے ہوتا۔

ابو ہاشم جبائی کا قول یہ ہے کہ خداوند عالم پر نبی بھیجنا تب ہی واجب ہے جب وہ ایسے امور کو تشریعی اور قانونی حیثیت دینا چاہے جنکے فوائد کو سمجھنے کے لئے عقل کافی نہو۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے مہمل افکار و نظریات ہیں جن کے ذکر میں کوئی فائدہ نہیں

---

[1] بعض براہمہ کا عقیدہ یہ ہو کہ سوا آدم کے کوئی نبی نہیں ہوا بعضوں نے جناب ابراہیم کا بھی اضافہ کیا ہو اسی طرح صابئہ صرف جناب ادریس و شیث کو نبی مانتے ہیں ۱۲

اِمامت

یہ سب کو معلوم ہے کہ اسلام کی تاریخ میں امامت کا مسئلہ ہی سب سے اہم نزاعی مسئلہ رہا اس مسئلہ پر مسلمانوں کے درمیان اختلافات نے اتنا طول پکڑا کہ مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں پیغمبر کی آنکھ بند ہوتے ہی صراط مستقیم سے منحرف ہو گئیں اور مسلمان کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ نت نئی جماعتیں پیدا ہو گئیں ان کے درمیان سخت و شدید معرکے ہوئے فتنہ و فساد کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا کافی کشت و خون ہوئے جان و مال عزت و آبرو سب مباح سمجھ لی گئیں اسلامی اقدار خاک میں مل گئے اور آج تک مسلمان اس انحراف کا خمیازہ بھگت رہے ہیں تقسیم کا جو چکر چل پڑا تھا وہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا اور اُمت میں جو پھوٹ پڑی تو تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئی اور اصول و فروع دین میں نہ کوئی اصل بچی نہ کوئی فرع جس میں مسلمان کئی گروہوں میں نہ بٹ گئے ہوں اب لاکھ کوششیں کی جائیں نہ تو ان خرابیوں کو دور کرنا ممکن ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں اور نہ وہ خلیج پاٹی جا سکتی ہے جو اس مسئلہ امامت میں نزاع و اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوئی اور روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

جب تک ہر فریق اپنی تمام امکانی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے مذہب اور عقیدہ کی حمایت میں ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے گا اس خلیج کا پر ہونا ممکن بھی نہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بتاتے چلیں کہ امامت کے متعلق اسلامی فرقوں کے نظریات کیا ہیں۔ امام اور خلیفہ دو لفظیں ہیں لیکن دونوں کا مفہوم ایک ہے یعنی پیغمبر کی نیابت و جانشینی میں دین و دنیا کی ریاست۔

اس عہدہ کے حامل شخص کو امام اس لئے کہتے ہیں کہ عوام الناس اس کے پیچھے چلتے ہیں یا وہ جدھر اُنکی رہنمائی کرتا ہے جو قانون بناتا ہے اس کی پیروی کرتے ہیں اور خلیفہ اس لئے کہتے ہیں کہ نظم و انصرام مملکت اور امت کی قیادت و رہنمائی میں وہ پیغمبر کا جانشین ہوتا ہے۔

اور جس طرح پیغمبر کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلمانوں میں اس بات پر نزاع و تکرار ہوئی کہ کسے خلیفہ ہونا چاہیئے کسے نہیں اور اسی نزاع و تکرار کے نتیجہ میں اور بھی کئی ایک جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہوا کہ خداوند عالم پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے یا نہیں بعض قائل ہوئے کہ واجب ہے بعض نے کہا کہ نہیں واجب ہے پھر جو لوگ واجب ہونے کے قائل ہوئے ان میں بھی دو جماعتیں ہو گئیں ایک کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کام عقلاً اللہ پر واجب ہے دوسری جماعت کہتی ہے کہ بحکم عقل امت پر واجب ہے۔ اشاعرہ اور محدثین اور فرقہ معتزلہ میں ابو علی جبائی اور اُن کے فرزند اس بات کے قائل ہوئے کہ

امام کا مقرر کرنا بہ نص شرعی امت پر واجب ہے۔

باقی معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ عقلاً امت پر واجب ہے۔

امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ بہ حکم عقل اللہ پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ عقل کا فیصلہ ہے کہ جس طرح ہدایت و تبلیغ کے لئے خداوند عالم پر نبی کا بھیجنا لازم اسی طرح اس نبی کی شریعت اور احکام کی حفاظت کے لئے امام کا مقرر کرنا ضروری ہے۔

اصل وجوب نصب امام میں سوا خوارج کے فرقہ عجاردہ اور حاتم اصم معتزلی کے کسی نے اختلاف نہیں کیا ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امت والوں پر واجب ہے کہ حق کو زندہ اور باطل کو مردہ کرنے کے لئے ایکدوسرے کی مدد کریں ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوط کریں اور جب یہ کام امت ہی سے چل جائے تو پھر امام کو بندوں پر مسلط کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہاں جب امت میں اختلاف ہو اور وہ احقاق حق اور عدل کی اشاعت میں ایکدوسرے سے تعاون نہ کریں تو اس وقت کسی کو مقرر کرنا ضروری ہے جو ان فرائض کو انجام دے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عجاردہ کا نظریہ یہ ہے کہ امام کا ہونا نہ تو شرعاً ہی واجب ہے نہ عقلاً ہی ہاں کبھی کبھی از راہ مصلحت واجب ہو جاتا ہے

رہ گئے دوسرے خوارج تو وہ بھی اس مسئلہ میں دوسرے مسلمانوں کے ہمنوا ہیں اور کہتے ہیں کہ امام کا ہونا ضروری ہے تاکہ احقاق حق اور نظام مملکت کی حفاظت ہوتی رہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اشاعرہ اور محدثین اور انھیں کے ساتھ فرقہ معتزلہ کے وہ لوگ جو جبائی اور اس کے فرزند کے پیرو ہیں اس بات کے قائل ہیں کہ امت پر واجب ہے کہ امام مقرر کرے۔

بقیہ معتزلہ ہیں کچھ لوگ یعنی بصرہ کے معتزلیین اس بات کے قائل ہیں کہ امام کا مقرر کرنا امت پر بہ نص خداوندی واجب ہے یعنی خداوند عالم کی طرف سے صراحت ہے کہ امام کا مقرر کرنا ضروری ہے۔

اور بغداد کے معتزلیین اس بات کے قائل ہیں کہ امام کا مقرر کرنا بحکم عقل امت پر واجب ہے یعنی عقل کا فیصلہ ہے کہ امام ضرور ہونا چاہیئے۔

شیعہ امامیہ کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ امام کا ہونا شرعاً بھی واجب ہے اور عقلاً بھی اور اسکے تقرر کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے اس لئے کہ امام بھی ایک طرح کا لطف خداوندی ہے جو بندوں کو طاعت سے قریب کرتا ہے اور معاصی و منکرات سے روکتا ہے اور لطف خداوند عالم پر عقلاً واجب ہے۔ پیغمبر خدا نے خدا کے حکم سے اپنے بعد کے لئے امام کی تعیین کر دی تھی اور نام بھی لے کر صراحت کر دی تھی اور اوصاف بھی بتا دیے تھے جیسا کہ شیعہ و سنی سبھی کتابیں اسکی شاہد ہیں۔

جو لوگ اللہ پر امام کا مقرر کرنا واجب نہیں قرار دیتے وہ اپنے مسلک پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ امام کا وجود اگرچہ خداوند عالم سے قریب اور معاصی سے دور کرنے والا ہوتا ہے لیکن اتنی ہی سی بات کی

وجہ سے اس کا مقرر کرنا اللہ پر واجب نہیں ہو جائے گا اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ امام کے مقرر کرنے میں کوئی مخفی فساد اور خرابی ہو اور بندے اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں تو جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ کوئی فساد اور خرابی نہیں پیدا ہوگی اس وقت تک اس کا مقرر کرنا واجب نہ ہوگا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب یہ بات تسلیم ہے کہ امام طاعت سے قریب کرنے والا ہوتا ہے تو اس کے مقرر کرنے میں کسی قسم کی خرابی یا فساد کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور محض اس احتمال کی بنا پر کہ ہو سکتا ہے کہ امام کے مقرر کرنے میں کوئی خرابی پیدا ہو۔ وجوب تعیین امام میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ مزید برآں جو لوگ امام کے نصب و تقرر کو واجب سمجھتے ہیں اُن کا مسلک یہ ہے کہ امام کا مقرر کرنا خدا پر واجب ہے اور خداوند عالم سے مصالح اور مفاسد کوئی بھی پوشیدہ نہیں۔

شیعہ امامیہ کے مسلک پر اشاعرہ ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ امام کو لطف خداوندی جبھی کہا جا سکتا ہے جب اس کا حکم چلتا ہو امر و نہی پر اُسے قدرت حاصل ہو اور لوگوں کے معاملات اس کے ہاتھ میں ہوں لیکن تمہارے ائمہ کو یہ شان کبھی حاصل نہیں رہی تو تم لوگ جسے لطف قرار دیتے ہو اس کے وجوب کے قائل نہیں اور جس کے وجوب کے قائل ہو وہ لطف نہیں خصوصیت کے ساتھ تم اپنے امام غائب کے متعلق ایسا کہہ ہی نہیں سکتے ان کا وجود لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے نہ لوگ ان سے مل سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں ان کے وجود سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا اور اگر وہ موجود بھی ہوں تو ان کے وجود کا فائدہ ہی کیا جب کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو لوگوں کو اطاعت الٰہی سے قریب اور معصیت سے دور کر دے۔

شیعہ امامیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم جو قائل ہیں کہ امام کا مقرر کرنا خدا پر واجب ہے تو اسی کے ساتھ ہم اس کے بھی قائل ہیں کہ خدا کے مقرر کردہ امام کا وجود لطف خداوندی اور اطاعت الٰہی سے قریب کرنے والا ہوتا ہے اور محض اس کے موجود ہونے ہی سے لطف خداوندی حاصل ہو جاتا ہے اسلئے کہ اس میں اس بات کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ لطف کے معنی یہی تو ہیں کہ خداوند عالم بندوں کے لئے اطاعت کے اسباب مہیا کر دے تو یہ بات امام کے مقرر کرنے ہی سے حاصل ہو جاتی ہے اگر لوگ خدا کے مقرر کردہ امام کی طرف رجوع کریں اس کے نصائح و ارشادات کو سنیں تو کبھی بھی معاصی اور منکرات میں مبتلا نہ ہوں۔ لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ لوگوں نے اپنی مرضی و اختلاف سے اس لطف خداوندی سے فائدہ نہیں اٹھایا[1]۔

---

[1] انبیاء و مرسلین کے کمالات و خصوصیات میں سب سے اہم چیز یہی ہے کہ وہ خاص خدا کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں انسانی انتخاب اور تجویز کی اس میں وہ ذرہ برابر بھی شرکت نہیں ہوتی پنچایت سے کبھی کوئی شخص نبی یا پیغمبر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بہر حال شیعہ امامیہ اپنے اس عقیدہ میں متفرد ہیں کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور ضروری ہے کہ نام کے ساتھ بھی اس کی تعیین کردی جائے اور اوصاف کے ساتھ بھی۔ اور اسکی دلیل میں انہوں نے جہاں قاعدہ لطف کو پیش کیا ہے وہاں اور بہت سی دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں۔ قاعدہ لطف کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کا بندوں پر لطف و مہربانی ضروری ہے جو اسے اطاعت بجالانے میں معاون اور معاصی سے باز رکھنے میں مددگار ہو۔ امام بھی خدا کا بہت بڑا لطف ہے لہذا امام کا مقرر کرنا بھی واجب ہے۔

معتزلہ اگرچہ اس کے قائل ہیں کہ خداوند عالم پر لطف اور بندے کے فلاح و بہبود کے اسباب فراہم کرنا ضروری ہے لیکن امامت کے مسئلہ میں وہ خاموش ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ اُن کی خاموشی محض اس وجہ سے ہے کہ اگر وہ خدا پر امام کا مقرر کرنا واجب تسلیم کرلیں تو اس صورت میں اُنھیں اُن لوگوں کی امامت و خلافت سے انکار کرنا پڑے گا جو علی سے پہلے ہوئے اس لئے کہ لطف خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ امام منصوص من اللہ ہو۔

یہ مسئلہ منجملہ اُن مسائل کے ہے جن کے بارے میں معتزلہ اور شیعہ امامیہ کے درمیان سخت و شدید ہنگامہ آرائیاں ہوئیں خصوصیت کے ساتھ ہشام بن حکم کے ساتھ جو اکابر علمائے امامیہ سے تھے اور اپنے ٹھوس دلائل اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں ہوا تو خلیفہ و امام میں بھی سب سے اہم یہی جزو ماننا پڑے گا کہ وہ خاص خدا کا مقرر کیا ہوا ہوتا ہو اور آدمیوں کی رائے مشورہ یا پنچایت یا استخلاف یا انتخاب یا تجویز کی اس میں ذرہ برابر شرکت نہیں ہو سکتی۔

اس نظریہ کے ماتحت قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت رسول خدا صلعم کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی یعنی حضرت کا مقصود کوئی حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق درست کرنا اُن میں انسانی خوبیاں پیدا کرنا اُن کو روحانی کمالات سے آراستہ کرنا اور اُن کو مذہب حق کا پابند کرنا۔ ظاہر ہے کہ حضرت کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے کوئی بادشاہت نہیں قائم کر رہے تھے کسی دنیوی حکومت کی تعمیر نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اگر آنحضرت کی حیثیت صرف ایک دنیوی بادشاہ کی سی ہوتی تو جو شخص بھی حضرت کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہوتا لیکن اگر رسول خدا کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی پیشوائے دینی۔ سردار دین و دنیا اور سب سے زیادہ خدا کی طرف سے مبعوث ہونے کی خصوصیت آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ آپ کے خلیفہ میں بھی جو شخص اس صفت سے متصف ہو وہی حضرت کا خلیفہ برحق ہو سکتا ہے۔ غرض جب رسول و پیغمبر ایک معلم روحانی اور اہل اسلام کے عقیدہ کے مطابق خدا کا مقرر کردہ ہادی ہوتا ہے تو اسکی جانشینی کا انتظام بھی خدا ہی کا فعل ہونا چاہیئے اور معلوم ہے کہ حضرت رسول خدا کو دنیا کے لوگوں نے اپنا ہادی اور خدا کا رسول نہیں بنایا بلکہ خود خدا نے آپ کو مبعوث فرمایا بالکل اسی طرح حضرت کے جانشین کو بھی دنیا کے لوگ اپنی تجویز یا اجماع یا انتخاب سے مقرر نہیں کر سکتے بلکہ خدا ہی اسکو معین کرے گا اور وہ اپنے رسول ہی سے اسکا اعلان بھی کرائے گا۔ قرآن مجید کی ایک آیت احادیث رسول خدا کا ایک لفظ انبیا و مرسلین کا ایک فعل (بقیہ حاشیہ آگے صفحہ)

ان کے اور اکابر معتزلہ کے درمیان بھرپور اعتراضات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس مسئلہ امامت میں ان کے اور اکابر معتزلہ کے درمیان بڑے یادگار معرکے ہوئے۔ حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے کہ ہشام بن حکم عمرو بن عبید سے ملنے گئے جو واصل بن عطا کے بعد معتزلہ کا دوسرا سب سے بڑا پیشوا تھا یہ عمرو بن عبید مسجد بصرہ میں مسئلہ امامت پر تقریر کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ اسلامی مذاہب کے نظریات اس مسئلہ میں کیا ہیں اور چونکہ اس مسئلہ میں معتزلہ کے واحد مخالف شیعہ ہی تھے اس لئے وہ شیعوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا اور اُن کی دلیلوں پر اعتراض کر رہا تھا ہشام کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ ۲۰ برس کی رہی ہو گی یہ مجمع کو پھلانگتے ہوئے اس کے قریب پہونچے اور اس سے ایک ایک حواس خمسہ کے فوائد پوچھے۔ آنکھ کا فائدہ کیا ہے کان کا ہے کے لئے ہیں آخر میں انھوں نے پوچھا کہ یہ دل کا ہے کے لئے ہے؟ عمرو نے کہا کہ اس کا کام یہ ہے کہ ان اعضائے مذکورہ آنکھ کان ناک زبان ہاتھ وغیرہ پر جو چیزیں وارد ہوتی ہیں اُن میں تمیز کردے اور اختلاف کو رفع کرے اور شک کو زائل کر کے یقین عطا کرے۔ جب گفتگو یہاں تک پہونچی تو ہشام نے کہا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بھی ایسا نہیں مل سکتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ کسی امت یا کسی جماعت یا کسی زمانہ کے لوگوں کو خلیفہ (یعنی قائم مقام نبی) مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہو اور خود حضرت رسول خدا کے خلفاء کے بارے میں بھی خدانے تصریح کر دی ہے کہ صرف وہی مقرر کرتا رہے گا اور امت محمدیہ کو اس کا ذرہ برابر بھی اختیار نہیں دیا۔

ارشاد ہوتا ہے وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اعمال خیر بجا لاتے رہے اُن کے بارے میں خدا کا وعدہ ہے کہ اُن کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح ان لوگوں کو بنایا تھا جو ان سے پہلے گذر گئے ہیں (پارہ ۱۸ ع ۳)

اس آیت میں خدا نے تصریح کر دی ہے کہ حضرت رسولخدا کے قبل جس قدر خلیفہ گزرے ہیں اُن سب کو خدا ہی نے مقرر کیا تھا اور آنحضرت کے بعد جس قدر خلیفہ ہوں گے ان کو بھی وہی مقرر کرے گا (کوئی انسان کسی شخص کو خلیفہ نہیں بنا سکتا)

معتبر تاریخی ذخیرے بھی یہی بتاتے ہیں کہ سابق انبیاء مرسلین کے خلیفہ یا وصی بھی ان کی امت کے انتخاب یا اجماع پنچایت یا شوریٰ سے نہیں بلکہ ان کو بھی خدا ہی مقرر کرتا اور اُن انبیاء مرسلین ہی سے اس کا اعلان کرا دیتا تھا۔ کل انبیا کے حالات کتابوں میں تو ملتے نہیں اس وجہ سے ہم صرف اُن کا ذکر کرتے ہیں جن کے حالات مل سکے۔

(۱) لما حضرت اٰدم الوفاۃ دعا ابنہ شیثا فعھد الیہ عھدہ جب آدم کی وفات کا وقت پہونچا تو اپنے فرزند شیث کو احکام خدا کا ولی عہد کر دیا (طبری جلد ۱ صـ۷۶) ان اٰدم اوصی الی ابنہ شیث وکتب وصیتہ ثم دفع کتاب وصیتہ الی شیث آدم نے انتقال کے وقت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جب خدا نے آپ کے اعضاء جوارح کو بھی یوں ہی نہیں چھوڑا بلکہ اس کے لئے بھی امام اور سردار کو پیدا کیا جو ہر وقت آپ کے اعضا کے اختلافات کو رفع کر کے ان میں امن و صلح قائم رکھتا ہے تو خدا نے دنیا کی مخلوقات کو جن میں لاکھوں اختلاف اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں کیسے سرگشتگی و گمراہی میں چھوڑ دیا اور ان کے لئے امام نہیں مقرر فرمایا کہ جس وقت اور جس امر میں ان لوگوں کو شک اور اختلاف ہوا کرے انہیں اپنے امام کی طرف رجوع کر کے شک کو زائل اور حیرت و سرگشتگی کو رفع کر لیا کریں۔ عمرو بن عبید سے اس کا کوئی جواب بن نہ پڑا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ ہشام بن حکم ہیں تو انھیں اپنے قریب کیا اور ان کی واپسی تک کسی سے کوئی کلام نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اپنے فرزند شیث کو اپنا وصی مقرر کیا اور اس کا وصیت نامہ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا (طبری جلد ۱ ص۱۰۹)

(۲) ان شیث لما حضر اوصی الی ابنہ انوش و مات شیث جب مرض موت میں مبتلا ہوئے تو اپنے فرزند انوش کو اپنا وصی مقرر کیا اور انتقال کر گئے (تاریخ طبری جلد ۱ ص۸۱)

(۳) ولد انوش قینان و نفراً کثیراً والیہ الوصیۃ انوش نے اپنے فرزند قینان کو اپنا وصی مقرر کیا۔

(۴) فولد قینان مھلائیل و نفراً معہ والیہ الوصیۃ قینان نے اپنے فرزند مہلائیل کو اپنا وصی مقرر کیا۔

(۵) فولد مھلائیل یرد و ھو الیارد و نفراً معہ والیہ الوصیۃ مہلائیل کے یرد یا یارد اور دوسرے لڑکے پیدا ہوئے تو مہلائیل نے یرد یا یارد کو اپنا وصی مقرر کیا (طبری جلد ۱ ص۸۳)

(۶) فولد یرد خنوخ و ھو ادریس النبی و نفراً معہ والیہ الوصیۃ یرد نے اپنے فرزند خنوخ یعنی حضرت ادریس کو اپنا وصی مقرر کیا۔

(۷) ولد لخنوخ متوشلخ فاستخلفہ خنوخ علی امر اللہ و اوصاہ حضرت ادریس کے فرزند متوشلخ ہوئے ان کو ادریس نے احکام خدا پر اپنا خلیفہ مقرر کیا اور وصی بنایا۔

(۸) فلما حضرت متوشلخ الوفاۃ استخلف لمک علی امرہ و اوصاہ بمثل ما کان آباءہ یوصون جب متوشلخ کی وفاۃ قریب ہوئی تو اپنے دین پر لمک کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور انھیں کو اپنا وصی بنایا جس طرح آپ کے آبا و اجداد بھی خود ہی اپنا وصی مقرر کرتے تھے (طبری جلد ۱ ص۸۷ کامل جلد ۱ ص۲۰)

(۹) ولما حضرت نوحا الوفاۃ اوصی الی ابنہ سام حضرت نوح نے اپنے انتقال کے وقت اپنے بیٹے سام کو اپنا وصی مقرر کیا (جلد ۱ ص۶۲)

(۱۰) اسحاق را در دیار شام ولی عہد و خلیفہ گردانید ابراہیم نے اسحاق کو ملک شام میں اپنا ولی عہد اور خلیفہ مقرر کیا (روضۃ الصفا جلد ۱ ص۵۸)

(۱۱) ان اسماعیل لما حضرتہ الوفاۃ اوصی الی اخیہ اسحاق جب اسماعیل کی وفات کا (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ظاہر ہے کہ ہشام کی عمرو بن عبید سے یہ گفتگو قاعدہ لطف ہی کی بنا پر تھی اگرچہ اس کا نام اُن کی زبان پر نہیں آیا اس لئے کہ انھوں نے امت کے درمیان امام کو وہی حیثیت دی کہ بات کی جو قلب کی حیثیت بہ نسبت انسان کے ہے۔ امام بھی اسی طرح اطاعت خداوندی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے جس طرح قلب اعضاء و جوارح کی اور انھیں گمراہی و سرگشتگی سے محفوظ رکھتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وقت قریب آیا تو اپنے بھائی اسحاق کو اپنا وصی مقرر کیا (طبری جلد ۱ ص۱۶۲)

(۱۲) اسماعیل در آخر ایام حیات خویش قیدار را وصی و ولی عہد خویش گردانید اسماعیل نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں (دوسرے مقام پر) قیدار کو اپنا وصی اور ولی عہد مقرر کیا (طبری جلد ۱ ص۱۷۲) حضرت یوسف کے متعلق ہے اوصی الی اخیہ یھوذا انتقال کے وقت اپنے بھائی یہودا کو اپنا وصی اور خلیفہ مقرر کیا۔

(۱۳) حضرت داؤد نے بھی اپنے فرزند حضرت سلیمان کو اپنا وصی اور خلیفہ مقرر کیا فلما مات ورث سلیمان ملکہ وعلمہ ونبوتہ وکان لہ تسعۃ عشر ولدا فورثہ سلیمان دونھم داؤد نے انتقال کیا تو آپ کے فرزند سلیمان داؤد کی سلطنت اور علم و نبوت کے وارث ہوئے آپ کے ۱۹ فرزند تھے مگر وارث صرف حضرت سلیمان ہوئے (تاریخ کامل جلد ۱ ص۷۸)

حضرت عیسیٰ نے بھی اپنا خلیفہ خود ہی مقرر فرمایا از جملہ وصایائے عیسی آن بود کہ خدا امر ام فرمودہ است کہ شمعون را بر شما خلیفہ گردانم و حواریان خلافت وے قبول کردند۔ حضرت عیسیٰ کی وصیتوں سے ایک یہ بھی تھی کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ شمعون کو تم لوگوں پر اپنا خلیفہ مقرر کروں اور حواریوں نے اُن کی خلافت قبول کر لی (روضۃ الصفا جلد ۱ ص۱۸۴)

غرض حضرت آدم سے عیسیٰ تک جس قدر انبیاء و مرسلین گذرے کسی کے متعلق بھی کسی کتاب سے ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنی امت کو یوں ہی چھوڑ دیا ہو اور بغیر اپنا خلیفہ مقرر کئے دنیا سے چلے گئے ہوں نہ کسی رسول یا نبی کے متعلق یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اُن کی وفات پر اُن کی اُمت نے اپنی پنچایت یا اپنے انتخاب یا اجماع یا شوریٰ سے کسی کو اپنا امام یا پیشوا اور اپنے رسول یا نبی کا خلیفہ مقرر کیا ہو اگر دنیا میں کوئی شخص بھی آدمیوں کے انتخاب یا تجویز سے کسی نبی کا خلیفہ ہو سکتا تو حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ تک کسی ایک ہی پیغمبر کے متعلق یہ ثابت ہو جاتا کہ اُن کی اُمت نے اپنے انتخاب سے ان کا خلیفہ مقرر کیا تھا مگر جب ایسا نہیں اور قطعاً نہیں تو اب یہ سوال ہر شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم سے عیسیٰ تک کل انبیاء و مرسلین کے خلفا کو خود مقرر کیا تھا تو حضرت رسول خدا کے بارے میں اس کے خلاف کیوں کیا؟ کیا سبب ہوا کہ اس نے آنحضرت کا خلیفہ خود نہیں مقرر کیا اور اس نے حضرت رسول خدا سے آپ کے بعد اپنا کیا بھی کیوں نہیں اعلان کرایا۔ حالانکہ اس نے انھوں بدلنے نہیں اس نے صاف طور پر فرما دیا ہے سنۃ اللہ الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ خدا کا یہی طریقہ ان لوگوں کے بارے میں بھی رہا ہے جو تم سے پہلے گزر گئے اور تم کو خدا کے طریقہ میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں مل سکتا۔ (سورہ احزاب)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

کوئی شک نہیں کہ یہ طریق استدلال جس سے ہشام نے عمرو بن عبید کو زیر کیا ائمہ طاہرین سے سیکھا ہوا تھا چنانچہ روایتیں بتاتی ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے ہشام کی زبانی اس واقعہ کو سُن کر فرمایا ہشام! یہ تمہاری زبان پر روح القدس گویا ہے۔"

غرضکہ اس مسئلہ امامت میں سارے اسلامی فرقے شیعوں کے مخالف ہیں حتیٰ کہ زیدیہ بھی وہ عقیدہ نہیں رکھتے جو شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے جیسا کہ علمائے اہل سنت کا دعویٰ ہے۔

شیخ مفید رح اوائل مقالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ فرقہ امامیہ کا اتفاق ہے اس پر کہ ہر زمانہ میں امام کا موجود ہونا ضروری ہے جس کے ذریعہ خداوند عالم اپنے مکلف بندوں پر حجت قائم کر سکے۔ معتزلہ اُس کے خلاف ہیں اُن کا کہنا ہے کہ بہت سے زمانے امام سے خالی ہوا کئے۔ خوارج زیدیہ مرجیہ اور عوام اہل سنت بھی معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل و لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ یہ خدا کا وہ طریقہ و دستور ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور تم کبھی خدا کے طریقہ و دستور میں کوئی تغیر و تبدل نہیں پا سکتے (سورہ فتح)

جب اس قسم کی آیات سے یہ امر اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ خدا کے اصول میں اختلاف نہیں ہوتا اس کا دستور و طریقہ بدلا نہیں کرتا اور تاریخی حوالوں سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ خلافت کے بارے میں حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ تک خدا کا یہی دستور رہا ہے کہ اُن کے خلیفہ کا انتظام خدا ہی اُن کی زندگی میں کرتا اور اُن انبیا و مرسلین سے اُن کے سامنے ہی اس کا اعلان کراتا رہا ہے۔ پھر حضرت رسول خدا کے بارے میں خدا کا یہ دستور کیوں ٹوٹ جائے گا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ سابق انبیا و مرسلین کے خلفا کو خدا نے نہیں مقرر کیا نہ اس نے اپنے پیغمبروں سے اس کا اعلان کرایا بلکہ خود ان انبیا و مرسلین ہی نے اپنا خلیفہ تجویز کر کے اپنی زندگی میں مقرر کر دیا۔ اور اس کا اعلان کر دیا تو اب حضرت رسول خدا مورد الزام قرار پاتے ہیں کہ آپ نے اس ضروری فریضہ کو کیوں ترک کر دیا اور جس دینی خدمت کو سابق انبیا و مرسلین سے کسی نے بھی نہیں چھوڑا تھا اس سے حضرت ایسے سید الانبیا خاتم النبین نے کیوں روگردانی کی؟ حالانکہ خداوند عالم نے آپ کو حکم دیا تھا کہ اولئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ گذشتہ انبیا و مرسلین وہ تھے جن کی اللہ نے ہدایت کر دی تھی اب اے پیغمبر ان ہی کے طریقہ کی پیروی تم بھی کرو (سورہ انعام)

ان تمام وجوہ سے ماننا پڑے گا کہ رسول خدا کی خلافت کو بھی خدا یا رسول نے مسلمانوں پر نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے انتخاب یا پنچایت یا اجماع یا شوریٰ سے جس کو چاہیں رسول کا خلیفہ بنا لیں اور نہ خدا ہی نے آنحضرت کے خلیفہ کا اعلان کرانے سے قبل اپنے رسول کو دنیا سے اٹھایا اور نہ آنحضرتؐ نے اپنا خلیفہ مقرر کرنے سے پہلے دنیا سے انتقال کیا۔ ۱۲

عصمت

شیعہ امامیہ اس مسئلہ میں بہ نسبت دیگر اسلامی فرقوں کے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ اُن کے نزدیک انبیا اور ائمہ کا کبیرہ وصغیرہ ہر گناہ سے معصوم ہونا ضروری ہے اس سے نہ سہو ونسیان ہو سکتا ہے نہ کوئی لغزش ہی ہو سکتی ہے بعثت سے پہلے بھی اور بعثت کے بعد بھی۔ احکام خداوندی بیان کرنے میں بھی اور دیگر باتوں میں بھی۔

اکثر مسلمان اس عصمت کو انبیاء کے لئے ضروری تو قرار دیتے ہیں لیکن جملہ حالات میں نہیں نہ جملہ گناہوں سے معصوم ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ سہواً اور تاویلاً اس سے گناہ صغیرہ کا صدور ہو سکتا ہے۔

اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ انبیاء سے سہوا کبیرہ وصغیرہ دونوں گناہ ہو سکتے ہیں سوا کفر و کذب کے محدثین اور حشویہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ کفر و کذب کو اس لئے نہیں مانتے کہ اس سے اُن کی رسالت باطل ہو جائیگی اگرچہ ابوبکر باقلانی کا کہنا یہ ہے کہ انبیاء سہواً و نسیاناً جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ کفر سے پاک وصاف ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے نبی نہ بعثت کے پہلے کافر ہو سکتا ہے نہ بعثت کے بعد۔

البتہ خوارج کی ایک شاخ ازارقہ قائل ہے کہ انبیاء سے کفر کا صدور بھی ہو سکتا ہے اُن کا یہ قول مذکور ہے کہ خداوند عالم ایسے شخص کو نبی مقرر کر سکتا ہے جس کے متعلق اُسے علم ہو کہ وہ بعثت کے بعد کافر ہو جائیگا

گناہان کبیرہ کے متعلق معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ بہ حکم عقل انبیاء سے ان کا سرزد ہونا ناممکن ہے۔ معتزلہ کے علاوہ اشاعرہ وغیرہ کہتے ہیں کہ بہ حکم عقل نہیں بلکہ قرآن وحدیث اور اجماع امت کی بنا پر اس سے گناہ کبیرہ کا صدور ناممکن ہے

اشاعرہ کے نزدیک نبی سے گناہ کبیرہ کا صدور سہواً ہو سکتا ہے رہ گئے گناہان صغیرہ تو عمداً اور سہواً دونوں طرح انبیاء سے ان کا صدور جائز ہے۔

جبائی فرقہ معتزلہ کا آخری پیشوا اس کا قائل تھا کہ انبیاء سے گناہ صغیرہ سہواً تو صادر ہو سکتے ہیں لیکن عمداً نہیں یہ ساری باتیں نبوت پر مبعوث ہونے کے بعد کے لئے ہیں۔ نبی ہونے سے قبل گناہ کبیرہ وصغیرہ دونوں طرح کے گناہ اس سے عمداً بھی سرزد ہو سکتے ہیں اور سہواً بھی۔ سارے اشاعرہ اور معتزلہ کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے۔

جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ نبی گناہ کبیرہ وصغیرہ دونوں سے معصوم ہوتا ہے اپنے مسلک پر یہ دلیل

پیش کرتے ہیں کہ اگر نبی سے بھی گناہ صادر ہونے لگے تو پھر اُن کی پیروی حرام ہو جائیگی حالانکہ نبی کے قول و فعل ہر ایک کی پیروی واجب ہے۔ لہذا اُن کا معصوم ہونا ضروری ہے ورنہ اُن کی پیروی جائز نہ ہو گی۔

نیز یہ کہ اگر انبیا سے گناہ کا صدور ممکن ہوگا تو وہ بھی من جملہ اُن فاسقین کے ہوں گے جن کی گواہی نا قابل قبول ہوتی ہے اور دنیاوی معاملات میں جس کی گواہی نا قابل قبول ہوگی اخروی معاملات میں بدرجہ اولی نا قابل قبول ہوگی۔

نیز یہ کہ اگر انبیا سے گناہ کا صدور ہوگا تو وہ جہنم کے سزاوار ہوں گے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جہنم خالداً فیہا جو شخص خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا اس کے لئے جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس صورت میں انبیا بھی اس آیت کا مصداق ٹھہریں گے لم تقولون مالا تفعلون ایسی بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون خدا کی انتہائی ناراضی کی بات ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

نیز یہ کہ اگر انبیاء سے گناہ کا صدور ہو تو وہ نفس پر ظلم کرنے والے ہوں گے اور ظالم نبوت کی صلاحیت نہیں رکھتا لاینال عھدی الظالمین میرا عہد ظالم نہیں پا سکتے۔

مزید برآں ظالم شیطان اور شیطان کے چیلوں کا پیرو ہوتا ہے اور شیطان کو مومنین پر کوئی دسترس نہیں خداوند عالم شیطان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین شیطان نے خداوند عالم سے عرض کی میں ایک ایک کو بہکاؤں گا سوا تیرے مخلص بندوں کے

اسی قسم کی اور بیشمار دلیلیں ہیں جو اس عقیدہ پر پیش کی جاتی ہیں کہ نبی ہونے کے بعد کبائر کا نہ عمداً ارتکاب ہو سکتا ہے نہ سہواً اسی طرح صغائر کا بھی عمداً ارتکاب نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلہ میں شیعہ امامیہ کا نظریہ سب سے بہتر نظریہ ہے اور نبوت کے شرف و پاکیزگی اور قداست کے عین مطابق ہے وہ نبی کو ہر حال میں نبوۃ سے پہلے بھی اور نبی ہونے کے بعد بھی ہر قسم کے گناہ سے پاک و صاف قرار دیتے ہیں نہ اُس سے عمداً کوئی گناہ ہو سکتا ہے نہ سہواً نہ گناہِ کبیرہ نہ گناہ صغیرہ انھوں نے بھی تقریباً یہی دلیلیں پیش کی ہیں جو اُوپر بیان کی گئیں مزید دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ انبیاء سے معاصی کا صدور اس غرض و غایت کے منافی ہے جس غرض و غایت کو لے کر وہ مبعوث ہوئے۔

خداوند عالم نے اپنے بندوں کی طرف انبیاء مرسلین اس لئے بھیجے کہ بندے اس کے پہنچائے ہوئے پیغامات پر عمل پیرا ہوں اور اسکے راستہ اور ہدایت پر گامزن ہوں لہذا اگر انبیا خود ہی اپنے اوامر و نواہی کی مخالفت کرنے لگیں لوگوں کو کسی بات کا حکم دیں اور خود اسکے خلاف عمل کریں کسی بات سے منع کریں اور خود اس کے مرتکب ہوں تو اُن کی بات کا وزن ہی کیا رہے گا اور کون اُن پر بھروسہ کرے گا؟

مزید برآں اگر انبیاء سے معاصی کا صدور ہو تو امت والوں کے لئے بھی ضروری ہوگا کہ وہ بھی اسکی پیروی

اطاعت میں ان گناہوں کا ارتکاب کریں کیونکہ خداوند عالم کا حکم ہے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی ما اتاکم الرسول فخذوہ رسول جو تمہیں دیں اسکو لو۔

تو ایک طرف نبی کے گنہ کار ہونے کی وجہ سے بندوں پر اسکی اطاعت حرام ہوگی اور دوسری طرف نبی ہونے کی وجہ سے اسکی اطاعت واجب ہوگی۔ اس طرح مکلف کی جان عذاب میں رہے گی کہ نبی کی بات مانتا ہے تو حرام کا مرتکب ہوتا ہے اور نہیں مانتا تو اطاعت رسول سے باہر ہو جاتا ہے۔

مزید براں اگر انبیا سے معاصی کا صدور جائز مانا جائے تو اس صورت میں اسکی حالت تمام خلائق سے بدتر ہوگی اس لئے کہ نبی تمام خلائق سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھنے والا اور اس کے احکام کا عالم ہوتا ہے اور اللہ لوگوں کو ان کے عقل وفہم ہی کے لحاظ سے سزا دے گا یہی تو وجہ تھی کہ خداوند عالم نے پیغمبر کی ازواج سے خطاب کر کے فرمایا یانساء النبی من یات منکن بفاحشۃ یضاعف لھا العذاب اے پیغمبر کی ازواج تم میں سے جو بھی برا کام کرے گا اسے دوگنا عذاب ہوگا۔

مختصر یہ کہ شیعوں کا عقیدہ ہی بہترین عقیدہ اور منصب نبوۃ کے شایاں ہے۔

نبی کو جملہ فضائل کا مجسمہ ہونا چاہیئے تاکہ ہر شخص دل سے ان کی تصدیق اور ان کے اوامر ونواہی پر عمل پیرا ہو سکے خدا کے لئے یہ بات کیونکر جائز ہوگی کہ لوگوں کی طرف ایسے شخص کو نبی بنا کر بھیجے کہ وہ دوسروں کو تو حکم دے مگر خود اس حکم پر عمل نہ کرے دوسروں کو کسی بات سے منع کرے مگر خود باز نہ رہے۔

جناب شیخ مفیدؒ اوائل مقالات میں لکھتے ہیں۔

"جملہ انبیا نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی گناہان کبیرہ سے بھی معصوم رہے اور ان گناہانِ صغیرہ سے بھی جو سبکی اور اہانت کا باعث ہوں۔ البتہ وہ گناہانِ صغیرہ جو سبکی کا باعث نہوں نبوت کے قبل انبیا سے سہواً صادر ہو سکتے ہیں لیکن عمداً نہیں۔ جمہور شیعہ امامیہ کا یہی عقیدہ ہے اور تمام معتزلہ اس کے مخالف ہیں۔"

شیخ مفیدؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت کے مسئلہ میں معتزلہ شیعوں سے جداگانہ مسلک رکھتے ہیں جناب شیخ مفید معتزلہ سے قریبی رابطہ رکھتے تھے اسلامی اصول کے بارے میں انہیں اور معتزلہ میں بیشمار معرکے ہوئے ہیں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو کہ شیخ مفید کی بزم میں معتزلہ سے کسی نہ کسی اسلامی مسئلہ پر مناظرہ نہ ہوا ہو۔ جناب سید مرتضیٰؒ نے ایک مبسوط کتاب میں بہت سے ایسے مناظرے اکٹھا کر دیئے ہیں جو شیخ مفید اور معتزلہ سے ہوئے۔ اگرچہ صاحب مواقف نے معتزلہ کے متعلق لکھا ہے کہ معتزلہ بھی انبیا سے کبائر کا عمداً ارتکاب ناجائز سمجھتے ہیں انبیا سے کبائر کا صدور عقلاً محال ہے اس سے لوگوں کے دلوں سے ان کی ہیبت زائل ہو جائے گی اور لوگوں کی نگاہوں میں ان کی کوئی بھی وقعت نہیں رہے گی۔

بہر حال عصمت انبیاء کے متعلق شیعوں ہی کا نظریہ بہترین نظریہ ہے اور وہی شایان منصب نبوۃ ہے انبیاء کے ہر گناہ سے معصوم ہونے کی صورت ہی میں وہ اغراض پوری ہو سکیں گی جن اغراض کے تحت وہ مبعوث ہوئے نبی کی غرض وغایت یہی تو ہے کہ وہ لوگوں کے نفوس کی اصلاح کرے انھیں رذائل سے پاک بنائے اور معاشرہ کی دشواریوں کا مناسب حل پیش کرے اور جب نبی پاکیزہ نفس صادق و امین ہوگا اس کا قول و فعل ایک ہوگا تو لوگ اس کی بات جلدی قبول کریں گے لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ہوگی اور اس ایک اکیلے کا قول سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے قول کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر ہوگا۔

انبیاء کی طرح ائمہ بھی معصوم ہیں اس کے قائل صرف شیعہ امامیہ ہیں۔ چونکہ شیعہ امامیہ اس بات کے قائل ہیں کہ خداوند عالم پر لطف و مہربانی اور اپنی توفیقات بندہ کے شامل حال کرنا واجب ہے کیونکہ خداوند عالم کا لطف و مہربانی ہی بندے کو طاعت سے قریب اور معصیت سے دور رکھ سکتی ہے اسی لطف و مہربانی کی وجہ سے خداوند عالم پر ہدایت خلق کے لئے انبیاء و مرسلین کا بھیجنا بھی ضروری ہے اور اسی لطف و مہربانی کی وجہ سے امام کا مقرر کرنا بھی اللہ پر واجب ہے کیونکہ امام پیغمبر کے احکام کو عملی جامہ پہنانے والا شریعت کا محافظ اور پیغمبر کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے والا ہوتا ہے لہذا اگر امام سے غلطی و خطا جائز ہوگی وہ جھوٹ بول سکے گا گناہوں کا مرتکب ہوگا تو جن اغراض کے تحت وہ امام بنایا گیا تھا وہ اغراض نہ پوری ہوں گی۔

نیز یہ کہ خداوند عالم امام کو امام اس لئے بناتا ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کرے انکی لغزشوں کو ٹھیک کرے لہذا اگر امام خطا کار اور لغزشیں کرنے والا ہوگا تو پھر اس کے لئے بھی دوسرے امام کی ضرورت ہوگی پھر اس دوسرے امام کے لئے اگر وہ بھی خطا کار ہوگا تو تیسرے امام کی اور اسی طرح یا تو دور و تسلسل لازم آئے گا یا پھر سلسلہ ایسے امام تک جاکر رکے گا کہ جو معصوم اور خطاؤں سے پاک ہوگا۔

نیز اگر امام سے خطا جائز ہوگی تو امام کی باتوں کو ٹھکرا دینا واجب ہوگا پھر اسکی باتوں پر کسی کو بھروسہ نہ رہے گا حالانکہ خداوند عالم نے امام کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اطیعو اللہ و الرسول و اولی الامر منکم تم اللہ کی اطاعت کرو رسول کی اطاعت کرو اور اپنے صاحبان امر کی اطاعت کرو۔ ظاہر ہے کہ ان صاحب امر کی اطاعت جبھی واجب ہوگی جب اس کے اقوال و افعال خدا و رسول کے احکام کے موافق ہوں۔

امام کی عصمت پر خداوند عالم کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے جو اس نے جناب ابراہیم سے خطاب کر کے کہا تھا انی جاعلک للناس اماما قال و من ذریتی قال لا ینال عھدی الظالمین ابراہیم میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں ابراہیم نے کہا اور میری ذریت میں سے، خداوند عالم نے جواب دیا میرا عہد ظالموں کو نہیں ملے گا۔

اس آیت کی صراحت کے مطابق: امامت ایک عہد ہے اور ظالم اس کو نہیں پا سکتا اور غیر معصوم شخص اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور دوسروں پر بھی۔

علمائے شیعہ نے اس آیت سے ایک عام قاعدہ اور بنیادی اصول اخذ کیا ہے کہ حاکم کو کیسا ہونا چاہئے اور مسلمانوں کے معاملات کی باگ ڈور کس کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔

عصمت جسے شیعہ امام کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ امام سے کبائر و صغائر نہ عمداً صادر ہوں نہ سہواً۔

صاحب کتاب الیاقوت جو متقدمین علمائے شیعہ میں سے ہیں لکھتے ہیں۔

"عصمت وہ لطف خداوندی ہے جو معصوم کو معصیت کا مرتکب ہونے سے محفوظ رکھتا ہے لیکن جبر و قہر کے طور پر نہیں کہ امام کو گناہ کرنے پر قدرت ہی نصیب نہ ہو بلکہ اس طرح کہ امام کو گناہ کا کوئی داعی ہی نہیں ہوتا۔"

داعی نہ ہونے سے یہ مطلب نہیں کہ انہیں گناہ کرنے کی قابلیت مفقود ہوتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیا اور ائمہ میں نیکی کی قوت اتنی زبردست ہوتی ہے جو اس کے خواہشات نفسانی اور ہوا و ہوس کو زیر کئے رہتی ہے خواہش نفسانی اس میں موجود ہوتی ہے مگر وہ خواہش کا غلام نہیں بلکہ خواہش اسکی غلام ہوتی ہے انبیا اور ائمہ میں بھی وہ صفات پورے طور پر موجود ہوتے ہیں جن صفات کی بدولت انسان معاصی کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ بھی دوسروں کی طرح راضی ہوتے ہیں غیظ و غضب میں آتے ہیں خواہش نفسانی اُن میں بھی موجود ہوتی ہے جیسا کہ کلام مجید کی آیت بتاتی ہے انما انا بشر مثلکم میں بھی تمہارے ہی جیسا بشر ہوں۔ یہ صفات عام لوگوں کو اپنے بس میں کر لیتے ہیں اور معصیت و نافرمانی کی طرف کھینچ کرلے جاتے ہیں اور انبیا اور ائمہ اُن کو اپنے بس میں کئے رہتے ہیں وہ بھی محبت کرتے ہیں نفرت کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں غضبناک ہوتے ہیں لیکن اللہ تعم کے اوامر و نواہی کے حدود میں۔ دنیا اور دنیاوی ساز و سامان اور لذائذ دنیوی کے لئے انھیں بھی خواہش ہوتی ہے مگر اُن کی خواہش خدا کی رضا سے مغلوب ہوتی ہے اور خدا کی رضا اُن کے نفوس اور قلوب پر محیط ہوتی ہے

محمد بن عمیر بیان کرتے ہیں کہ ہشام بن حکم نے عصمت کی جیسی تعریف بیان کی ویسی تعریف اور اس سے بہتر کلام میں نے عمر بھر کسی سے نہیں سُنا میں نے ہشام سے پوچھا کہ کیا امام معصوم ہوتا ہے انھوں نے کہا ہاں میں نے پوچھا کہ عصمت کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اور کیونکر اس کا علم ہو سکتا ہے ہشام نے کہا جتنے بھی گناہ ہیں اُن کی چار ہی وجہیں ہو سکتی ہیں پانچویں کوئی وجہ نہیں۔ حرص۔ حسد۔ غضب اور ہوائے نفسانی یہ تمام باتیں امام میں ندارد ہوتی ہیں امام کے لئے جائز نہیں کہ وہ دنیا کا حریص ہو کیونکہ ساری دنیا تو اس کے زیر نگیں ہوتی ہے اور وہ تمام مسلمانوں کا خزینہ دار ہوتا ہے لہذا کس چیز کی حرص کرے گا۔

امام کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ حاسد ہو اس لئے کہ انسان اپنے سے اونچے آدمی ہی سے حسد کرتا ہے اور امام سے کوئی اور شخص اونچا نہیں ہوتا لہٰذا وہ اپنے سے پست درجے کے انسان سے حسد کیونکر کرے گا۔

امام کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ دنیا کی کسی چیز کے لئے غضب ناک ہو اس کا سارا غیظ و غضب خدا ہی کے لئے ہونا چاہیئے خداوند عالم نے اس پر فرض کیا ہے کہ وہ حدود قائم کرے خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والی کی اُسے پروا نہ ہو تبھی وہ حدودِ خداوندی کا صحیح طور پر نفاذ کر سکے گا۔

امام کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ خواہش نفسانی کی پیروی کرے اور دنیا کو آخرۃ پر ترجیح دے اس لئے کہ خداوند عالم نے امام کو آخرۃ کا ویسا ہی فریفتہ بنایا ہے جیسا ہمیں دنیا کا فریفتہ کیا اسکی آخرۃ پر اسی طرح نظر رہتی ہے جس طرح ہماری دنیا پر رہتی ہے تم بتا سکتے ہو کہ کسی نے بدصورت چہرے کے لئے خوبصورت چہرے کو چھوڑ دیا ہو اور کڑوے کسیلے کھانے کی خاطر لذیذ و نفیس کھانے چھوڑ دیئے ہوں اور موٹے کھردرے کپڑے کی خاطر نرم و آرام دہ لباس کو ترک کر دیا ہو اور ہمیشہ باقی رہنے والی نعمت کو چھوڑ کر زائل ہو جانے والی دنیا پسند کرتی ہو۔" (بحار الانوار جلد ۷ ص ۳۱۷)

مختصر یہ کہ عصمت کے یہ معنی نہیں کہ معصوم انسانی حدود ہی سے باہر ہوتا ہے وہ ایک دوسری طرح کا انسان ہوتا ہے اور اسکی طبیعت و ماہیت عام لوگوں کی طبیعت و ماہیت سے جداگانہ ہوتی ہے۔ "معصوم" شیعوں کے نزدیک ایسا انسان ہے جو راضی ہوتا ہے ناراض بھی رنجیدہ بھی ہوتا ہے اور فرحناک بھی۔ وہ لذت اندوز بھی ہوتا ہے اور متاذّی بھی محبوب بھی رکھتا ہے اور ناپسند بھی اسی طرح کی اور باقی ساری باتیں انسانوں کی معصوم میں بھی ہوتی ہیں اور یہ سب کیفیات اگرچہ عام طور پر انسانوں پر غالب رہتی ہیں اور انسان کو معاصی و منکرات کی دعوت دیتی ہیں لیکن انبیا اور ائمہ میں اس "پاکیزہ" خیر کی قوت کے تحت ہوتی ہیں جو اس کا رخ طاعت کی طرف رکھتی ہے اور اس "قوت خیر" کا غلبہ ہوتا ہے ان محرکات پر جو معصیت کی طرف کھینچ کرلے جاتے ہیں بایں طور کہ ان محرکات کا انبیا و اوصیا کے یہاں کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

شیعہ امامیہ اس کے بھی قائل ہیں کہ امام کے لئے اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے افضل و اکمل ہونا ضروری ہے اس لئے کہ دوسروں پر اسکو ترجیح دینا اور دوسروں کو نظر انداز کرکے اس کو امام بنانا ضروری ہے کہ ایسی ہی خصوصیت کی وجہ سے ہو جس سے دوسرے محروم ہوں اور امام بہرہ مند ہو ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔

نیز یہ کہ افضل پر مفضول کو ترجیح دینا عقلاً قبیح ہے افضل زیادہ عارف اور حق کی طرف زیادہ ہدایت کرنے والا ہوتا ہے اور ہر طبقہ کے لوگ اس پر اعتماد و وثوق کر سکتے ہیں ارشاد الٰہی ہے افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی فما لکم کیف تحکمون۔ جو شخص حق کی طرف ہدایت کرتا ہے وہ زیادہ حقدار ہے پیروی کئے جانے کا یا وہ شخص جو خود بغیر کسی کی ہدایت و رہبری کی راہ ہدایت نہ پا سکتا ہو تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

یہ شرط بھی مختصات امامیہ سے ہے۔ اشاعرہ اور محدثین اہل سنت اور اکثر معتزلہ اگرچہ اسکے قائل ہیں کہ خلفاء اربعہ میں جو پہلے خلیفہ ہوا وہ بعد والے سے افضل تھا ابوبکر عمر سے افضل تھے عمر عثمان سے اور عثمان علی سے مگر وہ امام کے افضل ناس ہونے کی شرط کو ضروری نہیں قرار دیتے اس لئے کہ اُن کے نزدیک امام کا منتخب کرنا امت کا حق ہے اللہ کو اسمیں کوئی اختیار نہیں امت ہی جسے چاہتی ہے منتخب کرتی ہے۔ معتزلہ میں متقدمین معتزلہ جیسے عمرو بن عبید۔ واصل بن عطا ابراہیم بن سیار مشہور بہ نظام۔ عمرو بن بحر جاحظ ثمامہ بن اشرس ہشام بن عمرو فوطی اور یوسف بن عبد اللہ الشحام اور دیگر معتزلہ جو بصرہ کے رہنے والے تھے اس کے قائل تھے کہ ابوبکر سب سے افضل تھے۔ ہم اوپر یہ بیان کر چکے ہیں کہ عمرو بن عبید فرقہ معتزلہ کے دوسرے سب سے بڑے رہنما کا نظریہ یہ تھا کہ علی جنگ جمل و صفین کی وجہ سے فاسق ہو گئے تھے۔ واصل بن عطا کا کہنا تھا کہ علی و معاویہ میں سے کوئی ایک فاسق تھا لا علی سبیل التعیین اور ان دونوں کی شہادۃ ناقابل قبول تھی۔ رہ گئے باقی معتزلین ان کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ سب کے سب علی کو ابوبکر و عمر و عثمان سے افضل مانتے ہیں مگر افضلیت شرائط خلافت سے نہیں۔ (شرح نہج البلاغہ جلد ا ص۱۳)

علامہ ابوزہرہ نے بھی اس پر بڑا زور دیا ہے کہ فرقہ زیدیہ جن کے پیشوا زید بن علی تھے وہ بھی اسی نظریہ کے حامل تھے یعنی اُن کے نزدیک بھی افضل کے رہتے ہوئے مفضول کا امام ہونا جائز ہے۔

ہم فرقہ زیدیہ سے بحث کرتے وقت یہ واضح کر چکے ہیں کہ جناب زید کی طرف اس نظریہ کی جو نسبت دی جاتی ہے وہ غلط ہے کتابوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ علامہ مسعودی نے مروج الذہب میں اور ابوالحسن اشعری نے مقالات الاسلامیین میں صراحت کی ہے کہ فرقہ جارودیہ والے جو زیاد بن منذر جارود کے پیرو تھے جو سب سے پہلا فرقہ زیدیہ ہے اور جو جناب زید کا معاصر بھی تھا اس کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت علی کی خلافت پر نص ہو چکی تھی اور حضرت علی نے اپنے فرزندوں حسن و حسین کی امامت پر نص کی اور لوگ ان سے انحراف کر کے گمراہ ہو گئے۔ (مقالات الاسلامیین جلد ا ص۱۳۳ و مروج الذہب)

یہ زیاد بن منذر جناب زید کا ہم عصر تھا اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ یہ زید کی امامت کا قائل تھا تو یقیناً اس نے جناب زید سے شرائط امامت اور فرائض امام معلوم کئے ہوں گے اور یہ ناممکن ہے کہ زید کی رائے اپنے جد کی امامت کے متعلق جداگانہ ہو۔

ہم اوپر یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ جناب زید اپنے عقائد و نظریات میں ہرگز ان خطوط سے متجاوز نہیں ہوئے جو اُن کے آباؤ اجداد اپنے شیعوں اور پیروؤں کے لئے متعین کر گئے تھے اور انہوں نے بنی امیہ کے خلاف جو انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تو اس سے نہ تو ان کا مقصد لوگوں کو اپنی امامت کی طرف دعوت دینا تھا اور نہ اہلِ بیت کی مخالفت کرنا۔

ہم نے اوپر جتنی باتیں بیان کیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان خواہ کسی فرقہ اور جماعت سے تعلق رکھتے ہوں سب کے سب متفقہ طور پر اس کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کے لئے ایک امام کا ہونا ضروری ہے جو ان کے معاملات کے نظم و انصرام اقامت حدود۔ اجرائے قوانین اور رفاہ عامہ کے دیگر کاموں میں پیغمبر کا جانشین ہو اس میں کسی نے بھی مخالفت نہیں کی سوا خوارج کے فرقہ عجاردہ کے مسلمانوں میں اگر اختلاف ہے تو بس اس میں اختلاف ہے کہ امام کا مقرر کرنا خدا پر واجب ہے جیسا کہ امامیہ مدعی ہیں یا امت پر واجب ہے۔ اور امت پر واجب ہے تو بحکم عقل واجب ہے جیسا کہ اکثر معتزلہ قائل ہیں یا بحکم شرع جیسا کہ تمام اشاعرہ اور بعض معتزلہ قائل ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فرقہ امامیہ امام کے معصوم اور افضل ناس ہونے میں بھی تمام اسلامی مذاہب سے جداگانہ نظریہ رکھتا ہے۔ امامیہ اسکو واجب و لازم سمجھتے ہیں لیکن اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی شخص شرعی طور پر بھی امام ہو سکتا ہے جب اس میں چار شرطیں ہوں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ امام قریشی ہو اہل سنت اس سلسلہ میں پیغمبر کی وہ حدیثیں پیش کرتے ہیں جن میں قریش کی فضیلت اور اُن کے امامت کے ساتھ مخصوص ہونے کا ذکر ہے چنانچہ اہل سنت نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حکومت قریش میں اس وقت تک رہیگی جب تک کہ اُن کے دو آدمی بھی موجود رہیں گے۔ معاویہ بن ابی سفیان کی بیان کردہ یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔ یہ حکومت قریش میں رہے گی جو بھی اُن سے دشمنی کرے گا خدا اسے منہ کے بھل جہنم میں گرائے گا۔

خوارج اور معتزلہ کے کچھ لوگوں نے اس نظریہ میں اہل سنت کی مخالفت کی ہے ان لوگوں کے نزدیک عجمیوں اور آزاد کردہ غلاموں کا امام ہونا بھی جائز ہے۔

بہر حال علمائے اہل سنت قریش میں خلافت کے منحصر ہونے کے متعلق جتنی بھی حدیثیں پیش کرتے ہیں وہ دستوری حیثیت نہیں رکھتیں نہ اُن سے کوئی شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ حدیثیں قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پیغمبر نے آئندہ کی خبر بیان کی ہے اور کہا ہے کہ قریش ہی میں برابر امام ہوتے رہیں گے یہ نہیں کہا کہ قریش ہی کو بس امام ہونا چاہیئے لہذا اس قسم کی حدیثیں اس بات کا ہرگز ثبوت نہیں کہ امامت قریش کا حق ہے۔

شیعہ امامیہ کے نزدیک اس شرط کا کوئی وزن نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک امامت علی اور اولادِ علی کا حق ہے۔

اسی طرح فرقہ زیدیہ کے نزدیک بھی یہ شرط کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بھی امامت کو اولاد فاطمہ سے مخصوص سمجھتے ہیں نیز یہ کہ شیعوں کے یہاں امامت نص کے ذریعہ ہوتی ہے واللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ

دوسری شرط اہل سنت کے نزدیک بیعت عام ہے یعنی تمام ارباب حل و عقد علما و افسران فوج

اور مسلمانوں کی اکثریت بیعت کرے اور یہ بیعت رضا و اختیار سے ہو جبر و اکراہ سے نہیں۔ یہ بیعت ایک قسم کا معاہدہ ہوتی ہے عوام میں اور منتخب کردہ امام میں لہذا عوام کا فریضہ ہے کہ امام کی بات سنیں اور اطاعت کریں اور حاکم کا فریضہ ہے کہ حدود و فرائض قائم کرے اور کتاب سنت کی روشنی میں چلے۔

اہل سنت مدعی ہیں کہ صحابہ اور باقی مسلمانوں نے ابو بکر کی بیعت کرنے میں سبقت کی اور صاحبان رائے میں سے کسی نے بھی تخلف نہیں کیا حالانکہ ابو بکر کی بیعت کے وقت جو واقعات پیش آئے وہ صریحی طور پر بتاتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابو بکر کی بیعت سے گریز کیا وہ صحابہ کرام میں بہت نمایاں حیثیت کے مالک تھے پیغمبر سے زیادہ قربت بھی انھیں حاصل تھی وہ اپنے موقف پر سختی سے جمے رہے اور ابو بکر کی بیعت لینے کے لئے شروع میں جتنی بھی زبردستی کی گئی وہ اس سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔

مواقف میں ہے

"عقلاً و نقلاً کوئی دلیل اس کی نہیں ملتی کہ امام کی بیعت پر تمام ارباب حل و عقد کا اجماع ضروری ہے ایک دو آدمی بھی کافی ہیں اور تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس امام کی پیروی کریں کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ صحابہ کرام باوجود اس کے دین میں بڑے ٹھوس اور بڑے سخت تھے انھوں نے ایک دو آدمیوں ہی کی بیعت کر لینے کو کافی سمجھا ابو بکر کو تنہا عمر نے خلیفہ بنایا عثمان کو تنہا عبد الرحمان بن عوف نے اور کسی موقع پر بھی یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ مدینہ کے سب لوگ اتفاق کر لیں۔ (مواقف صہ ۳۵۳)

تیسری شرط شوریٰ ہے۔ شوریٰ سے مراد یہ ہے کہ امام کا انتخاب رائے مشورہ اور باہمی بحث و تمحیص کا نتیجہ ہو اس سلسلہ میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ابو بکر عمر و عثمان کی خلافتیں مسلمانوں کے باہمی رائے مشورہ کا نتیجہ تھیں اور مسلمانوں نے ان تینوں پر اتفاق کر لیا تھا۔ حالانکہ یہ امر ثابت و مسلم ہے کہ ابو بکر نے اپنی زندگی میں عمر کو نامزد کیا اور مسلمانوں کو زبردستی اسپر مجبور کیا۔ بعض صحابہ کرام نے اسپر اعتراض بھی کیا مگر انھوں نے کسی کی نہیں سنی اسی طرح حضرت عمر نے امر خلافت کو ۶ شخصوں میں دائر کیا اور ان لوگوں کو مطلق اختیار نہیں دیا بلکہ ایسی شرطیں لگادیں ایسے قیود عائد کر دئے جن کے نتیجہ میں وہ شخص خلیفہ ہو گیا جس کو حضرت عمر خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ خلیفہ عادل ہو۔ اپنی ہوا و ہوس کا غلام نہو اور نہ اپنے دلی جذبات کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ برتاو کرے حتیٰ کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی اور تمام رعایا پر قانون کو لاگو کرے بغیر کسی کو مستثنیٰ کئے۔

لطف یہ ہے کہ اہل سنت اگرچہ اس عادل ہونے کی شرط کو امام کے لئے ضرور قرار دیتے ہیں لیکن اگر خود امام قانون اسلامی سے باہر نکل جائے شریعت اسلام کی مخالفت کرے تو اس کے خلاف خروج کو ناجائز قرار دیتے ہیں چاہے وہ امام ظالم و فاسق ہی کیوں نہو؟

امام احمد فرماتے ہیں کہ تلوار لے کر حکام کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں چاہے وہ حکام ظالم ہی کیوں نہ ہوں
امام مالک نے اپنی موطا میں امام شافعی نے بھی اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے ان لوگوں نے پیغمبر کی طرف منسوب کرکے یہ حدیث بیان کی ہے کہ

اگر کوئی شخص اپنے والی و حاکم کو دیکھے کہ وہ خدا کی کوئی نافرمانی کر رہا ہے تو اسکی معصیت و نافرمانی کو ناپسند کرے مگر اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔

نیز پیغمبر خدا کی یہ حدیث بھی بیان کرتے ہیں کہ

سب سے اچھا دین خدا و رسول اور ائمہ مسلمین کی خیر خواہی کرنا ہے۔

لیکن امامیہ اور بعض معتزلہ اور خوارج اس امام سے جہاد کرنا واجب قرار دیتے ہیں جو اسلام کی بنیادی باتوں سے منحرف ہو جائے اگر اس سے ٹکرانا ممکن ہو تو پھر خاموش رہنا ناجائز ہے چاہے اس میں خوں ریزی کی نوبت کیوں نہ آجائے۔ فرقہ امامیہ کے نزدیک ظالموں سے جہاد بہترین طاعات سے ہے اور ہر عبادت سے زیادہ اس میں اجر و ثواب ہے۔

قرآن مجید نے بھی ظالموں کو عوام پر کسی قسم کا اقتدار نہیں دیا ارشاد الٰہی ہے ولا تتخذ و الظالمین اولیاء لکم من دون المومنین و من تیولھم فاولئک ھم الفاسقون مومنین کو چھوڑ کر ظالموں کو اپنا ولی نہ بناؤ جو لوگ ایسا کریں گے وہی فاسق ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ اشاعرہ و محدثین فقہاء اہل سنت اور کچھ لوگ فرقہ معتزلہ کے اگرچہ امام کے لئے عادل ہونے کی شرط ضروری قرار دیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی ظالم خلیفہ ہو جائے تو اس کی خلافت جائز ہے اور اسباب مقاومت یعنی اس سے ٹکرانے کے سامان و وسائل وافر مقدار میں موجود ہونے کے باوجود اس کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں ان لوگوں کے نزدیک اس خلیفہ میں جسے لوگ منتخب کریں اور اس خلیفہ میں جو قوت و غلبہ سے خلیفہ بن بیٹھے کوئی فرق نہیں جیسے یزید بن معاویہ اور دوسرے ظالم اور خارج عن الاسلام حکام و خلفا۔ کیونکہ ان کے خلاف خروج کرنے میں فتنہ و فساد اور خوں ریزی کا ڈر ہے۔ اور موجودہ ظالم خلیفہ کی ستم رانیوں پر صبر کرنا زیادہ بہتر ہے نئے فتنے میں داخل ہونے سے چاہے موجودہ حاکم کے باقی رہنے میں کتنی ہی جانیں تلف اور کتنی ہی عزتیں برباد کیوں نہ ہوں۔

جنّت و نار

اشاعرہ۔ محدثین۔ عبدالسلام جبائی۔ بشر بن معتمر ابوالحسین بصری کا نظریہ یہ ہے کہ جنت وجہنم پیدا ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے دلیل میں وہ آیتیں پیش کی ہیں جن میں ان دونوں کے وجود کی صراحت ہے منجملہ ان آیات کے ایک وہ آیت ہے جس میں جناب آدم و حوا کے جنت میں رہنے اور جنت کے پھل کھانے کا ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے واذ قلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ فکلا منہا رغدا حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین اور جب کہ ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں سکونت پذیر ہو اور جی بھر کر تم دونوں اس سے کھاؤ پیو جہاں بھی تمہارا جی چاہے مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

معتزلہ کی اکثریت اس کی قائل ہے کہ جنت وجہنم اس دن پیدا ہوں گی جس دن اللہ لوگوں کو جزاء سزا دینے کے لئے محشور کرے گا۔ ایک تو اس لئے کہ جنت و نار کو پہلے سے پیدا کر رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں دوسرے اس وجہ سے کہ کلام مجید کی ایک آیت ہے اکلھا دائم تلک عقبیٰ الذین اتقوا وعقبی الکافرین النار اس کے میوے دائمی ہوں گے یہ جزا ہے متقیوں کی۔ اور کافروں کی سزا تو جہنم ہے۔ دوسری آیت ہے کل شی ھالک الا وجہہ ہر چیز فنا ہو جائے گی بس صرف ذات باری باقی رہے گی۔

پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جنت کے میوے دائمی ہیں دوسری آیت بتاتی ہے کہ کوئی چیز فنا سے محفوظ نہ رہے گی لہذا اگر ہم کہیں کہ جنت و نار مخلوق ہو چکی ہیں تو ان دونوں آیتوں میں تناقض لازم آئے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم اس کے قائل ہوں کہ جنت و نار اس وقت موجود نہیں یوم جزا وجود میں آئیں گی۔

اشاعرہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ پھلوں کے دائمی ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ پھل بعینہ باقی رہیں گے تاکہ دونوں آیتوں میں تعارض لازم آئے مراد دوام نوعی ہے یعنی جب تم ایک چیز کھا چکو گے تو اس کی جگہ فوراً دوسری چیز آجائے گی اس لحاظ سے جنت کے پھلوں کا سلسلہ برابر چلتا رہے گا۔

معتزلہ اپنے مسلک پر دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ کلام مجید کی آیت ہے وجنۃ عرضھا السموات والارض اعدت للمتقین جنت کی چوڑان تمام آسمانوں اور تمام زمینوں جتنی ہے لہذا جب جنت کی چوڑان اتنی ہے تو اس وقت جنت کا وجود کہاں ہوگا جنت تو تبھی وجود میں آئے گی جب سارا عالم فنا ہو جائے اور اسکی جگہ جنت لے لے۔